حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ

جلد ــــ ۸

آیات و احادیث پر مکمل اعراب اور تخریج و تحقیق کے ساتھ (۱۲۰) ایمان افروز خطبات کا مجموعہ جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو حکیمانہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے جس کا مطالعہ قلب و نظر کو پاکیزگی اور فکر و روح کو بصیرت و تازگی بخشتا ہے

مرتب: مولانا قاری محمد ادریس ہوشیارپوری صاحب مدظلہ

بانی و مدیر: دارالعلوم رحیمیہ ملتان

تخریج و تحقیق

مولانا محمد اصغر صاحب

فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی

مولانا راشد محمود راجہ صاحب

متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

مولانا ساجد محمود صاحب

متخصص فی الحدیث جامعہ فاروقیہ کراچی

تقدیم و نگرانی: مولانا ابن الحسن عباسی صاحب مدظلہ

مدینہ یونیورسٹی میں بصیرت افروز خطاب

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ مصر سے حج بیت اللہ شریف کے لیے حجاز پہنچے، روضۂ مبارک پر حاضری کے لئے مدینہ منورہ تشریف لائے۔ مدینہ منورہ کے قیام کے ایام میں جامعہ مدینہ منورہ کے سربراہوں نے حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء (مولانا منت اللہ صاحب رحمانی وغیرہ) کو جامعہ میں تشریف آوری کی دعوت دی۔ جامعہ کے ایک خاص اجتماع میں حضرت موصوف نے یہ تحریر پیش کی جس میں دارالعلوم دیوبند کے ضروری تعارف کے ساتھ جامعہ مدینہ منورہ کا خیر مقدم فرمایا گیا ہے۔ ادارہ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا۔"

اَمَّا بَعْدُ!

نعمت کبریٰ..... یہ ساعت بڑی ہی مبارک ہے کہ میں قلبی مسرت کے ساتھ جامعہ اسلامیہ کے ذمہ داران کے سامنے اپنے دلی جذبات کا اظہار کر رہا ہوں۔ میرا قلب جذبات تشکر و احسان سے معمور ہے۔ کیوں کہ آپ حضرات نے اپنی مخلصانہ دعوت کے ذریعہ مجھے اس عظیم الشان دینی ادارے میں شرف حاضری بخشا۔

حقیقت یہ ہے کہ آج میری مسرت و شادمانی دوگنا ہوگئی ہے۔ کیوں کہ میں ایک عظیم اسلامی علوم کے مرکز سے چل کر قائم قدر دینی مرکز میں پہنچ گیا ہوں۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ کوئی مچھلی پانی سے نکال کر دوبارہ پانی میں ڈال دی جائے تو اسے محض سرور و نشاط ہی حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے جسم میں ایک نئی روح کارفرما ہو جاتی ہے۔ میں بھی اس وقت اسی قسم کی تازگی اور نشاط روحانی محسوس کر رہا ہوں۔ جو فی الحقیقت ایک نعمتِ کبریٰ (بڑی نعمت) ہے جس کے لئے میں بارگاہِ خداوندی میں شکر بجالاتا ہوں۔

مبارک احساس..... میں برِ عظیم ایشیا کے ایک ممتاز اور زبردست اسلامی ادارے سے حاضر ہوا ہوں، جس کی تاسیس پر پوری ایک صدی گزر چکی ہے۔

۱۲۳۸ھ میں انگریزی سامراج نے ہندوستان پر تسلط جمایا اور مغربی تہذیب کا طوفان ہندوستان کی ہر سمت

میں پھیلنے لگا، تو اس وقت علماءِ امت نے اس خطرہ کو محسوس کر لیا جو اس تہذیب کے نتیجہ میں امتِ مسلمہ کو گھیر چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو مغربی تہذیب کے اس خوفناک طوفان سے بچانے اور دین سے آشنا کرنے اور اس پر قائم رکھنے کے لئے ایک ایسے دینی تعلیمی مرکز کے قیام کا احساس کیا۔ جو اپنی مخصوص تعلیم وتربیت کے ذریعے صالح اور غیرت مند علماء کی ایسی جماعتیں تیار کرتا رہے۔ جو زندگی کے ہر گوشے اور ہر میدان میں مغربی تہذیب اور مذہب دشمن تحریکات کے سامنے سینہ سپر ہو کر (ڈٹ کر) امتِ مسلمہ کی صحیح رہنمائی کا فریضہ انجام دیں۔

چنانچہ اس غرض کی تکمیل کے لئے اس دور کے خدا رسیدہ بزرگ اور عالم فاضل، شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کتاب وسنت کے زبردست عالم اور امام وقت تھے۔ جو دارالعلوم میں سب سے پہلے مُحدّث ہوئے اور انہی کی سند پر دارالعلوم میں سلسلۂ روایت ودرایت حدیث جاری ہوا۔

اس وقت آپ کے تلمیذ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر المدرسین تھے، جن کے بعد اس مسند پر ہندوستان کی معروف شخصیت یعنی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ متمکن ہوئے۔ جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص ترین تلامذہ میں سے تھے اور آپ کے ذریعے دارالعلوم میں درسِ حدیث نے نمایاں اور ممتاز مقام حاصل کیا، اور آپ ہی نے اس دینی ادارہ کو علومِ ربّانیہ کی تعلیم کے ذریعہ استحکام عطاء فرمایا اور کتاب وسنت کی تعلیم سے اس کے در و دیوار کو منور کیا۔

دارالعلوم کا امتیاز ...... اس دارالعلوم کا طرۂ امتیاز (امتیازی شان) یہ ہے کہ اس کے تمام شیوخ واساتذہ ومدرسین وطلبہ کتاب وسنت کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے ہیں اور کتاب وسنت ہی پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ وہ ایسے احکام وامور کی تاویلات نہیں کرتے جو مخالفِ کتاب وسنت ہوں۔ اسی بناء پر اہلِ بدعت ہمیشہ اس ادارے اور اس کے شیوخ کے خلاف معاندانہ محاذ بنائے رہے۔ لیکن ان کی اس مخاصمانہ روش کے باوجود اس ادارے کے شیوخ وعلماء نے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے علوم کی ترویج واشاعت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت (نظر انداز) نہیں کیا۔ بلکہ انہوں نے ہمیشہ کتاب وسنت کی اشاعت، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا شعار اور وظیفۂ حیات بنائے رکھا جس پر آج پورا برّ اعظم ایشیا شاہد (گواہ) ہے۔

دارالعلوم کا تعارف ...... اس وقت اس ادارے میں مختلف ممالک کے ڈیڑھ ہزار سے زائد طلبہ جو ہندوستان، افغانستان، پاکستان، انڈونیشیا، برما، جنوبی افریقہ، روس، ترکستان اور چین وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں، زیرِ تعلیم ہیں۔

اس ادارے میں بنیادی علوم جن کی تعلیم دی جاتی ہے تفسیر، حدیث، فقہ اور اصولِ فقہ ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علومِ عقلیہ ونقلیہ (قدیم وجدید) کی تعلیم دی جاتی ہے، سات سو مدرسین تدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں جو سب اسی ادارے کے فیض یافتہ ہیں۔

دار العلوم کا انتظام و انصرام ۲۴ شعبوں پر منقسم ہے جن میں اہم شعبہ جات یہ ہیں: تعلیم، محاسبی، اوقاف، مطبخ، صفائی، بجلی، تعمیرات، نشر و اشاعت اور کتب خانہ۔ اس کے علاوہ دار العلوم میں فضلاء قدیم کا بھی ایک شعبہ ہے جو ان کے ساتھ روابط رکھتا ہے اور مختلف امور میں ان کی معاونت و راہنمائی کرتا ہے۔

دار العلوم اپنے حسنِ کارکردگی اور عظیم الشان علمی و دینی خدمات کی بدولت ایشیاء میں مرکزی حیثیت حاصل کر چکا ہے حتیٰ کہ اسے "ازہر الہند" کہا جانے لگا۔ پوری ایک صدی میں اس دار العلوم سے بیس ہزار سے زائد علماء پیدا ہو چکے ہیں جن میں مفسر بھی ہوئے ہیں اور محدث بھی مفتی و فقیہ بھی ہوئے اور واعظ و مرشد بھی۔ جنہوں نے ہند و بیرونِ ہند میں ہر جگہ کتاب و سنت کے چراغ روشن کئے اور لاکھوں انسانوں نے ان کے ذریعے اپنی رشد و ہدایت کا سامان فراہم کیا۔

حکومت سعودیہ کا تاریخی کارنامہ...... میں اس عظیم دینی ادارے کے ایک خادم کی حیثیت سے آپ کی جامعہ اسلامیہ میں حاضر ہو کر سرور و انبساط کی ایسی کیفیت محسوس کر رہا ہوں۔ جس کا اظہار نہ زبان سے ممکن ہے نہ قلم سے۔ کیوں کہ الفاظ خواہ کتنے ہی معنی خیز و پرشوکت کیوں نہ ہوں، وہ صحیح جذبات اور مسرت آفریں احساسات کی حقیقی ترجمانی نہیں کر سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ جامعہ اسلامیہ کا مدینۂ منورہ میں قیام ایک ایسا مبارک اقدام ہے جس کی خبر تمام علمی حلقوں بالخصوص حلقۂ دار العلوم میں انتہائی فرحت و مسرت کے ساتھ سنی گئی۔ کیوں کہ اس مبارک سرزمین میں صدیوں کے بعد ایسے دار العلوم کا قیام عمل میں آیا۔

بلاشبہ حکومت سعودیہ نے جہاں حجاج کی راحت و آرام کے لئے تمام ضروری سہولتیں مہیا کیں اور حج کی تمام راہیں آسان بنائیں اور سعودی مملکت کو اقتصادی اور تعمیری، ہر اعتبار سے ترقی کی اعلیٰ منزل پر پہنچایا، اسی کے ساتھ تاسیس (قیام و بنیاد) جامعہ اسلامیہ بھی اس کا قابلِ قدر اور تاریخی کارنامہ ہے۔

حقیقتاً مدینہ منورہ ہی وہ مقام ہے جو ان زریں کارناموں کی انجام دہی کے لئے مناسب ہو سکتا ہے اور یہی خطۂ ارض وراثتِ نبوی کی اشاعت کا صحیح استحقاق رکھتا ہے۔ کیوں کہ یہیں سے علومِ نبوت کے چشمے پھوٹے اور یہیں وہ علوم پروان چڑھے اور اسی سرزمین سے خلافتِ راشدہ کی شعاعیں نکلیں۔ اسی لئے مسلمانانِ عالم کے لئے یہ مبارک شہر ہمیشہ پرکشش رہا اور اسی کے خزانہ ئے علومِ شریعت سے وہ مالا مال ہوتے رہے۔ جس طرح مکہ کے پہاڑوں سے نداءِ ابراہیمی کی گونج چہار دانگ عالم (اطراف عالم) میں پھیلی تو مسلمانوں کے دل اس کی طرف مائل ہوئے اور ان کے قافلے اس نداء پر لبیک کہتے ہوئے سرزمین پاک کی طرف ہر چہار سمت سے رواں دواں نظر آنے لگے۔ اسی طرح جب مدینۂ منورہ کی وادیوں سے علومِ نبوت اور تعلیماتِ الٰہی کی صدائیں بلند ہوں گی تو کون ہے جو اس طرف رواں دواں نظر نہ آئے گا اور اس صدائے علم پر لبیک نہ کہے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس جامعہ کے قیام کا ہندوستان کے تمام علمی اور دینی اداروں میں دلی خیر مقدم کیا گیا ہے۔ اسی بناء پر انہوں نے اپنے فرزندانِ علم کو اس جامعہ میں بھیج کر اپنے لئے سعادت محسوس کی اور بلاشبہ ان فرزندانِ علم کا جامعہ کے سرچشمہ ہائے علم سے فیض یاب ہونا ان کے لئے مرتبۂ سعادت وخوش نصیبی کا باعث ہوگا۔

مستحکم رابطہ ... حضرات! یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس جامعہ اسلامیہ کا ہندوستان کے تمام مدارسِ دینیہ، بالخصوص دارالعلوم دیوبند سے ایک قدرتی اور طبعی رابطہ ہے۔ کیوں کہ اگر کوئی تعلق دیرپا اور مستحکم ہوسکتا ہے تو وہ صرف علمی تعلق ہی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اقتصادی اور سیاسی تعلقات محدود اور وقتی ہوتے ہیں، اس لئے میری خواہش ہے کہ جامعہ اور دارالعلوم کا یہ علمی اور دینی رابطہ زیادہ سے زیادہ پائیدار اور مستحکم ہو، جو دونوں اداروں کے درمیان طلبہ واساتذہ کے تبادلے کا ذریعہ ہوسکتا ہے۔

اخیر میں، میں آپ حضرات کے جذبۂ اخوت اور اخلاقِ کریمانہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بہتری اور راست روی کی توفیق عطا فرمائے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محمد طیب

مہتمم دارالعلوم دیوبند

مؤتمرِ اسلامی قاہرہ میں حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ تعالیٰ کا بصیرت افروز مقالہ

ذیل میں ہم وہ مقالہ درج کرتے ہیں جو حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے مؤتمر اسلامی قاہرہ میں پیش فرمایا۔ اصل مقالہ عربی میں ہے جس کا اردو ترجمہ ہم پیش کررہے ہیں۔ اس مقالہ میں حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے ان دینی اور فقہی مسائل پر ابتدائی بحث فرمائی ہے، جن پر علماءِ اسلام کو متحدہ غور وفکر کے بعد اپنا ایک فیصلہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ مقالہ ہندو پاکستان کے علماءِ اسلام کو بھی زمانہ حال کے مسائل کی طرف متوجہ کرے گا اور یہ حضرات زمانہ حال کی ان طبعی ضرورتوں پر شرعی رہنمائی فراہم کرسکیں گے۔ (ادارہ)

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!

جامعہ ازہر کی خوش نصیبی ..... بزرگانِ محترم! الحمد للہ: آج ہم علماءِ کرام کے ایسے اجتماع میں شرکت کی سعادت حاصل کررہے ہیں جو صدرِ جمہوریہ عربیہ، السید جمال عبدالناصر کے عہد میں جامعہ ازہر میں ادارۂ بحوث اسلامیہ کی دعوت پر مختلف ممالک سے بعض اہم عصری مسائل پر غور وخوض کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

بلاشبہ یہ عظیم الشان اجتماع جو درحقیقت زبردست اسلامی یکتائی کا نمونہ پیش کررہا ہے، ایسے وقت میں جبکہ دشمنانِ اسلام، ملّتِ اسلامیہ کا شیرازہ بکھیرنے کی ہر ممکن سعی کررہے ہیں۔ جامعہ ازہر کی خوش نصیبی اور عظیم کامیابی ہے جو اسے السید جمال عبدالناصر کے عہد میں حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے ہم بارگاہِ خداوندی میں شکر بجالاتے ہیں کہ اس نے دشمنانِ اسلام کی تمام مساعی کو ناکام بناکر ہم خادمانِ دین کو جسمانی وروحانی یکتائی کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کے اہم مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے باہمی ملاقات کا یہ زرّیں موقع عنایت فرمایا۔

مصر، اسلام کا نشانِ قوت ...... بزرگانِ محترم! سرزمین مصر جہاں آج یہ عظیم الشان اجتماع ہورہا ہے محض سیاسی، اقتصادی اور جغرافیائی لحاظ سے ہی اہم نہیں ہے، بلکہ اسے زبردست دینی اہمیت بھی حاصل ہے۔ جس کے باعث

مسلمانانِ عالم کا آپس میں ہمیشہ ایک قلبی رابطہ رہا ہے اور مصر کی اس دینی اہمیت کا اندازہ حدیث نبوی سے بھی کیا جا سکتا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ: ''اسلام نے حجاز مقدس کو دین کا مرکز، ملک شام کو اسلام کا نشانِ عظمت اور ملک مصر کو اسلام کا نشانِ قوت قرار دیا''۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حجاز کو عبادت کا مرکز بنایا اور شام کو اسلامی شان و شوکت کا مظہر اور مصر کو افواجِ اسلامیہ کا مستقر (چھاؤنی) اور حلقہ بگوشانِ اسلام کی طاقت کا مظہر قرار دیا۔

حجاز۔ مقدس مرکز عبادت...... چوں کہ حرم مکہ مرکز عبادت تھا اس لئے اسے بلد امون بنایا گیا تا کہ اس میں عبادت کرنے والے پورے سکون واطمینان کے ساتھ مصروفِ عبادت رہیں اور کسی قسم کا نزاع وفساد اور قتل وقتال اس کی فضاءِ عبادت کو مکدر نہ بنائے۔ اس لئے اس بلدِ مامون (پر امن شہر) میں قتال کو ممنوع قرار دیا گیا جیسا کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:۔

''بے شک مجھ سے پہلے اس (حرم) میں کسی کو قتال کی اجازت نہیں ملی صرف میرے لئے دن کے ایک مخصوص وقت میں قتال کی اجازت دی گئی تھی سو وہ اب بھی بدستور سابق خدا کا حرم ہی ہے۔ نہ اس کے درخت کاٹے جائیں اور نہ اس کی گھاس کاٹی جائے اور نہ اس کا شکار بھگایا جائے''۔(اَوْ كَمَاقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) ①

شام...... عظمتِ اسلامی کا مظہر...... اور شام چوں کہ عظمتِ اسلامی کا مظہر تھا اس لئے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا: ''اے شام تو میری شمشیرِ غضب اور میرا اور عذاب ہے، تو ہی منتشر کرنے والا اور تو ہی یکجا کرنے والا ہے''۔② اور شام ہی کے بارے میں دوسری حدیث ہے: ''میری امت میں ایک جماعت ایسی ہوگی جو دمشق، نواحِ دمشق اور بیت المقدس کے دروازوں پر برابر قتال کرتی رہے گی، اسے کسی کی رسوا کن کوششیں رسوا نہ کر سکیں گی''۔③

دوسری روایت میں ہے: ''کسی کی مخالفت اسے نقصان نہ پہنچا سکے گی، وہ دشمنانِ خدا سے برابر قتال کرتی رہے گی ایک لڑائی ختم ہوگی تو دوسری شروع ہو جائے گی''۔ ③ معلوم ہوا کہ ملک شام کفار کے لئے عذاب کا کوڑا اور عتاب (غصہ) کی تلوار بنا رہے گا جب تک کہ اہل شام اس کی امتیازی خصوصیت کو ختم نہ کریں۔

استحکامِ مصر عالم عرب کے امن کا ضامن ہے...... اور مصر چوں کہ فوجی مرکز ہے اس لئے اس کے بارے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ: ''جب خدا تم کو مصر پر فتح عطا فرمائے تو تم اس میں زیادہ سے زیادہ فوج بنانا کیوں کہ وہ فوج روئے زمین کی

① الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب الاذخر والحشیش فی القبر ج:۵، ص: ۲۳۱۔

② کنز العمال، ج: ۱۲، ص: ۲۸۰، رقم ۳۵۰۴۳۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے مجمع الزوائد باب ماجاء فی فضل الشام ج: ۲ ص: ۹۳۶۔ ③ کنز العمال، ج: ۱۲، ص: ۲۸۳، رقم: ۳۵۰۵۰۔ حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے مجمع الزوائد، باب ماجاء فی فضل الشام ج: ۳ ص: ۳۵۰۔

③ سنن ابن ماجہ، باب اتباع سنۃ رسول اللہ ﷺ ج: ۱، ص: ۱۲۔

تمام افواج سے بہتر ہوگی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یارسول اللہ! یہ کیوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس لئے کہ وہ اور ان کی ازواج قیامت تک حفظ و امان میں رہیں گے"۔ ①

معلوم ہوا کہ امن کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسلامی عظمت و شوکت قائم نہ ہو اور یہ عظمت و شوکت فوجی طاقت کے بغیر ممکن نہیں۔ جس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اس پورے خطۂ عرب کا امن و امان مصر کے استحکام اور اس کی فوجی طاقت کے بغیر ممکن نہیں اور وہی تنہا ملک ہے جو حجاز و شام کا دفاع کرسکتا ہے۔ اس لئے ان تینوں ملکوں حجاز، شام اور مصر کا اتحاد ہی فی الحقیقت اسلام اور مسلمانانِ عالم کی طاقت و قوت کا نشان بن سکتا ہے۔

اس بارے میں صدر متحدۂ عرب جمہوریہ السید جمال عبدالناصر جو مخلصانہ سعی کر رہے ہیں وہ یقیناً لائق استحسان اور قابلِ ستائش ہیں اور سب سے زیادہ حوصلہ افزا اور لائق آفرین بات یہ ہے کہ وہ جہاں عربوں اور مسلمانوں کے اتحاد کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے علماءِ اسلام کو ایک نقطہ پر جمع کرنے اور موجودہ دور کے مسائل دینیہ کا حل تلاش کرنے کے سلسلے میں جو قدم اٹھایا ہے، وہ یقیناً باعث مسرت اور لائق امتنان ہے۔

جدید مسائل کے حل کے لئے بنیادی ماخذ...... بزرگانِ محترم! موتمر کے اجتماعات میں جو مسائل زیر بحث آئے ہیں ان میں بعض تو وہ ہیں جو قواعد کلیہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسے مسئلہ اجتہاد اور مسئلہ تلفیق اور بعض علمی و عملی ہیں، جن پر ان کے اصحاب نگارش یقیناً قابل مبارک باد ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایسے مسائل و مباحث جو زمانہ ماضی میں تنقیح و تحقیق کی مختلف راہوں سے گزر چکے ہیں، وہ اپنی علمی اور تحقیقی اہمیت کے باوجود موجودہ ضروریات کے لئے بنیادی حیثیت نہیں رکھتے۔ آج کے دور میں سب سے زیادہ اہمیت ان مسائل کو حاصل ہے جو روز بروز دنیا کی مادی ترقیات کے باعث نت نئی شکلوں میں ہمارے سامنے آرہے ہیں اور جن کا حل کرنا ہمارے لیے اسی طرح ضروری ہے کہ جس طرح آج سے پہلے ہر دور میں علماء و مفکرین امت نے اپنے عموی مسائل کو حل کیا اور جس طرح کہ فقہاءِ امت نے اپنے اپنے ملکوں میں پیش آمدہ واقعات (پیش آنے والے واقعات) کے تحت اپنے فتاویٰ اور فقہی مسائل کے ذریعے امتِ مسلمہ کی رہنمائی کی۔ بلاشبہ آج ضرورت ہے کہ ایسے فقہی اصول کلیہ پر غور و خوض کیا جائے جن کے ذریعے کتاب و سنت کی روشنی میں امتِ مسلمہ کو پیش آمدہ نئے مسائل کا حل کرنا آسان ہو اور اصول و قواعد جن دلائل کے ذریعہ مرتب کئے جائیں وہ بھی قرآن و حدیث سے مستفاد ہوں۔ تاکہ امتِ مسلمہ کے سامنے اسلامی شریعت کی راہ آسان ہوجائے اور کسی کے لئے عملی میدان میں عذر کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے اور ساتھ ہی خدا تعالیٰ کی یہ حجت "قرآن کریم جو ہر چیز کے لئے ایک واضح بیان ہے" بندوں کے لئے پوری ہوجائے۔

---

① کنز العمال، ج:۱۲، ص:۱۶۸، رقم:۳۸۲۶۲. علامہ متقی الہندی فرماتے ہیں: ابن عبد الحکم في فتوح مصر، كر وفيه ابن لهيعة عن الاسود بن مالک الحميري عن بحر بن داخر المعافري، ولم ار له الترجمة الا ان ابن حبان ذكر في الثقات انه يروي عن بحر بن داخر وروی بحوا.

منصب نبوت کا بیان کرتے ہوئے خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں سے وہ احکام بیان فرمادیں جو ان کے لئے نازل کیے گئے ہیں"۔ ①

نیز بارگاہِ خداوندی میں مقبول بندوں کی اتباع کے سلسلے میں ارشاد فرمایا: "آپ ان لوگوں کے راستے پر چلیں جنہوں نے میری طرف رجوع کیا"۔ ② اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے کے لوگوں پر اہل علم اور اہل فتویٰ کی اتباع لازم قرار دی۔ پس ان تین بنیادی امور کے پیش نظر ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے مسائل حل کرنے کے لئے اس میدان میں قدم اٹھائیں اور چوں کہ ہمارے تیار کردہ حل اور مرتب کردہ اصول وقواعد کی بنیاد یہی تین ماخذ ہوں گے اس لئے لامحالہ ہر شخص ان پر عمل کرنے کا پابند ہوگا اور اس بحث کا دروازہ خود بخود بند ہو جائے گا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے یا کھلا ہے؟ اسی طرح اجتہادِ کلی اور اجتہادِ جزئی کی بحث بھی بند ہو جائے گی۔ خلاصہ یہ کہ موجودہ مسائل ومشکلاتِ حیات کو شریعت کے ساتھ علمی اور عملی طور پر منطبق کرنے کی سعی کی جانی چاہئے۔

اسلامی تہذیب وثقافت اپنانے کی ضرورت...... بزرگانِ محترم! ہمارے اسلاف کی یہ تاریخ رہی ہے کہ وہ جب بھی کسی ملک یا شہر میں داخل ہوئے تو انہوں نے وہاں کی تہذیب وتمدن، ادب، معاشرت اور زبان وعلم پر اپنا رنگ چڑھا دیا۔ خود غالب ہوئے اور دوسروں کو مغلوب بنایا۔ اس طرح انہوں نے دین کی روح اور اسلام کے جوہر کو نہ صرف یہ کہ محفوظ رکھا، بلکہ ہر اس چیز کا استیصال کر ڈالا جو روحِ اسلام کے منافی نظر آئی۔ چنانچہ اس پر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ واقعہ شاہد ہے کہ جب انہیں دریائے نیل میں ایک نوجوان لڑکی کو بھینٹ چڑھانے کی جاہلانہ رسم کا علم ہوا تو انہوں نے اس سے متاثر ہوئے بغیر اس بھینٹ کے جاہلانہ اور بے بنیاد عقیدے کا استیصال کر کے اسلام کے صحیح عقیدے کا تحفظ فرمایا (کہ کسی دریا کا جاری ہونا یا نہ ہونا محض خدا کے ہاتھ میں ہے، لڑکی کی بھینٹ کو دریا کی روانی کا مدار بنانا غیر اسلامی اور جاہلانہ عقیدہ ہے)۔

اسی طرح حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ان کے ہاتھ سے لقمہ گرا تو انہوں نے فوراً اٹھا لیا، اس پر ان کے فارسی غلام نے اسے معیوب سمجھتے ہوئے کہا کہ: ہمارے یہاں یہ بات معیوب اور نامناسب ہے۔ اس پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ: کیا میں اپنے حبیب کی سنت ان احمقوں کی خاطر ترک کر دوں؟

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے اسلاف واکابر کبھی بھی دوسروں کی معاشرت اور طور طریق سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ اپنی قوتِ عمل سے دوسروں کی معاشرت پر اپنی معاشرت کو غالب کیا۔ اس لئے اگر ہم اسلام کی صاف ستھری اور بے داغ ثقافت وتہذیب کو دل سے اپنالیں اور دنیا کے سامنے اس کا عملی نمونہ پیش کرنے لگیں تو لوگ ہماری تقلید واتباع پر مجبور ہوں گے اور اگر بالفرض ہم مذکورہ تمام اوصاف پر عمل کرنے سے عاجز ہو چکے ہیں تو کم از کم اتنا ضرور

① ② پارہ: ٦، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ٤٨.

ہونا چاہئے کہ غیروں کی تہذیب وثقافت سے صرف وہی اصول اپنائیں جو تعلیمات اسلام اس کی روح اور مزاج کے خلاف نہ ہوں اور ان کے ساتھ ہمارا تعامل انہی حدود میں ہو جو مخالفِ اسلام نہ ہوں نہ یہ کہ ہم ہر میدان اور ہر معاملہ میں انہی کے روش بدوش اور انہی کے قدم بہ قدم چلتے رہیں۔

مقصدِ اجتہاد...... اور اپنے فعل کو جائز قرار دینے کے لئے دلائل تلاش کرنے کا (غیر صحیح) اجتہاد کریں کہ جس کا مقصد اپنے افعال پر قواعد واصولِ دین کو منطبق کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہمارا اجتہاد محض خدمت دین ہو نہ کہ دنیا کو دین سے منطبق ثابت کرنے کی کوشش۔ جو شخص اپنا دین تباہ کر کے دنیا سنوارنے کی کوشش کرتا ہے دین اس کے پاس نہیں رہتا اور نہ اس کی اصلاح ممکن ہوتی ہے۔

بزرگانِ محترم! اس میں شک نہیں کہ دین کا دامن نہ تنگ ہے اور نہ اس میں دنیا سے بالکلیہ لاتعلق بنانے والی رہبانیت ہے۔ لیکن علمی اور عملی زندگی میں اس کی کچھ خصوصیات ہیں جن کا مقتضیٰ (غرض) ہے کہ وہ ہمیشہ ہر میدان میں واضح اور نمایاں رہیں۔ شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام فی الحقیقت ایسے تمام آداب واصول اور تعلیمات جامع ہے کہ جن کے ذریعہ انسان اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لئے عہدِ نبوت میں بعض مشرکین نے کہا: ''کیا تمہارا نبی تم کو ہر بات کی تعلیم دیتا ہے حتیٰ کہ قضائے حاجت کی بھی؟''۔ ①

اس طرح انہوں نے کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جسے واضح نہ کر دیا ہو اور ایسے اصول عطا فرمائے کہ جن کی روشنی میں تمام معاملات کے حسن وقبح (بدصورتی) کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ادارۂ بحوثِ اسلامیہ نے حقیقتاً علماء اسلام کو عصری مسائل پر غور وخوض کرنے کی دعوت دے کر ایک عظیم الشان دینی وملی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے جس کے لئے ہم اس ادارہ اور جامعہ ازہر اور متحدہ عرب جمہوریہ کے شکرگزار ہیں۔ اس سلسلہ میں چند اہم تجاویز ادارے کے سامنے پیش کرتا ہوں، جو امید ہے کہ ادارے کے مقاصد میں معاون ثابت ہوں گی۔

تجاویز...... 1 ضرورت ہے کہ ایسے مسائل کو مرتب کیا جائے جو ہماری سوسائٹی اور معاشرے کا ایک جزو بن چکے ہیں اور ان کے بغیر زندگی گزارنا آج کے دور میں مشکل نظر آتا ہے، جیسے بینکوں کا سود، انشورنس اور بیمہ کے مسائل، مال کی درآمد وبرآمد وغیرہ کے مسائل۔ یہ سب مسائل واقعاتی شکل ورنگ میں مرتب کئے جانے چاہئیں۔ ان کے لئے فرضی احتمالات پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔

2 اس قسم کے سوالات مختلف ممالک کی نمائندگی کرنے والے علماء میں تقسیم کئے جانے چاہئیں۔ تاکہ وہ ان پر کتاب وسنّت کی روشنی میں غور وخوض کرنے کے بعد جوابات اور تحقیقی مقالات پیش کریں، پھر جب تمام علماء کسی ایک نقطہ پر متفق ہو جائیں اور پوری بصیرت کے ساتھ وہ مقالات وجوابات مرتب ہو جائیں تو مجمع البحوث

① الصحیح لمسلم، کتاب الطهارة، باب الاستطابة، ج: ۲، ص: ۷۶.

الاسلامیہ ان علماء کے دستخطوں سے تمام ممالک میں اُمتِ مسلمہ کے افادہ کے لئے ان جوابات و مقالات کو شائع کرے۔ اس طرح ہر ملک میں مسلمانوں کے لئے ایک متفقہ اور قابلِ قبول حل سامنے آسکے گا۔

3 ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت مادی وسائلِ حیات نے تمام دنیا کے ممالک پر اپنا تسلّط جما کر انہیں ایک نقطہ پر لا کر کھڑا کر دیا ہے اور مہذب ممالک کو ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا ہے کہ وہ ایک شہر معلوم ہونے لگے ہیں اور تمام لوگ وحدتِ نظام کی پوری جدوجہد کرتے نظر آرہے ہیں۔ اس لئے کیوں نہ ہم بھی ان وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اس دینی اور روحانی نظام وحدت کے قیام کی عملی کوشش کریں کہ جو اپنے معتدل مزاج کی بدولت بلا امتیاز رنگ و نسل زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہو کر مساویانہ برتاؤ کرتا رہے۔ وہ جس طرح جمود و تقشف (غربی) سے دور ہے ایسے ہی تہذیب کی مادیت سے بھی پاک ہے۔

اسلام کے تین مرکزی نقاط..... حضرات! اسلام کے تین مرکزی نقاط ہیں۔ اول: قرآن کریم جو کتاب آسمانی ہے اور دوئم: جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور سوئم: خانہ کعبہ جو قبلہ عبادت اور اُمت مسلمہ کا ذریعہ وحدتِ نظام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے بارے میں ارشاد فرمایا ﴿ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ﴾ ① "سب جہانوں کے لئے ذریعۂ نصیحت"۔ اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ② "سب مخلوقات کے لئے باعث رحمت"، ﴿لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا﴾ ③ "سب مخلوقات کو انجام سے ڈرانے والا"، اور خانہ کعبہ کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ ④ "سب جہانوں کے لئے ذریعۂ ہدایت"

اسی طرح گویا اسلام نے ایک عالمی بلکہ عالمین اُمت کو ان تین بنیادوں پر قائم کرنے کے بعد اسے تمام انسانوں کے لئے ظاہر کیا اور اسی لئے اس وقت کے اجماع کو (دین میں) حجت قرار دیا گیا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "میری اُمت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی"۔

پس جبکہ اس اُمت کی بنیاد ان مہتم بالشان امور پر ہے جو ہر قسم کے مادی، وطنی، قومی اور رنگ و نسل کے امتیازات سے بلند و بالا ہیں تو ضرورت ہے کہ عام لوگوں میں ان کی دعوت و تبلیغ کا دائرہ وسیع کیا جائے۔

امید ہے کہ اس ضرورت کے لئے مجمع البحوث الاسلامیہ اپنا دائرہ کار وسیع تر کرے گا اور اس کام کے لئے مختلف ممالک میں عیسائی مبلغوں اور مشنریوں کی طرح وہ بھی اپنے دعوتی اور تبلیغی مشن اور وفود روانہ کرتا رہے گا۔

توقع ہے کہ ہر ملک کے مسلمان نہ صرف یہ کہ ان تبلیغی وفود کا خیر مقدم کریں گے بلکہ ان کے ساتھ اس دعوت و تبلیغ میں مخلصانہ تعاون بھی کریں گے اور اس دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں مسلمانوں کی زندگی کے مختلف شعبوں میں

① پارہ: ١٧، سورة الانبياء، الآية: ١٠٧. ② پارہ: ١٧، سورة الانبياء، الآية: ١٠٧.

③ پارہ: ١٨، سورة الفرقان، الآية: ١. ④ پارہ: ٤، سورة آل عمران، الآية: ٩٦.

اسلامی تعلیمات اور اسلامی رسم ورواج، مغربی تہذیب سے مس کئے بغیر رچ بس جائیں گے۔

ارشادِ خداوندی ہے: ”تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں بہترین نمونۂ زندگی ہے“ ①

اسلام کا اجتماعی دفاع..... حضرات! ہماری دلی تمنا اور دلی خواہش ہے کہ مجمع البحوث الاسلامیہ کی سرگرمیاں اسلام کے دفاع اور اس کے تحفظ میں تیز ہوں اور مستشرقین اور وہ دشمنانِ اسلام کے اعتراضات و جوابات کے لئے سرگرم عمل ہوں، نیز ہماری دلی خواہش ہے کہ مجمع البحوث الاسلامیہ اور ان حضرات مندوبین کے درمیان ایک دائمی اور مستحکم رابطہ قائم رہے اور اسلام پر مخالفین کی طرف سے کئے جانے والے شبہات و اعتراضات ان تمام حضرات کے پاس بھی روانہ کئے جائیں تا کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق جوابات تحریر کر کے ادارے کو روانہ کریں اور وہ ان کی اشاعت کا کام انجام دے۔ اس طرح اسلام کا یہ دفاع یقیناً اجتماعی اور مضبوط ترین ہوگا۔

مناسب ہوگا کہ اگر تمام مندوبین حضرات میں سے بعض افراد پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی جائے جو اس قسم کے مسائل پر غور وخوض کرنے کی مکلف ہو اور پھر اس کمیٹی کی وساطت سے وہ سوالات ادارہ کو بھیجے جائیں تو اسلام کا یہ ایک شاندار عالمی نظام ہو جائے گا۔

ادائے فرض..... بہر حال ہمیں توقع ہے کہ مجمع البحوث الاسلامیہ ایسے مسائل کا ایک عمومی ادارہ ہوگا اور ان شاء اللہ اسلامی تہذیب وثقافت کے موضوع پر مفید تالیفات مختلف زبانوں میں شائع کرے گا۔

یہ چند خیالات مختصر الفاظ میں ذمہ داران ادارہ کی خدمت میں پیش کرنے کے بعد میں سب سے پہلے صدر متحدہ عرب جمہوریہ السید جمال عبدالناصر کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کے بعد رئیس اجتماعات مؤتمر اور جناب ڈاکٹر محمود حسب اللہ صاحب جنرل سیکرٹری مؤتمر کی خدمت میں ہدیۂ تشکر وامتنان پیش کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

① پارۃ: ۲۱، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۲۱۔

تقسیم فلسطین اور اسرائیل کے وجود پر مسلمانانِ ہند کے دلی جذبات کا اظہار

حضرت حکیم الاسلام نوّر اللہ مرقدہٗ کی ایک تحریر

ذیل کی تجویز وتحریر حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ نے غزہ (مصر) میں پیش فرمائی جس میں فلسطین کی ناجائز تقسیم اور اسرائیل کے وجود پر مسلمانانِ ہندوستان کے دلی جذبات کا اظہار اور اسرائیل کے جارحانہ حملوں کے سلسلے میں مصر اور دوسری اسلامی ریاستوں سے مسلمانانِ ہند کی دلی ہمدردی اور اپنے سرگرم تعاون کا یقین دلایا گیا ہے۔ وحدتِ اسلامی کا تقاضا ہے کہ پوری دنیا کے مسلمان ایک دوسرے کے نفع ونقصان میں برابر کے شریک ہوں۔ ان کے جسم چاہے کروڑوں، اربوں سے متجاوز ہوں مگر روح ایک ہی ہو۔ امید ہے کہ حضرت حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کی یہ تحریر وحدت اور اخوتِ اسلامی کی دعوت کو بھی زندہ کر سکے گی۔

(ادارہ)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

بزرگانِ محترم..... مسلمانانِ عالم بالخصوص ممالکِ اسلامیہ کے لئے وہ حادثہ بڑا ہی الم ناک تھا، جب کہ حکومت برطانیہ نے یہود کے ساتھ کیے ہوئے وعدہ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے فلسطین کے حصے بخرے کر دیئے اور یہود کے لیے یہودی وطن کا خواب پورا کر دیا۔ برطانیہ کی اس حرکت کے خلاف ہر ملک کے مسلمانوں نے صدائے احتجاج بلند کی۔

حتیٰ کہ ان ممالک کے مسلمانوں نے بھی جو برطانیہ کے زیر تسلط تھے۔ برطانیہ کے خلاف احتجاجی جلسے اور کانفرنسیں منعقد کیں اور برطانیہ کی ناگواریوں کے باوجود احتجاجی ریزولیشن پاس کئے۔ چنانچہ اسی ذیل میں بمبئی میں بھی ایک عظیم الشان جلسہ میری صدارت میں منعقد ہوا۔

میں نے اس اجتماع میں کہا تھا کہ مسلمان تقسیم فلسطین کو کسی صورت بھی منظور نہیں کر سکتے۔ نہ دینی حیثیت سے، نہ جغرافیائی اور نہ تاریخی اعتبار سے بھی۔ اب یہ بات اسی طرح درست ثابت ہو رہی ہے۔ کیوں کہ تاریخ نے دوسری بار اب یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان کہیں بھی ہوں وہ ایک طاقت اور ایک ملت ہیں کہ جس کی وحدت کو وطن

اور انسان کا اختلاف ختم نہیں کرسکتا۔ اس لئے بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ مسئلہ فلسطین صرف عربوں ہی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک اسلامی مسئلہ ہے جس کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہے۔

حال ہی میں متحدہ عرب جمہوریہ پر جو سہ طاقتی جارحانہ حملہ ہوا، وہ درحقیقت دشمنانِ اسلام کے مخفی ارادوں کا انکشاف اور "کفر ملتِ واحدہ ہے" کا اظہار تھا۔

اس حملہ کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ عرب ممالک پر دوبارہ اقتدار حاصل کیا جائے۔ وہ عربی اور اسلامی ممالک کو نوآبادیات بنانے کی اور اسرائیل کے لئے راستے صاف کرنے کی ایک نئی سامراجی چال تھی۔

لیکن خداوندی نصرت وتائید نے السید جمال عبدالناصر کو اس سہ طاقتی حملہ کے مقابلہ میں بے مثال اور عظیم الشان کامیابی عطاء فرمائی اور دشمنانِ اسلام کو ایسی رسوائی اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا جسے تاریخ کبھی فراموش نہ کرسکے گی۔

اس حادثہ کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس نے امتِ مسلمہ عربیہ کو اس کی غفلت سے چونکا دیا اور اس نے بخوبی سمجھ لیا کہ فلسطین اور ایسے ہی دیگر اسلامی معاملات کا دفاع اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ سب مسلمان اس سلسلہ میں متحدہ ومتفق نہ ہوں۔

میں ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی درس گاہ "دارالعلوم دیوبند" کے مہتمم کی حیثیت سے اور میرے رفقاء مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت صوبۂ بہار، ہم تینوں مسلمانانِ ہند کی جانب سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم سب مسئلہ فلسطین کی جدوجہد میں اخلاقی، مادی اور روحانی ہر قسم کی ممکنہ معاونت کے لئے ہمہ وقت تیار ہیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محمد طیب

مہتمم دارالعلوم دیوبند (نزیل فلسطین غزہ)

عالمی موتمرِ اسلامی قاہرہ سے واپسی پر خطاب

ہم نظری طور پر اپنے لئے منصب اجتہاد کا استحقاق ثابت کرنے پر اپنا زور صرف کریں، یہ زیادہ موزوں ہوگا کہ فکری قوتوں سے مسائل کا عملی حل پیش کر دیں۔ تاکہ مسائل اپنے حقیقی دلائل کے ساتھ سامنے آ جائیں اور ان کے قبول و عدم قبول کا فیصلہ کیا جا سکے۔ پس اشخاص کی اجتہادی قوتوں پر غور کئے جانے سے مسائل پر غور کیا جانا زیادہ سہل اور مختصر راستہ ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ!

احوالِ واقعی..... حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیو بند ۶ مارچ ۱۹۶۳ء کو سفرِ مصر کے لئے روانہ ہوئے اور وہاں سے حجازِ مقدس ہوتے ہوئے بعد فراغت حج ۱۹ مئی ۱۹۶۳ء کو ورود فرمائے دیو بند ہوئے۔ اسٹیشن دیو بند پر بسلسلۂ استقبال طلبہ، اساتذہ کارکنان دفاتر اور اہلِ شہر کا ہجوم تھا۔ طلبہ خوشی کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ ملاقات، مصافحہ اور دعاء کے لئے خاص نظم قائم کیا گیا تھا جو حضرات اساتذہ کی نگرانی میں عمل آیا۔ طلبائے دارالعلوم کی درخواست پر ایک عظیم الشان جلسہ میں، جو دارالحدیث میں منعقد ہوا تھا اور حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، حضرت ممدوح نے خطاب فرمانا منظور کر لیا۔

جلسہ کی صدارت حضرت مولانا فخر الحسن صاحب استاذ دارالعلوم نے فرمائی۔ ابتداء میں طلباء اور بعض اہلِ شہر کی طرف سے خیر مقدم کی نظمیں پڑھی گئیں۔ جن میں شاعرِ انقلاب علامہ انور صابری کی نظم خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس کا مجمع پر کافی اثر پڑا۔ آخر میں حضرت ممدوح نے نعروں کی گونج میں ایک بلیغ اور جامع تقریر شروع فرمائی جو تقریباً دو اڑھائی گھنٹہ جاری رہی، آپ نے اس شاندار خیر مقدم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سفرِ مصر و حجاز کے تاثرات اور عالمی موتمرِ اسلامی قاہرہ اور اجتماع مدینہ یونیورسٹی کے احوال و کوائف پر روشنی ڈالی۔

موتمر کے اغراض و مقاصد..... آپ نے فرمایا کہ قاہرہ کی اس عالمی موتمر کے اغراض و مقاصد کی کوئی تفصیل

اس دعوت نامہ میں نہ تھی، اجمالی طور پر دعوت کا مقصد جدید تمدن سے پیدا شدہ مسائل کی شرعی تنقیح و تحقیق اور اس سلسلہ سے علماءِ عالمِ اسلامی کا ربطِ باہمی ظاہر کیا گیا۔ جس سے اتحاد بین المسلمین کا جذبہ مفہوم ہوتا تھا، نیز مصر کے مرکزی شہروں کی سیر۔ البتہ موتمر کے اجلاس اور رفتارِ عمل سے جو اغراض و مقاصد ہمارا ذہن اخذ کر سکا، ان کا خلاصہ یہ تھا:

1 ...... نئے تمدن اور جدید انکشافات سے پیدا شدہ مسائل کے بارے میں اصولی طور پر جامعۂ ازہر کا موقف علماء کے سامنے رکھ کر ان کی فکر سے اس میں استفادہ۔

2 ...... بلادِ مختلفہ کے علماء اور دینی حلقوں میں بین الاقوامی رابطہ کے ساتھ ساتھ موتمر سے ان کی علمی وابستگی ہوتا کہ وہ پورے عالمِ اسلام کے عوامی اتحاد کا ذریعہ ثابت ہو۔

3 ...... جامعۂ ازہر کی نئی تعمیر کا سنگِ بنیاد اور اس کی ہزار سالہ خدمت و عظمت کا تعارف۔

4 ...... حکومتِ مصر کے بعض اہم دینی اقدامات کا اعلان و تشہیر۔

5 ...... فلسطین کی ناجائز تقسیم کی مذمت اور مقبوضہ فلسطین کی عربوں کے حق میں بازیابی کے لئے ایک عالمی تجویز کی منظوری۔

6 ...... مصر کی جدید ترقیات اور مصری قوم کے شعور بیداری کا مطالعہ۔

7 ...... ان مقاصد کے ساتھ موتمر کا اجلاس مَتی محافظۃ القاہرہ کے فنک ہوس قصر میں شروع ہوا۔ جس میں ۳۸ ملکوں کے ستر نمائندہ علماء نے شرکت کی، مصری علماء کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔ مجموعی طور پر سوا سو علمی نمائندے شریک جلسہ ہوئے۔ ہند و پاکستان کے نمائندے سب کے سب فضلائے دیو بند تھے، اجلاس کی کارروائی نہایت منضبط اور باقاعدہ تھی۔ پہلے ہی دن آرٹ پیپر کا ایک خوش نما کتابچہ برنامج (پروگرام) کے نام سے طبع شدہ، مندوبین کے سامنے رکھ دیا گیا تھا۔ جس میں پہلے دن سے لے کر آخری دن کا نظامِ عمل بقیدِ گھنٹہ و منٹ پیش کر دیا گیا تھا، اس کے مطابق کانفرنس چلی اور چلتی رہی۔ ہر روز کی کارروائی اور خواندہ مقالات و مباحث طبع ہو کر اگلے روز مندوبین کے سامنے آجاتے تھے جس سے رائے قائم کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

موتمر کے زیرِ بحث مسائل ...... پہلے نمبر کے تحت موتمر میں جن مسائل کو بذیلِ برنامج اہمیت دی گئی اور ان پر حضرات خطباء نے خطاب کیا وہ یہ تھے:

1 ...... اسلام میں مالیات کا نظامِ تقسیم۔

2 ...... عرب اور اسلام کے عالمگیر نفوذ کے طبعی اسباب۔

3 ...... اسلام میں اراضی کی شخصی ملکیت اور اس کے آثار۔

4 ...... اغنیاء کے مال میں غریبوں کے حصہ کی نوعیت۔

5 ...... اسلام میں حسبت (احتساب) یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا نظام

6 ......اسلام میں اجتہاد کا ماضی وحال۔

7 ......اسلام میں دولتی علاقے۔

تقریباً ان سب ہی عنوانوں پر مقالے پڑھے گئے اور زبانی خطابات بھی ہوئے۔

مسئلۂ اجتہاد...... لیکن نئے حوادث ومسائل وغور وفکر کے سلسلے میں چھٹے نمبر (مسئلۂ اجتہاد) پر زیادہ زور دیا گیا جو باوجود چھٹا نمبر ہونے کے، پہلے ہی دن کے سامنے آ گیا تھا اور اس کی بحث میں کانفرنس کی پوری مدت کا دو تہائی حصہ صرف ہوا۔ مگر یہ ظاہر کیا گیا کہ جب تک علماء کے لئے اجتہاد کا دروازہ نہیں کھولا جائے گا اس وقت تک وقت کے پیچیدہ مسائل حل نہیں ہو سکیں گے۔ کیوں کہ آج کی صورت حال جدید انکشافات کی وجہ سے بالکل نئی ہے۔ پچھلا نقشِ قدم اس کا تصفیہ نہیں کر سکتا۔

اس موضوع پر اجتہاد کا مسئلہ اٹھاتے ہوئے بطور تحریک الاستاذ علی عبدالرحمٰن ازہری وزیر سوڈان نے ایک پر مغز اور طویل مقالے سے اس کی ابتداء کی اور اس کے بعد اجتہاد، تقلید اور تلفیق سے متعلق مقالے اور مناقشات سامنے آنے شروع ہو گئے اور انہوں نے اتنا وقت لیا کہ کانفرنس کا زیادہ تر وقت اسی مسئلہ میں لگ گیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا کانفرنس کا بنیادی موضوع یہی ایک مسئلہ ہے۔ مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ ناظم جامعہ اسلامیہ کراچی فاضل دارالعلوم ورئیس وفد پاکستان کا جوابی مقالہ اس سلسلہ میں خاص طور پر قابل ذکر ہے جو نہایت پر مغز اور محققانہ تھا۔

حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ: دسویں دن (۱۲ مارچ ۶۴ء) کو ان کا نام پکارا گیا اور مقالہ پڑھنے کی خواہش کی گئی۔ یہ مقالہ تقریباً بیس منٹ میں پڑھا گیا۔ یہی وہ بیان تھا جو مؤتمر میں آپ نے ذمہ دارانہ طریقے پر بطور نمائندہ دارالعلوم دیا اور مصری اخبارات نے اس کے اقتباسات ''خطاب رئیس الوفد الہندی'' کے عنوان سے شائع کئے۔

آپ نے فرمایا کہ اس مقالہ میں، میں نے امکانی حد تک تمام پیش شدہ مسائل کے بارے میں اجمالی اور اصولی طور پر اظہار خیال کیا تھا۔ اس وقت مقالہ سنانے کا موقع نہیں ہے، وہ اپنے موقع پر شائع ہو جائے گا۔ مگر میں اس میں پیش شدہ امور آپ کے سامنے عرض کئے دیتا ہوں، گو اختلاف لغت والفاظ سے عنوان اور اسلوب بیان کچھ مختلف ہو جائیگا اور اجمال وتفصیل کا بھی فرق پڑ جانا ممکن ہے، لیکن روح مقالہ کی قائم رہے گی۔

مجتہد فیہ مسائل کا حل قوّتِ فکر وعمل سے پیش کرنے کی ضرورت ہے...... آپ نے اس مقالہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ: اس میں عرض کیا کہ اس وقت اجتہاد وتقلید کی بحث میرے خیال میں موضوع سے متعلق نہیں ہے، گو اس سلسلہ میں خواندہ مقالات نہایت قیمتی اور پر از معلومات ہیں جن سے ہماری معلومات میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کہ اس وقت یہ بحث اٹھانے کا موقع نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی کیوں کہ

اجتہاد کا دروازہ بند ہو یا کھلا ہوا ہو۔ اور کھلے ہونے کی صورت میں یہ باب مفتوح اجتہاد مطلق کا ہو یا اجتہاد خاص کا ضرورت اس بات کی ہے کہ آج جو مسائل مسلمانوں کو درپیش ہیں اور انہیں پیچیدہ سمجھا جا رہا ہے ان کے ضمن میں ہر وہ شخص جو کوئی اجتہادی قوت رکھتا ہے، اسے عملاً پیش کرے تاکہ ارباب فکر ونظر اس قوت کو پرکھ کر کوئی فیصلہ دے سکیں۔ کیوں کہ اجتہاد مطلق ہو یا اجتہاد فی المذہب، ہر ایک کی شرائط کتب فن میں محفوظ ہیں جو اجتہاد کی صحت وسقم کے پرکھنے کا معیار ہیں۔ اگر کوئی اجتہاد فی الواقع اپنی ساری شرائط کے ساتھ کسی شخص کے پاس موجود ہے اور وہ مسائل کے ضمن میں سامنے آ جائے جو مسائل کے اجتہادی حل میں اصول وفقہ کے مطابق ہوگا تو کون جانتے بوجھتے اس سے انکار کر سکے گا اور اگر شرائط ہی نہ پائی گئیں تو کون اس کے اعتراف وتسلیم پر مجبور کیا جا سکے گا؟

اس لئے بجائے اس کے کہ ہم نظری طور پر اپنے لئے منصب اجتہاد کا استحقاق ثابت کرنے پر اپنا پورا زور صرف کریں، یہ زیادہ موزوں ہوگا کہ فکری قوتوں سے مسائل کا عملی حل پیش کر دیں۔ تاکہ مسائل اپنے حقیقی دلائل کے ساتھ سامنے آ جائیں اور ان کے قبول وعدم قبول کا فیصلہ کیا جا سکے۔ پس اشخاص کی اجتہادی قوتوں پر غور کئے جانے سے مسائل پر غور کیا جانا زیادہ سہل اور مختصر راستہ ہے۔ لیکن اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ ایسے مسائل کے عملی سوالات، واقعاتی سلسلوں سے مرتب کر کے کافی مدت پہلے سے مندوبین کے پاس بھیج دیے جاتے یا اب بھیج دیے جائیں۔ اگر مسائل کا مجوزہ تصفیہ پیش نظر ہے تاکہ متعلقہ مواد فراہم کر کے ہر شخص علی وجہ البصیرت بحث وتمحیص میں حصہ لے سکے اور مؤتمر کے بنیادی فیصلہ تک پہنچ جائے۔

ہر دور میں نئے مسائل ابھرتے رہے اور ان کا حل پیش کیا جاتا رہا..... حضرت ممدوح نے تقریر جاری رکھتے ہوئے اپنے خطاب کا یہ حصہ بھی پیش کیا جو مؤتمر میں پڑھا گیا۔ نئے حوادث اور ان سے ابھرنے والے نئے مسائل کچھ اسی دور کی خصوصیت نہیں۔ بلکہ اسلام کے ہر قرن میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور نئے نظریات وافکار نئے واقعات واحوال کی وجہ سے سامنے آتے رہے ہیں اور ہر دور میں متفکر علماء اور مبصر مفتی اپنی علمی صلاحیتوں اور فکری قوتوں سے اصول فقہ اور منضبط مسالکِ فقہیہ کی روشنی میں ان کے فیصلے دیتے رہے اور امت انہیں قبول کرتی رہی ہے۔ چناں چہ ہر دور کے فتاوی کا ذخیرہ اس کا شاہد عدل ہے، آج بھی نئے حوادث ومسائل کی تنقیح وافتاء میں علماء امت نے کوتاہی نہیں کی۔ ''حوادث الفتاوی'' اور ''آلات جدیدہ'' کے شرعی احکام کے نام سے مستقل کتابیں بھی منضبط کر کے شائع کر دیں۔ جو جدید مسائل کا شافی حل پیش کرتی ہیں، نیز جزئی مسائل پر الگ الگ مقالات و رسائل بھی مرتب کر کے شائع کیے جو امت کے زیر عمل ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

فکر وعمل کی یکسانی وحدتِ امت کا موجب ہے..... البتہ اگر ضرورت ہے تو اس کی، کہ اب ایسے احکام کی اشاعت اور تنقیح مزید عالمی پیمانے پر ہو اور یہ اشاعت وتنقیح بجائے مقامی ہونے کے بین الاقوامی انداز میں سامنے لائی جائے۔ کیوں کہ وسائل نقل وحمل کی آسانیوں کی وجہ سے پوری دنیا ایک عائلہ اور ایک قبیلہ کی مانند

ہوگئی ہے۔ اس لئے آج کی ایک پورے ملک کی جماعتی بات بھی پوری دنیا کی نسبت سے شخصی اور انفرادی ہی بات کہلائی جارہی ہے اور جب تک وہ بین الاقوامی نہ ہو جائے جماعتی نہیں بنتی۔ اس لئے موزوں ہوگا کہ ان جدید فتاویٰ کا موقف خواہ وہ کسی بھی ملک کے ہوں، پورے عالمِ اسلام کے سامنے آجائے اور عالمی فکر ونظر سے یہ احکام عالمی انداز سے امت کے سامنے پیش ہوں۔

ظاہر ہے کہ اس کام کو مجمع البحوث الاسلامیہ سے بہتر اور کون انجام دے سکتا ہے۔ وہی اپنے عالمگیر اثرات سے ملک کے جدید فتاویٰ، مقالات اور کتب کے ذخیرے فراہم کرکے، بذریعہ تراجم، اعضاءِ مؤتمر کے سامنے رکھ سکتی ہے۔ تاکہ فکر میں عالمیت اور یکسانی پیدا ہو کر امت کے عمل میں بھی یکسانی کی جھلک آجائے جو وحدت الملت کے لئے ایک مؤثر ترین وسیلہ کا کام دے سکتی ہے اور یہی وہ عالم اسلامی کا مضبوط اتحاد ہوگا جو پائیدار بنیادوں پر قائم ہو کر پائیدار ثابت ہو سکے گا۔

انسانیت کو عالمی دین کی تلاش...... آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ: میں نے مقالہ میں یہ بھی کہا کہ اس کے ساتھ ہی جو چیز سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے وہ نفسِ اسلام سے دنیا کو روشناس کرانا ہے۔ جبکہ آج کی کائنات پسند دنیا ایک فطری اور جامع دین و دنیا مذہب کی تلاش میں خود بھی سرگرداں اور متلاشی ہے اور جبکہ وسائل نقل وحمل کی وسعت وسہولت کی وجہ سے پوری دنیا ایک خاندان کی مانند ہوگئی ہے جس کے تمام تمدنی امور میں یکسانی آتی جارہی ہے، ملکوں کی مقامی خصوصیات مٹتی جارہی ہیں اور اشتراک کی ایک وسیع فضا پیدا ہورہی ہے جس سے دنیا کا پلیٹ فارم بھی ایک ہوتا جارہا ہے اور جذبات کی رو اس طرف آرہی ہے کہ تمدن وتہذیب سب کا ایک ہو، معاشرت ایک انداز کی ہو، حتیٰ کہ سیاست بھی سب کی ایک رنگ کی ہو اور ایک ہی پلیٹ فارم سے چلے اور آگے بڑھے۔ چنانچہ عملاً ایسا ہوتا جارہا ہے اور پوری دنیا ایک ہی عالمگیر تمدن اور ہمہ گیر معاشرت اختیار کرتی جارہی ہے۔

اس اشتراکِ فکر کی وجہ سے طبعاً دنیا کے جذبات ادھر بھی آرہے ہیں کہ مذہب اور دین بھی سب کا ایک ہو، دینی پلیٹ فارم بھی سب کا ایک ہو اور اسے کوئی ایسا عالمگیر دین ہاتھ آجائے جس میں نہ وطنی حد بندیاں ہوں، نہ قومی نسلی اور وطنی تحدیدیں ہوں اور نہ لونی (رنگ کی) تخصیصات۔ بلکہ وہ نفسِ انسانیت کا مصلح ہو اور انسانیت کا نام لے کر پوری ہی دنیا کو آواز دیتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا مذہب اسلام کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا جس نے یہی عالمگیر نعرۂ اخوت ومساوات لگایا اور دنیا کو دین میں پیوست کردیا ہے اس لئے دنیا دوسرے لفظوں میں اسلام کو پکار رہی ہے اور اس کی خواہاں ہے۔ اس صورت میں ہمارا فرض ہے اصل اسلام کو ان عالمگیر وسائل سے پورے عالم کا دین بنانے کی ہمت لے کر اٹھیں۔

ظاہر ہے کہ اس اہم ترین مقصد کے لئے جس قوت اور جن وسائل کی ضرورت ہے وہ مجمع البحوث کے پاس موجود ہیں اور غیر موجود کو باآسانی فراہم بھی کرسکتی ہے، جس کے لئے سارا عالمِ اسلام اس کے ساتھ تعاون کرنا

اپنا فرضِ منصبی سمجھے گا۔

اسلام کے بارے میں عالمگیر سطح پر ازالۂ شبہات...... آپ نے مقالے کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ: اس سلسلہ میں جیسے اس مثبت پہلو پر کام کرنا ضروری ہے ایسے ہی منفی انداز میں یہ بھی ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ اسلام سے بے خبر یا غیر معاندین خواہ وہ مستشرقین یورپ ہوں یا مستغربین ایشیا، جو شکوک وشبہات یا اعتراضات اسلام کے بارے میں پھیلا کر قلوب کو تشویش وتذبذب اور منافرت کا شکار بناتے رہتے ہیں ان کو بھی عالمی پیمانہ پر ہی دفع کیا جائے۔ جبکہ وہ شکوک کی رو بھی عالمی انداز میں بہہ رہے ہیں۔ بلاشبہ علماءِ ازہر نے اس سلسلہ میں شاندار اور وقیع خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن وہ لسان کی اجنبیت کی وجہ سے سب کے سامنے نہیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ اب یہ خدمت بھی بین الاقوامی ہی رنگ سے ہو جس میں پورے عالمِ اسلامی کے علماء کے نظریات شامل ہوں اور جس طرح مختلف ممالک کے مسیحی مبشرین ان شکوک کو عالمگیر انداز میں پھیلا رہے ہیں اسی طرح مختلف بلاد کے علماء کی طرف سے ان کے جوابات بھی عالمگیر ہی انداز میں سامنے آئیں۔

ظاہر ہے کہ اس وقت پورے عالم میں اسلام اور مسیحیت کی یہ نظریاتی اور فکری جنگ ہے، اس لئے اس کا مقابلہ بھی برابر ہی کے ہتھیاروں سے ہونا چاہئے جب ہی وہ موثر اور کارآمد ثابت ہوگا۔ اس لئے مجمع البحوث کے برنامج میں یہ نمبر بھی مقصدی حیثیت سے شامل رہنا چاہئے اور اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے فکر واجتہاد کا دائرہ صرف فقہیات وجزئیاتِ مسائل تک محدود نہ رہنا چاہئے۔ بلکہ پوری دنیا کو سامنے رکھ کر پورے اسلام کی تعلیمات کی توسیع واشاعت کا فرض ادا کرنا چاہئے۔

دائرۂ اجتہاد میں اتباعِ اسلاف...... حضرت ممدوح نے تقریر جاری رکھتے ہوئے اور مقالے کے مشمولات کا ذکر کرتے ہوئے مزید فرمایا کہ: ہم میں اجتہاد کی کچھ نہ کچھ قوتیں ہماری بساط کے مطابق آج بھی موجود ہیں۔ ورنہ ہوتیں تو مفتیوں کو فتویٰ دینا اور معاملات پر غور کر کے فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا اس لئے موجودہ اجتہاد کو استعمال کر کے اضافہ کا منتظر رہنا چاہئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ہمیں اجتہاد کی طلب اس لئے نہ ہونی چاہئے کہ ہم آج کے مغربی تمدن اور اس کی مصنوعی تہذیب سے مرعوب ہو کر اس کی تائید میں نئے نظریات تو پہلے سے خود قائم کرلیں اور پھر قرآن وحدیث سے ان کے مؤیدات تلاش کر کے ان کو حدودِ جواز میں لانے کی فکر کریں۔ جو آج ایک عالمگیر وباء کی صورت میں ہمارے سامنے ہے ظاہر ہے کہ یہ کتاب وسنت کا اتباع نہیں۔ بلکہ کتاب وسنت سے اپنا اتباع کرانا ہے جو علاوہ بے ادبی کے، ایک مہلک اور خطرناک حرکت بھی ہے۔

ہمارے لئے اس فکر ونظر یہ طریقِ استنباط میں جہاں اصول وقواعدِ فن کی پابندی ضروری ہے وہیں سلف کی مکمل پیروی کے ساتھ ان کے ترکہ سے پہنچا ہوا وہی ذوق تھامے رہنا بھی ضروری ہے جو انہوں نے اپنے اسلاف سے ورثہ میں پایا اور بطور توریث (وراثت) ہم تک پہنچایا۔ ورنہ اس کے بغیر دین کا وہ رنگ قائم نہیں رہ سکتا جو

"وَیُزَکِّیْهِمْ" کے تحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بخشا۔ اس لئے طبعاً ہم اجتہاد کے دائرہ میں رہ کر بھی اتباعِ سلف کے دائرہ سے باہر نہیں جاسکتے۔ تو آنکہ ایک ایک سلف اور ایک ایک اسوۂ سلف ہمارے جہد واجتہاد کی انتہائی منزل ہونی چاہئے۔ اس پر حضرت ممدوح نے مقالہ کی چند مثالیں بھی نقل فرمائیں جو مقالہ میں آپ پڑھ سکیں گے۔

عرب اتحاد کی مذہبی اہمیت ...... تقریر کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ بلادِ مختلفہ کے علماء کے جمع ہونے سے قدرتی طور پر ربط واتحاد کا ایک مظاہرہ ہوا جو خوش آئند تھا اور ساتھ ہی مؤتمر کے مقاصد میں بھی داخل تھا۔ آپ نے اتحادِ عالمِ اسلامی کی ضرورت تسلیم کرتے ہوئے زیادہ تر عرب اتحاد اور اس میں بھی خصوصیت سے مصر، شام اور حجاز کے اتحاد پر اہمیت کے ساتھ زور دیا۔ اس سلسلہ میں آپ نے شرعی اشارات سے مصر وشام اور حجاز کی خصوصیات بتلاتے ہوئے فرمایا کہ ہم ان تین مرکزی ملکوں کو محض سیاسی یا جغرافیائی حیثیت سے اہمیت نہیں دیتے۔ بلکہ دینی اور مذہبی حیثیت سے اہم اور مقدس جانتے ہیں۔ شریعت نے حجاز کو مرکزِ عبادت بتایا ہے شام کو مرکزِ شوکت کہا ہے اور مصر کو مرکزِ عسکریت فرمایا ہے۔ حجاز مرکزِ امن اس لئے رکھا گیا کہ عبادت بغیر امن کے نہیں ہوسکتی، شام کو مرکزِ جنگ ودفاع اس لئے رکھا گیا کہ شوکت بغیر مدافعت وہجوم کے قائم نہیں ہوسکتی اور مصر کو مرکزِ عسکریت اس لئے رکھا گیا کہ مشرق میں مغرب کے سیاسی اقدامات کی روک تھام بغیر عسکری قوت کے نہیں ہوسکتی۔ اس لئے یہ تین ملک تین اقسام کی مخصوص مرکزیتوں کے حامل ثابت ہوئے۔ اس صورت میں ان کے باہمی ربط کی صورت حاصل خود بخود نکل جاتی ہے اور وہ یہ کہ امن عبادت کے لئے شوکت ضروری ہے اور شوکت کی بقاء کے لئے عسکریت ضروری ہے۔ تو منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حجاز کا تحفظ بلادِ شام کی شوکت کے بغیر ممکن نہیں اور شام کی شوکت کی برقراری مصر کی عسکری قوت کے بغیر ممکن نہیں اس لئے جب تک مصر کی فوجی طاقت مضبوط نہ ہو اور شام وحجاز سے ان کا اتحاد نہ ہو، نہ شام وحجاز کا تحفظ ہوسکتا، نہ خود مصر کا۔

اور جب کہ یہ تمام نقاط خود احادیث میں دکھائے گئے ہیں تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ تمام نقاط بحث محض سیاسی یا جغرافیائی نہیں بلکہ دینی ہیں۔ اس لئے ہم مصر وشام اور حجاز کا باہمی اتحاد دینی حیثیت سے ضروری سمجھتے ہیں۔ اندریں صورت اگر آپ عالمِ اسلام کا اتحاد چاہتے ہیں تو اس کے لئے عرب اتحاد پہلا زینہ ہے اور عرب اتحاد کا پہلا قدم مصر وشام اور حجاز کا اتحاد ہے، آج جبکہ صدر جمہوریہ متحدہ عربیہ السید جمال عبدالناصر نے اس نکتہ کو سامنے رکھ کر عرب اتحاد کا نعرہ لگایا ہے اور بالفاظ دیگر اسلامی اتحاد کا پروانہ ڈالا ہے تو ہمیں ان کے اس نعرے کی قدر کرنی چاہئے اور اس کے لئے یہ مؤتمر بلاشبہ ایک مبارک قدم ہے۔

مصر کی صنعتی ترقی ...... آپ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ مؤتمر کے ان جلسوں کے دوران ہی دو تین دن کے بعد مصر کے مختلف مرکزی شہروں کے سفر کا پروگرام رکھا گیا تھا موٹر کاروں سے اور کہیں ہوائی جہاز کے ذریعے۔

سب سے پہلا سفر " اَلْمَحَلَّةُ الْکُبْرٰی" کا ہوا جو مصر کا صنعتی مرکز ہے اور اس میں پارچہ بافی اور قالین بافی

وغیرہ کی مل اور فیکٹریاں ہیں۔ دوسرا سفر "طنطا" کا ہوا جو مصر کا ایک بڑا صنعتی شہر ہے، تیسرا سفر نہر سوئز اور فلسطین کا ہوا جو مصر کی فوجی قوت کا مرکز ہے۔ اس سفر میں اولاً عریش آیا جو نہر سوئز کے کنارے ایک پرفضا شہر ہے اور اس سے ایک میل آگے بڑھ کر نہر سوئز ہے جس کے کناروں پر چلتی پھرتی گودیوں کا انتظام ہے۔ نہر سوئز مصر کی ایک عالمگیر شوکت کا قدرتی نشان ہے۔ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد اس سمندری نہر سے یورپ، ایشیا، افریقہ اور امریکہ کے جہاز گزرتے ہیں جن کا کسٹم لیا جاتا ہے اور تلاشی لینے کے بعد ڈیوٹی بھی وصول کی جاتی ہے۔

نہر سوئز سے گزر کر صحرائے سینا آیا جس سے گزرتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل کے گزرنے کا تصور بندھا رہا اور اس مقدس وادی کی برکات سے قلب و روح متاثر ہوتے رہے۔ اس کے بعد غزہ آیا جو فلسطین کا آخری سرحدی شہر اور فوجی حیثیت سے ایک اہم مقام ہے۔ یہی شہر امام شافعی رحمۃ اللہ کا مولد و منشاء (جوان ہونے کی جگہ) بھی ہے۔ چنانچہ ہمیں وہ ہنڈ تک دکھلائی گئی جو آج حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مکانِ ولادت پر بنی کھڑی ہے۔

غزہ میں فلسطینی عربوں نے ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ شب میں ہم وہاں پہنچے تو غزہ کے ایک پرتکلف اور وسیع ہوٹل میں طعام و قیام کا انتظام تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ایک مختصر سا استقبالیہ جلسہ اسی ہوٹل میں ہوا۔ صبح کو ہم نے کئی لاکھ فلسطینی پناہ گزینوں کی جھونپڑیاں دیکھیں جن میں فلسطین کے تباہ حال عرب عسرت و تنگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور پھر فلسطینی عربوں کی طرف سے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں ان عالمی علماء کو "مرحبا" کہا گیا، خیر مقدمی نعرے لگائے گئے، تقریریں ہوئیں اور آخر میں تقسیم فلسطین کے خلاف ایک عالمی تجویز پاس ہوئی۔

واپسی پر مؤتمر کے دو تین اجلاسوں کے بعد پھر ہوائی جہاز سے اسوان کا سفر ہوا، جہاں دریائے نیل پر بند باندھا جا رہا ہے اور جدید اسوان شہر کی تعمیر کی جا رہی ہے، جس سے مصر کی ٹیکنیکل ترقی کا پروگرام سامنے آیا اور ہم نے دیکھا کہ پندرہ میل کی حدود میں لوہے اور سیمنٹ کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ فیکٹریاں اور کارخانے وسیع پیمانے پر تعمیر ہو رہے ہیں۔

اس سفر سے واپسی کے بعد "مدیریۃ التحریر" کا سفر ہوا جو مصر کی زراعتی ترقیات کا ایک اہم مرکز ہے۔ یہاں فوجی دستے نے مہمانوں کو خیر مقدمی سلامی دی، بچوں نے فوجی کرتب دکھلائے اور ورزشی کھیلوں کا مظاہرہ کیا، مہمانوں کو عطر کی شیشیاں پیش کیں اور یہ اجتماع چھ گھنٹے تک جاری رہا۔ شام تک وہاں سے واپسی ہوئی اور صبح سے پھر بدستور مؤتمر کے اجلاس جاری رہے۔

دار القرآن کا سنگِ بنیاد...... اعضاءِ مؤتمر کے اس مبارک اجتماع کے موقع پر قاہرہ میں دو اہم اور عظیم الشان عوامی جلسے بھی منعقد کیے گئے، ایک دار القرآن کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لئے جو جامعہ ازہر سے متعلق ہے اور اسے مستقل حیثیت دے دی گئی ہے، تاکہ قرآن کریم کی تعلیم ذہنی اور محض تبرک نہ رہے بلکہ ایک مستقل نصب العین کی حیثیت

سے سامنے آئے۔ اس جلسہ کی صدارت نائب صدر جمہوریہ السید حسین شافعی نے فرمائی۔ تلاوت، اور تاسیس کے بعد اس جلسہ میں تمام مہمانوں کو مصر کے مطبوعہ قرآن شریف بطورِ ہدیہ پیش کئے گئے۔

مدینۃ الازہر......دوسرا عظیم الشان جلسہ جامعہ ازہر کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لئے مدینۃ النصر میں منعقد ہوا جس کا پنڈال غیر معمولی طور پر وسیع اور پر شوکت بنایا گیا تھا اور اس میں تقریباً بیس سے پچیس ہزار آدمیوں کا اجتماع ہوا۔ یہ پنڈال جھنڈیوں اور کتبوں سے سجایا گیا تھا۔ اسٹیج پر مندوب علماء کی کرسیاں تھیں۔ اسٹیج کے نیچے ایک طرف مصری زعماء و علماء بٹھلائے گئے تھے اور دوسری جانب سفراءِ دول (ممالک کے سفیروں) کی نشستیں تھیں۔ صدارت کے لئے اعلان صدر جمہوریہ عربیہ متحدہ السید جمال عبدالناصر کا تھا لیکن وہ بعض ہنگامی معروفیات کی وجہ سے نہیں آسکے، تو ان کے امر سے سید حسین شافعی نائب صدر جمہوریہ نے ان کی نیابت کی اور جامعہ ازہر کی نئی تعمیر کے لئے سنگِ بنیاد رکھا۔ یہ ایک پورا شہر مدینۃ الازہر کے نام سے تعمیر کیا جارہا ہے۔ جس میں جامعہ ازہر کے تمام کالج، مدارس، دارالاقامے اور دفاتر یکجا ہوں گے جو اب منتشر ہیں اور جامعہ ازہر نے سولہ کروڑ روپیہ کا تخمینہ اس کے لئے منظور کیا ہے۔

ہزار سالہ علمی عظمت......اس اجتماع میں اجمالاً جامعہ ازہر کی ہزار سالہ عظمت پر روشنی ڈالی گئی جس کا سب نے اعتراف کیا کہ اس ہزار سالہ جامعہ نے بلاشبہ بڑے بڑے ائمہ علوم وفنون پیدا کئے۔

ظاہر ہے کہ جب اس کے فضلاء اور فارغین میں جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ جیسے ائمہ علم وہدایت ہوں تو اس کی زرّیں خدمات سے کون انکار کرسکتا تھا۔

صدر ناصر خدمات اور کردار......اسی دوران ملک میں الیکشن کا ہنگامہ بھی برپا ہوا۔ نئی پارلیمنٹ چنی گئی اور اس میں السید جمال عبدالناصر صدرِ مملکت چنے گئے۔

نئی پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس نئے صدر منتخب (السید جمال عبدالناصر) کی صدارت میں ہوا جس میں صدر مملکت نے تقریباً تین گھنٹے تقریر کی اور اس میں مصر کے جدید دور کی (جو شاہیت کے خاتمہ کے بعد کا ہے) ترقیات کا مفصل تذکرہ کیا اور قوم نے بے پناہ محبت اور تالیوں کی گونج میں صدر کا خطاب سنا اور اس سے متاثر ہوئی۔

مصری قوم اپنے موجودہ صدر سے کافی محبت رکھتی ہے۔ اولاً صدر کی خدمات کی وجہ سے، جن میں سے عظیم ترین خدمت اتحادِ ثلاثی (اسرائیل، برطانیہ، فرانس) کے حملہ سے مصر کو بچانا اور اندرونی طور پر مصر کو مہلک قسم کی سرمایہ داری اور جاگیرداری سے نجات دلانا، نیز پوری قوم کو یکسانی کے ساتھ ہر ممکنہ ترقی کے مواقع بہم پہنچانا اور مصر کو صنعتی، زراعی اور علمی ترقیات کے راستہ پر ڈال دینا وغیرہ شامل ہیں۔

دوسرے صدر کے ذاتی کردار کی پختگی اور سادگی کا مصر والوں پر خاص اثر ہے کہ جمال عبدالناصر نے اپنی ذاتی رہائش کے لئے آج تک کوئی سرکاری عمارت استعمال نہیں کی اور جاہ وجلال کی رسمی نمائش سے الگ تھلگ رہے بلکہ ابھی تک وہ اپنے ہی قدیم ذاتی مکان میں رہائش رکھتے ہیں۔ جو شہر میں اور مکانوں کے ساتھ ایک عام

مکان کی حیثیت رکھتا ہے، ان کی اولاد اور بچوں کے لئے اسکول وغیرہ جانے میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ عام بچوں کی طرح یہ بچے بھی سائیکلوں پر اسکول جاتے آتے ہیں۔ اسکولوں کا عام قانون ان پر بھی اسی طرح چلتا ہے جس طرح قوم کے دوسرے بچوں پر۔

صدر مملکت خصوصیت سے جمعہ کی نماز نوبت بہ نوبت شہر کی مختلف جامع مساجد میں ادا کرتے ہیں۔ ان کے لئے مسجد میں نہ کوئی جگہ مخصوص ہوتی ہے اور نہ پولیس کے ذریعے کوئی انتظام کیا جاتا ہے جہاں جگہ ملتی ہے آکر بیٹھ جاتے ہیں اور نماز ادا کر کے چلے جاتے ہیں۔ پنج وقتہ نمازوں کی بھی پابندی کرتے ہیں۔

مصر کی عمومی مذہبی حالت...... اس ملک میں ہر شہر کی مسجدیں عمومی طور پر نہایت شاندار اور کافی آباد ہیں۔ قاہرہ، طنطا، اسکندریہ اور غزہ وغیرہ شہروں کی مسجدیں دیکھنے کی نوبت آئی، مساجد کے نقشے نہایت پرشوکت اور تعمیریں معیاری ہیں، ساتھ ہی ان مساجد میں صف بوریہ کے بجائے بیش قیمت قالینوں کا فرش ہے۔ ائمہ و موذنین حکومت کی طرف سے تنخواہ دار مقرر ہوتے ہیں۔ نمازوں کے وقت مسجدیں معمور ہوتی ہیں اور ہر وقت کی نماز میں نمازی جوق در جوق آتے ہیں اور مساجد بھری رہتی ہیں۔ اکثر و بیشتر دیکھنے میں آیا کہ مغرب کی نماز کے بعد ائمہ مساجد آدھ پون گھنٹہ وعظ بھی کہتے ہیں۔

مصری قوم میں ملنساری اور محبت کا مضمون کافی ہے، جب تک زبان وغیرہ کی اجنبیت رہتی ہے، بیگانگی سی محسوس ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جب یہ پردہ اٹھ جاتا ہے اور ضمائر سامنے آتے ہیں اور زبان کی اجنبیت باقی نہیں رہتی تو یہ مصری مصری کی طرح گھل مل جاتے ہیں۔

اکرام ضیف...... اکرام ضیف تو بہر حال مسلم قوم کا مزاج ہی ہے۔ جس میں عرب امتیازی شان رکھتے ہیں مصریوں میں بھی عام عربوں کی طرح یہ خو طبیعت ثانیہ ہے۔ اعضاء مؤتمر کی مدارات و ضیافت میں بھی مصر نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ وزراء، امراء اور انجمنوں کی طرف سے دعوتیں عموماً ہوٹلوں میں دی جاتی تھیں۔ اندازہ یہ ہوا کہ دعوتوں کے سلسلے میں ہوٹلوں کا انتخاب اور ترتیب خاص سلیقہ سے کیا گیا تھا۔ ہر اگلے دن کا ہوٹل پچھلے ہوٹل سے زیادہ عظیم اور عالی شان ہوتا تھا، ہر پہلا ہوٹل دیکھ کر خیال گزرتا تھا کہ اس سے بہتر ہوٹل دوسرا نہ ہوگا۔ لیکن اگلے دن کا دوسرا ہوٹل نگاہوں میں پہلے کو گرد بنا دیتا تھا۔ شخصی طور پر بھی متعدد علماء و فضلاء کے لئے دعوتیں ہوئیں مگر سلیقہ مندی ہر حرکت سے محسوس ہوتی تھی۔ کاموں میں مستعدی اور ادائے فرائض میں پختگی نمایاں نظر آتی تھی۔ قوم کا علمی شعور عام طور پر بیدار ہے۔

مصر کا سرکاری مذہب...... سیاسی سوجھ بوجھ انفرادی حد تک نہیں بلکہ اجتماعی اور قومی ہے، قومی الیکشن کے سلسلہ میں جن امور کی خاص طور پر مؤتمر کے اجلاس میں مندوبین کو بشارت دی گئی وہ یہ ہے کہ دستور مملکت میں مستقل دفعہ رکھدی گئی ہے کہ حکومت کا مذہب اسلام ہے، اور سرکاری زبان عربی ہوگی۔

اشتراکیت کا پروپیگنڈہ...... یہ ایک غلط پروپیگنڈہ ہے کہ مصر میں اشتراکیت قبول کرلی گئی ہے اور وہ کمیونزم کے حامی ہیں۔ اول تو اسلام کے ساتھ جس کو سرکاری مذہب تسلیم کیا گیا ہے یہ اصطلاحی کمیونزم جمع ہی نہیں ہوسکتا۔ دوسرے لفظِ اشتراکیت سے ان تمام باتوں کا تصور جو کمیونزم کی بنیادیں ہیں، ضروری نہیں ہے۔ اسلام میں بھی ایک گونہ اشتراکیت ملحوظ رکھی گئی ہے اور بہت سی چیزیں فرد کی بجائے پوری قوم کا حق تسلیم کی گئی ہیں۔ جن پر لفظ اشتراکیت کا اطلاق تو ہوگا لیکن کمیونزم کا نہیں ہوگا۔ اس لئے ایسی اشتراکیت وعمومیت جو اسلام کی حدود میں ہے، کمیونزم نہیں کہلائی جاسکتی بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کمیونزم میں اگر کوئی اچھی اور خوبی کی بات کی گئی ہے تو وہ اسلام ہی کے اصول سے لی گئی ہے۔ خرابیاں ہیں تو وہ لینے والوں کی ناقص فکر اور جذباتی رو کا نتیجہ ہیں۔ مصر نے بھی اگر شخصی ملک کی افراط کو روک کر ایسی ملکیتوں کو نیشنلائز کردیا ہے تو اسے کمیونزم نہیں کہا جائے گا۔

قاہرہ میں میرے کانوں میں پڑا کہ قاہرہ کا ایک چوتھائی حصہ جسے مصرِ جدید کہتے ہیں اور تقریباً دس لاکھ کی آبادی کا حصہ ہے، وہ کم وبیش صرف ایک البانی عورت کی ملکیت تھا جسے جمال عبدالناصر نے نیشنلائز کردیا تو کون اس اقدام کو غلط کہہ کر اس پر کمیونزم کا طعنہ دے سکتا ہے۔

بہرحال شخصی املاک کی افراط کو جو اعتدال سے ہٹی ہوئی ہوں اور ان کا بڑا اثر قوم کی اجتماعی ملک پر پڑ رہا ہو، ختم کر کے حدودِ اعتدال میں لے آنا قابلِ ملامت نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اسے کمیونزم کے طعنہ سے ناقابلِ ستائش کہا جاسکتا ہے۔ بہرحال مؤتمر میں بشارت کے نام سے یہ اعلان کیا گیا کہ حکومت کا مذہب اسلام ہے نہ کہ کوئی غیر اسلامی ازم۔

مصری قوم کی قرآنِ کریم سے والہانہ محبت...... یہ بھی اعلان کیا گیا کہ ایک مستقل ریڈیو اسٹیشن صرف قرآنِ کریم کی تلاوت کے لئے منظور کیا گیا ہے جس میں روزانہ بارہ گھنٹے تلاوتِ قرآن ہوا کرے گی اور بعد میں قرآنی مطالب کی تفہیم کا بندوبست بھی کیا جائے گا۔ چناں چہ یہ اسٹیشن ہم لوگوں کی موجودگی میں کھولا جاچکا تھا، قاری محمد خسری نے جو مصر کے مشہور مجود (تجوید کے ماہر قاری) ہیں یہ تلاوت شروع بھی کردی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآنِ کریم کے ساتھ مصری قوم کو صرف لگاؤ ہی نہیں بلکہ عشق اور شغف ہے۔ پڑھتے بھی لطف سے ہیں اور سنتے بھی لطف سے ہیں۔ جمعہ کے دن ہر جامع مسجد میں لازمی معمول ہے کہ خطبہ کی اذان سے قبل ایک گھنٹہ ایک مشہور مجود جو اس مسجد کے لئے معین طریقہ پر مقرر ہے قرأت کرتا ہے۔ وہی خطبہ کی اذان بھی دیتا ہے اور وہی امام کے ساتھ نماز کی تکبیرات بھی پکارتا ہے۔ چنانچہ جامعہ ازہر کی جامع مسجد میں شیخ مصطفیٰ اسمٰعیل، جامعہ شافعیہ میں شیخ عبدالباسط عبدالصمد اور جامعہ زینت میں دوسرے ایک مشہور مجود اس عمل کے پابند ہیں۔ اسی طرح اور تمام جوامع کا یہی دستور ہے۔ سماعِ قرآن کے لئے ڈیڑھ گھنٹہ قبل مسجدیں بھر جاتی ہیں۔ قرآنِ کریم سے یہ عمومی شغف کسی دوسرے عربی ملک میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ حتی کہ ایک سپاہی جو سڑک کے چوراہے پر پہرہ دے رہا ہے اسے بھی ذرا فرصت ملتی ہے تو گلے میں سے ٹرانسسٹر نکال کر قرأت سننے میں مصروف ہوجاتا ہے۔

جامعہ ازہر میں ہر مدرّس کے انتخاب میں حافظِ قرآن ہونے کی شرط رکھی گئی ہے۔ دارالقرآن کا سنگِ بنیاد ہی مستقلاً حفظ کے لیے رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حفاظ کی جو کثرت مصر میں دیکھنے میں آئی ہے وہ دوسرے عربی ممالک میں دیکھنے میں نہیں آئی۔

حفاظتِ قرآنِ کریم کے لئے مصری حکومت کا سنہری کارنامہ...... پھر نہ صرف تلاوتِ قرآن بلکہ حفاظتِ قرآن کے ساتھ بھی قوم میں ولولہ اور جوش پایا جاتا ہے۔ یہود بے بہبود نے اپنی روایتی تلبیس کاری اور عیاری سے افریقہ میں جو مصریوں کی تبلیغ کا سب سے بڑا مرکز ہے، ایک قرآن شریف تحریف کر کے طبع کرایا اور پھیلا دیا جس میں سے کئی سورتیں خارج کر دیں۔ کتنی ہی آیتیں بدل دیں اور کتنے ہی مضحکہ خیز جملے اپنی طرف سے بڑھا دیئے تا کہ افریقہ میں اسلام کی پھیلتی ہوئی رو رک جائے اور جو مسلمان ہوں وہ غلط اور مخالفِ اسلام عقائد و اعمال کے حامل و داعی ہوں تا کہ اسلام کی تعلیمات کو سن کر تو میں ہنسیں اور اسلام کم از کم افریقہ میں غیر مقبول ہو جائے۔

یہ شرارت مصری حکومت کے علم میں آئی تو اس نے اسی دم لاکھوں پونڈ کا بجٹ منظور کر کے صحیح قرآن کریم چھپوایا اور اس کے سرورق پر یہود کی شرارت کی اطلاع دیتے ہوئے مسلمانوں کو بیدار کیا اور نہ صرف یہی بلکہ افریقہ بھر میں اپنے آدمیوں کو بھیج کر مسلمانوں کے گھروں سے وہ غلط قرآن نکلوائے اور انہیں دریابُرد کر کے یہ صحیح طبع شدہ قرآن گھر گھر مفت پہنچا دیا۔ جس سے عظیم فتنہ ختم ہوا اور قرآن کے بارے میں موعودہ حفاظتِ خداوندی عمل کر نمایاں ہو گئی۔

مصری حکومت کا یہ کارنامہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے بلکہ ایک مسلم ملک کے اقدامات میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

میرا یقین ہے کہ مصر اور مصری قوم کو اس قرآنی شغف ہی نے تیرا رکھا ہے، جس سے یہ قوم اپنی بعض بنیادی کمزوریوں کے باوجود تھمی ہوئی ہے اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔

بہر حال مؤتمر کے اجلاس میں بطور بشارت یہ سنایا گیا کہ حکومت کا مذہب قرآن ہے، حکومت کی زبان لسانِ قرآن ہے، حکومت کا نصب العین اشاعتِ قرآن ہے اور اس کا منصوبہ حفاظتِ قرآن ہے۔ جس سے دنیا کے ممالک کے یہ مندوب علماء متاثر ہوئے اور ان کی ہمدردیاں پہلے سے زائد مصر کے ساتھ قائم ہو گئیں۔

مغربیت سے مرعوبیت...... مگر اس کے ساتھ ہی جو چیز ہم لوگوں کے لئے ان ساری مَسرّتوں کے ہجوم میں کوفت اور سوہانِ روح کا سبب بنی وہ مصری قوم کا مغربی تمدن میں ڈوب جانا اور غرق ہو جانا ہے، جب تک ان کے ضمائر اور مافی الضمیر کا اندازہ نہ ہو، ظاہر طور پر قاہرہ و پیرس اور لندن کی معاشرت میں کوئی فرق محسوس کرنا مشکل ہے۔ جہاں مساجد نمازوں سے بھری ہوئی نظر آئیں گی۔ وہاں سو میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر کسی کا چہرہ مہرہ شرعی دکھائی نہ دے گا۔ نمازیں بھی پڑھیں گے تو اکثر و بیشتر ننگے سر، آدابِ شرعیہ کی عملی رعایت تقریباً مفقود ہے۔

اکثریت کے ساتھ شہروں میں عورتیں نہ صرف بے حجاب ہی ہیں بلکہ بے ستر بھی ہیں۔ ہوٹلوں میں کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط یا شرعی انداز میں تجسس و تحقیق کا کوئی دستور نہیں ہے۔ عورت مرد کا اختلاط عام ہے، جلسوں بازاروں اور دفتروں حتیٰ کہ مذہبی رنگ کے جلسوں میں بھی عورتیں کھلم کھلا شریک ہوتی ہیں۔

جامع ازہر کی تاسیس کے عظیم اجتماع میں عورتوں کا مستقل حلقہ تھا۔ جس میں وہ کھلے منہ شریک ہوئیں اور تقریباً ہر منظر عام پر عورتیں پوری آرائش کے ساتھ ملی جلی دکھائی دیں گی۔

اغیار کا تمدن گو بظاہر توسُّع کی حد تک اختیار کیا جاتا ہے مگر اس کا قدرتی اثر فکر و نظر پر آنا لازمی ہے، اسی لئے شریعت نے اصولی طور پر کسی غیر مسلم تمدن میں ڈھل جانے سے یا غرق ہو جانے سے روکا ہے۔

تمدن کے اس طبعی اثر سے مصر بھی مستثنیٰ نہیں رہ سکتا تھا۔ اندازہ یہی ہوا کہ مغربی تمدن کی یہ باتیں کی ہی نہیں جاتیں بلکہ جائز بھی سمجھی جاتی ہیں۔ اس بارے میں تاویلات کا دروازہ تفسیرات سے زیادہ کھلا ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ اجتہاد اور جدید فقہ کی تدوین کی ضرورت اسی لئے محسوس کی جارہی ہے۔ کیوں کہ قدیم فقہ یقیناً بہت کی جدید جزئیات پر قید و بند عائد کرتا ہے توسعات میں اعتدال قائم کرتا ہے جو قوم پر بھاری ہوتا ہے، اس لئے اس کا علاج ترمیمات ہی ہو سکتی ہیں جن کا عنوان تقاضائے وقت رکھا گیا ہے۔ اس میں فکری غلطی یہ ہے کہ اسلامی معاشرت اور اقتدار میں تضاد باور کر لیا گیا ہے حالاں کہ یہ واقعات اور تاریخ کی رو سے غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ صاف بات مغربیت سے مرعوبیت کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں۔

ممکن الزّوال خرابیاں...... ان فکری اور عملی بے راہ رویوں کی ذمہ داری حکومت سے زیادہ علماء پر عائد ہوتی ہے۔ یہ توسعات درحقیقت فکری آزادی سے چلتے ہیں:

چو نیم بیضہ کہ سلطان ستم روا دارد زنند لشکریانش ہزار مرغ بہ سیخ

کا معاملہ سامنے آیا ہوا ہے، اس لئے جائزات کی تلاش بلکہ جائزات سازی کی کثرت ہے اور عوام کی حد تک کوئی ممنوع و مکروہ ناجائز کی حدود میں نظر نہیں آتا۔

گو اس میں امید کی کرن یہ ضرور نظر آتی ہے کہ اوپر کی ذکر کردہ خوبیاں اصلی ہیں اور یہ خرابیاں یورپ اور یورپیوں سے ہمہ وقتی قرب اور غلط ماحول کا نتیجہ اور اس کا رسوخ تنبیہ و اصلاح کی کوتاہی کا ثمرہ ہے۔ سمجھانے پر قلوب متاثر بھی ہو جاتے ہیں اور رفتار کے بدل جانے کی بھی توقع کی جا سکتی ہے۔ ہم لوگوں نے اپنے مقالات و خطابات میں ان امور پر شائستہ انداز میں نکیر و ملامت کی۔ جس پر کسی بیزاری نظر نہیں آئی، بجائے ہمیں شرمساری محسوس ہوئی۔ اس لئے اصلاح اور مصلح کے لیے یقیناً گنجائشیں ہیں۔ مگر مصلح کی کامیابی صرف صحیح عمل کی نشاندہی سے نہیں ہو سکتی جب تک کہ استدلالی قوت سے صحیح فکر کی نشاندہی نہ کی جائے اور ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر کوئی علمی رنگ کا اقدام نہ کیا جائے اور وہ بھی مسلسل جب تک کچھ اہل دل خواص ان کے پیچھے نہ لگ لیں اور استدلال و

نظر کے ساتھ اپنے عمل وتقویٰ کا نمونہ ان کے سامنے سند رکھتے رہیں، اصلاح وتعدیل مشکل ہے۔

بہر حال جیسے دنیا کی ہر قوم میں کچھ خوبیاں ہوتی ہیں اور کچھ خرابیاں، اسی طرح مصری قوم میں بھی کچھ خوبیاں ہیں جو کافی حد تک ہیں اور کچھ خرابیاں ہیں مگر ممکن الزوال مؤتمر کے عالمی رابطہ کو اس میں استعمال کیا جائے۔

بین الاسلامی رابطے کی عملی دعوت..... حضرت محترم نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ: بہر حال میں نے مصر پہنچ کر اور ایک دفعہ نہیں تین دفعہ سفر کر کے جو کچھ اندازہ لگایا، میں سمجھتا ہوں کہ خوبیوں اور خرابیوں کا یہ اختلاط تو ایک مشترک سی بات ہے جو دنیا کی ہر قوم میں پایا جاتا ہے۔ پھر مغربی تمدن کا یہ غلبہ کچھ مصر ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، اس غلبہ سے تقریباً ہر مسلم ملک اور خصوصیت سے ہر عربی ملک متاثر ومغلوب ہو چکا ہے، کہیں پس پردہ اور کہیں بے پردہ۔ لیکن پھر بھی مصریوں کا عمومی شعور جو ہاں کی عمومی اور مفت تعلیم کا ثمرہ ہے اور اسی کے ساتھ ان کی عمومی صحت مندی اور تندرستی جو وہاں کی قدرتی آب وہوا کا نتیجہ ہے، دونوں کی مضبوطی نے انہیں استحکام اور قیادت کے راستے پر ڈال دیا ہے اور وہ ﴿زَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾ کے مصداق ہو کر (اَحَقُّ بِالْمُلْکِ) کے حق دار بن گئے ہیں، اگر وہ اسی طرح آگے بڑھتے رہے جس طرح بڑھ رہے ہیں تو ان کا اثر ورسوخ ہر اسلامی ملک میں عام سے عام تر ہوتا چلا جائے گا اور بالخصوص مڈیسٹ کے ممالک کو ان کی اتحادی ہوئی وحدت سے علیحدہ رہنے کا کوئی جائز عذر باقی نہیں رہے گا۔

ان حالات میں قاہرہ میں اس عالمی مؤتمر کا اس شان سے انعقاد اور بین الاسلامی رابطہ کی یہ عملی دعوت بلا شبہ ان کے حسن تدبر کی قابل ستائش مثال ہے۔

حضرت ممدوح نے اس تقریر میں مصر کے احوال ومشاہدات پر تفصیل روشنی ڈالی، اس بارے میں چونکہ حضرت موصوف کے مشاہدات مصر وحجاز سے آتے ہوئے خطوط میں شائع بھی ہو چکے ہیں: اس لئے مشاہدات کے بجائے اس تحریر میں تاثرات اور مقامات کو جمع کرنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ جن میں بنیادی چیز آپ کا وہ مقالہ ہے جو آپ نے مؤتمر میں پڑھ کر سنایا۔

اس تقریر میں آپ نے اپنے اس مقالہ کے بنیادی نکات کی ضروری حد تک نشاندہی اور مزید تفصیل فرما دی مگر پھر بھی مقالہ میں جو تعمیری تجویزیں اور ضروری نکات مؤتمر کے سامنے رکھے گئے تھے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انہیں حضرت ممدوح ہی کے اصل عربی الفاظ میں مع ترجمہ کے پیش کر دیا جائے تاکہ اس متن کے ساتھ زبانی بیان کردہ حالات ومشاہدات اس کی شرح کی حیثیت سے سامنے آجائیں۔

اس عربی بیان کا سلیس ترجمہ ہمارے دار العلوم کے صفِ عربی کے استاذ مولانا وحید الزمان صاحب نے کیا ہے جس میں اصل مقالہ کی روح کو پوری طرح باقی رکھا گیا ہے۔ (مقالہ رسالہ دار العلوم کے اسی شمارے میں شامل ہے)

اس سلسلہ میں فلسطین اور غزہ کے سفر میں آپ نے تقسیم فلسطین کے خلاف بھی اپنی رائے بذیل تحریر منضبط

فرمائی تھی۔ لیکن جبکہ فلسطین سے متعلق تجویز کے سلسلے میں وہ سب امور موجود تھے جو اس مقالہ میں درج کئے گئے تھے اور اس تجویز پر حضرت ممدوح کے دستخط بھی ہوئے، اس لئے مقالہ پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔ تاہم اس بارے میں حضرت موصوف کا زاویۂ نگاہ واضح کرنے کے لئے یہ مقالہ بھی مع ترجمہ کے ہدیۂ ناظرین کیا جارہا ہے۔ (جسے خطبات کے صفحہ ۷۷ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔)

سفرِ حجاز...... یکم اپریل ۶۴ء کو حضرت موصوف قاہرہ سے بقصدِ حج بیت اللہ حجازِ مقدس روانہ ہوئے اور اسی تاریخ میں براہ جدہ ہوائی جہاز سے اولاً مدینہ طیبہ پہنچے اور وہاں چودہ دن قیام کر کے ۱۶ اپریل کو مکہ مکرمہ پہنچے اور ۲۱/ اپریل کو ادائیگی حج کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ اس تقریر میں آپ نے مدینۂ طیبہ اور مکۂ مکرمہ کے اجتماعات کا بھی ذکر فرمایا جن کا اجمالی خلاصہ علمی دنیا کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

آپ نے فرمایا کہ: مدینۂ منورہ کے قیام کے دوران اس دفعہ خصوصیت سے جامعہ اسلامیہ مدینۂ منورہ کے متعدد اساتذہ ملاقات کے لئے قیام گاہ پر تشریف لائے اور وسعتِ اخلاق کے ساتھ ملے۔

دوسرے روز مدینہ یونیورسٹی کے رجسٹرار الاستاذ الشیخ عبود بھی قیام گاہ پر تشریف لائے اور بغایت کرم وعنایت پیش آئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ ان سے مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں انہوں نے یونیورسٹی کی طرف سے دعوت پیش کی اور فرمایا کہ ہم چاہتے ہیں کہ خیر مقدم کے طور یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ جمع ہوں اور آپ کچھ خطاب بھی کریں، حضرت ممدوح نے یہ کہہ کر کہ میں تو خود ہی جامعہ میں حاضر ہونے کا ارادہ رکھتا تھا، اس دعوت کو بصد شکریہ قبول فرمالیا۔

مقررہ وقت پر کاریں آگئیں اور آپ اپنے رفقاءِ سفر خصوصیت سے حضرت مولانا منت اللہ صاحب رحمانی امیر شریعت صوبہ بہار، صاحبزادہ محترم مولانا محمد سالم صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند اور مولانا عبدالحق صاحب پیش کار اہتمام دارالعلوم کو ساتھ لے کر یونیورسٹی روانہ ہوگئے۔ یونیورسٹی کے وسیع صحن اور چمن میں الاستاذ عبود اور دوسرے حضرات نے خوش آمدید کہا اور یونیورسٹی کے نائب الرئیس الشیخ بن باز کے دفتر میں پہنچایا جو ایک متبحر عالم اور قادر الکلام خطیب ہیں۔

شیخ بکمال شفقت وعنایت پیش آئے۔ دارالعلوم دیوبند کا تذکرہ چھڑا، حضرت مہتمم صاحب حالات بیان کرتے رہے جس سے شیخ متاثر ہوئے۔ شیخ بن باز نے متعدد قیمتی کتابوں کے ہدایا حضرت ممدوح اور ان کے تمام رفقاء کو عنایت فرمائے۔

پھر شیخ عبود نے یونیورسٹی کا معائنہ کرایا اور آخر میں یونیورسٹی ہال میں لے گئے جہاں تمام طلبہ، اساتذہ اور الشیخ بن باز پہلے پہنچ چکے تھے، اولاً شیخ بن باز نے تقریباً نصف گھنٹہ تقریر فرمائی اور فرمایا کہ: میرا ارادہ تھا کہ میں اس خطاب میں مناسکِ حج پر روشنی ڈالوں۔ لیکن اس وقت ہمارے لئے یہ خوشی کا مقام ہے کہ رئیس دارالعلوم دیوبند ہم میں موجود ہیں۔ ہم بہ صد طوع ورغبت، ان کے افکار وخیالات سننے کے آرزومند ہیں۔ اس تقریر کے بعد صدرِ جلسہ نے حضرت مہتمم صاحب کا تعارف کرایا اور تقریر کے لیے ایماء کیا۔

مدینہ یونیورسٹی میں خطاب...... حضرت ممدوح نے اسٹیج پر اپنا مقالہ پڑھا جس میں شکریہ ارباب جامعہ کے بعد دیوبند کے حالات، تعلیمات، مسلک اور دینی رُخ وغیرہ پر روشنی ڈالی اور آخر میں جامعہ مدینہ منورہ کے بارے میں ستائش کے وہ کلمات فرمائے جو اس مقدس یونیورسٹی کی شایانِ شان تھے۔

دارالعلوم کے حالات، معاملات اور مسلک کی تفاصیل کے جملوں پر اکثر اسٹیج اور طلبہ کی طرف سے ماشاءاللہ اور الحمدللہ کے کلمات بلند ہوتے رہے۔ یہ مقالہ بھی دارالعلوم کے اسی شمارہ میں شامل کیا جارہا ہے (جسے صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے)

بے اصل بات...... اس مقالہ کے اختتام پر صدرِ جلسہ حضرت ممدوح کے شکریہ اور کلماتِ خطاب کی تحسین کے لئے اٹھے مگر خطاب شروع کرنے سے پیشتر اسٹیج پر اتر کر حضرت مہتمم صاحب کی کرسی کے پاس آئے جو شیخ بن باز کے پاس بچھی ہوئی تھی، اور جھک کر اپنی ایک نجی یادداشت کو سامنے رکھ کر استفساری لہجہ میں فرمایا: "کیا یہ واقعہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں اہلِ حدیث طلبہ کا داخلہ ممنوع ہے اور کوئی داخل ہوتا ہے تو اسے خارج کردیا جاتا ہے چنانچہ ایک سال اس کا کھلا مظاہرہ بھی ہوا کہ آٹھ دس طلبۂ اہلِ حدیث دارالعلوم سے خارج کردیئے گئے۔ یہاں یہ پروپیگنڈہ عام ہے، کیا اس کی کوئی اصلیت ہے"؟ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم نے فرمایا: "یہ بے اصل بات ہے جو جناب کے کانوں میں ڈالی گئی ہے، مسلک کے اختلاف کی بناء پر نہ کبھی اہلِ حدیث طلبہ کا داخلہ دارالعلوم میں روکا گیا ہے اور نہ کسی مسلک کے اختلاف کی وجہ سے ان کا اخراج عمل میں آیا۔

جس واقعہ کی طرف جناب اشارہ فرمارہے ہیں اس کی اصلیت یہ ہے کہ اہلِ حدیث اور حنفی طلبہ میں مسلکی تنازعہ ہوا۔ نوبت ایک دوسرے کے بزرگوں کے حق میں سخت کلامی بلکہ بدکلامی کی آئی اور اس نزاع کا اثر دارالعلوم کے عام ڈسپلن پر پڑنے لگا۔ اندیشہ تھا کہ یہ معاملہ عام ہنگامہ کی صورت اختیار کرلے۔ تو نظم (ڈسپلن) برقرار رکھنے کے لئے ان جھگڑالو طلبہ کو جھگڑے کی بناء پر خارج کیا گیا، جن میں اہلِ حدیث بھی تھے اور حنفی بھی۔ اگر مسلک کے تفاوت کی بناء پر یہ اخراج ہوتا تو حنفی کیوں خارج کئے جاتے اور اگر مسلک اختلاف کی بناء پر اہلِ حدیث خارج کئے جاتے تو انہیں داخل ہی کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ پھر خارج کرنے کا بار سر لیا جاتا۔ اور اگر یہ سب کچھ مسلک کے اختلاف کی بناء پر ہوتا تو جو اہلِ حدیث اس نزاع میں شریک نہیں تھے، انہیں بدستور دارالعلوم میں کیوں داخل رکھا جاتا؟ اس لئے یہ واقعہ سرتاپا غلط ہے کہ ان طلبہ کے اخراج کی وجہ تفاوتِ مسلک ہے"۔ اس سے صدرِ جلسہ بہت مطمئن ہوئے اور انہوں نے اسٹیج پر پہنچ کر اولاً حضرت مہتمم صاحب کے مقالہ کے بارے میں بھرپور تحسین کے کلمات فرمائے، پھر دارالعلوم کی عظمت کا اعتراف کیا اور آخر میں اس واقعہ کا ذکر کرکے فرمایا کہ:

"دارالعلوم دیوبند کے بارے میں جو یہ شہرت دی گئی اور بارہا کان میں پڑا کہ وہاں اہلِ حدیث کا داخلہ ممنوع ہے یا وہ اس بناپر خارج کئے جاتے ہیں، غلط ہے ہم نے اسی وقت رئیس دارالعلوم سے اس کی تحقیق کی تو

شہرت بے اصل ثابت ہوئی۔ ایسی افواہوں کا پھیلانا نامناسب ہے"۔

حضرت مہتمم صاحب نے جب یہ تفصیل اپنے اس خطاب میں ارشاد فرمائی تو مجمع میں اس سے خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور افسوس اس کا ہوا کہ لوگ غیر ممالک اور بالخصوص حجاز مقدس پہنچ کر بھی اس قسم کے غلط پروپیگنڈوں سے احتراز نہیں کرتے۔

لیکن حق تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا فضل ہے کہ اس نے ان غلط شہرتوں اور تشہیروں کا پردہ خود ذمہ دار دارالعلوم کی زبانی، ذمہ داران مدینہ یونیورسٹی کے مواجہہ میں، خود مدینہ کی فضاء میں چاک کر دیا اور اصل حقیقت کھل گئی۔ حضرت ممدوح کا وہ جامع مقالہ جو مدینہ یونیورسٹی میں پڑھا گیا، وہ بھی اسی شمارے میں پیش کیا جارہا ہے۔

اَلرَّابِطَۃُ الْاِسْلَامِیَۃُ کے اجلاس میں شرکت...... پھر آپ نے مکہ مکرمہ کے اس بین الاقوامی اجتماع کا ذکر فرمایا جو قصر الملک میں الرابطۃ الاسلامیہ کی طرف سے منعقد کیا گیا کہ اس میں شرکت کی گئی اور رابطہ کے ذمہ داروں کے مقالات اور خطابات سنے گئے۔ جن میں خصوصیت سے قابل ذکر خطاب السید امین الحسینی مفتی فلسطین اور الاستاذ سعید رمضان کا ہے۔ نیز خصوصیت سے قابل ذکر عراق کے ایک بلیغ شاعر کا تاریخی قصیدہ ہے جس میں انہوں نے وقت کے حالات سنا کر عالم عرب کو بیداری کا پیغام دیا جس سے پورا مجمع متاثر ہوا۔

اجتماع کے بعد جدہ الرابطہ کے سیکریٹری صاحب سے ایک دعوت میں جو سید شہاب الدین صاحب فرسٹ سیکریٹری سفارتخانہ ہند کی طرف سے دی گئی تھی، ملاقات ہوئی۔ جس میں انہوں نے " الرابطہ " کے اغراض و مقاصد کے ضروری کاغذات اور اس کا دستور نامہ ایک ریشمی رومال میں رکھ کر عنایت فرمایا۔

دارالعلوم کا بین الاقوامی تعارف..... بہر حال مجموعی حیثیت سے حضرت ممدوح کا یہ سفر شاندار اور کامیاب رہا اور اس مبارک سفر میں بین الاقوامی طور پر جو اہم کردار آپ نے ادا کیا وہ دارالعلوم دیوبند کا بین الاقوامی تعارف تھا۔ جو مڈ ایسٹ اور یورپین ممالک کے سربرآوردہ زعماء اور علماء کو کرایا گیا۔ آپ کے ساتھ دارالعلوم کی عمارتوں کے البم کے نسخے بھی تھے جو ممتاز اور مشاہیر کی خدمت میں پیش کئے گئے۔

صومالی لینڈ، کینیڈا اور دوسرے ممالک کے ممتاز اکابر اس البم سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے جس سے بہت سے خطوں میں دارالعلوم جانا پہچانا ہو گیا۔

دارالحدیث دیوبند کے اس جلسہ میں طلباء اور شہر کے لوگوں نے حضرت ممدوح کے ان اقدامات پر نظم و نثر میں مبارک باد دی۔ اس لئے یہ جلسہ حج کی مبارک باد سے زیادہ غیر ممالک کے ان قلوب کو ہموار کرنے کی حج اکبری مبارک باد پر مشتمل تھا جو اس سفر میں دارالعلوم کے لئے ہموار ہوئے۔ جلسہ خیر و خوبی کے ساتھ تقریباً شب کے ڈیڑھ بجے ختم ہوا۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِہٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ.

مذہب اور سیاست

قرآن اوّل کی اصلاحی اسکیم کے یہی تین بنیادی اصول علمِ نافع (حکمت نظری) خلقِ عادل (حکمتِ اخلاق) اسوۂ حسنہ (حکمتِ عملی) تھے۔ جنہوں نے قوم کے ظلم وجہل اور بد نظمی کو یکسر فنا کر کے دنیا میں ایک نئے حکیمانہ نظام کی بنیاد ڈالی۔ علم سے انہوں نے دماغوں کو روشن کیا، اخلاق سے قلوب کو جگمگایا اور اسوۂ حسنہ کی پیروی سے اپنے جو ارح کو شائستہ بنایا اور ان تینوں روشن ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جب وہ عالم میں نکلے تو دنیا نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان طاقتوں کے ذریعے سے خدا نے اپنے قرآنی وعدے کے مطابق ان کی خلافتِ ارضی کی جڑیں زمین میں جمادیں۔ بلاد فتح ہوئے۔ عباد (اللہ کے بندوں) کی گردنیں جھک گئیں اور صلاح ورشد، امن وسکون کا دنیا میں دور دورہ ہو گیا۔ (از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ)

پیش لفظ..... پیش نظر خطبۂ صدارت حضرت فخر الامت، امیر البیان حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بحیثیت صدر اجلاس جمعیت علماء صوبہ سندھ ۱۵/۱۶/۱۷ اپریل ۱۹۴۴ء کو سندھ کے تاریخی شہر حیدر آباد میں ارشاد فرمایا تھا۔ اس اجلاس میں صوبہ کے مستند اور بلند پایہ علماء بہت بڑی تعداد میں تشریف فرما تھے، ان کے علاوہ مجلسِ احرار مسلم لیگ اور جماعت خاکسار کے ارکان بھی موجود تھے۔ عام شرکاء میں ہر طبقہ، خیال کے افراد حاضر تھے مگر خطبہ کے گرانمایہ علمی، عرفانی، اصلاحی اور سیاسی مطالب سے سب کے سب یکساں طور پر متاثر تھے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ خطبہ پڑھنے کے بعد اس درجہ متاثر ہوئے کہ انہوں نے کھڑے ہو کر اعلان فرمایا: ''میں خطبۂ صدارت سننے ہی کے لئے شریک اجلاس ہوا تھا، اب میرا دل ٹھنڈا ہے۔ آپ نے اپنا خاندانی پیغام پہنچا دیا''۔

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مخلصانہ شکریہ..... بزرگانِ محترم! اللہ کی حمد وسپاس، اللہ کے آخری نبی پر درود وسلام اور آپ سب حضرات کے

کرم فرمایانہ اعزاز پر جو صدارت کی صورت میں نالائق کو بخشا گیا ہے، مخلصانہ شکریہ کے بعد میں چند معروضات بطور یادداشت اس مقدس اجتماع میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اکابرِ قوم اور ملک کے سنجیدہ افراد کو ان کے غور و فکر میں مدد دے سکوں۔

زمانۂ جنگ اور جنگ کی تباہ کاریاں...... حضرات محترم! آج ہم تاریخ کے نازک ترین مرحلہ پر ایک تاریخی صوبہ میں جمع ہوئے۔ دنیا اپنے بنائے ہوئے جال میں الجھ رہی ہے، دنیا کے مدبر اپنی تدبیروں کو رو رہے ہیں۔ معمورۂ ارضی کے وہ حصے جنہوں نے اپنے آسودہ حال ہونے پر شیطان سے خراجِ تحسین وصول کیا تھا، آج اس درجہ تباہ حال ہیں کہ ان پر انسانیت آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ انسانیت اپنے نشانِ مزار پر کھڑی ہوئی رو رہی ہے، اور انسان قیامت سے پہلے قیامت کے ہولناک نمونوں سے گھرا رہے ہیں۔ خدا نے اس دنیا کو اپنے بندوں کے لئے فردوسِ بندگی بنایا تھا، مگر شیطان اور اس کی ذریت نے اسے جنگ و غلامی کا جہنم بنا دیا ہے۔

گزشتہ ایک سو سال میں اسی سیاست نے ایک عالمگیر جہنم تیار کیا تھا، آج اس کے شیدا اس میں جل رہے ہیں۔ امیر، غریب، مرد، عورت، بچے، بوڑھے، سب کراہ رہے ہیں، اور ان کی کراہ مذہب کی چہار دیواری کے اندر صاف سنی جا رہی ہے جو مذہبی رہنماؤں کی روح کو تڑپا رہی ہے۔

مذہب اور سیاست...... وہ لوگ جو اس پریشان حال دنیا کے رہنما بنے ہوئے ہیں اور جنہوں نے مذہب اور سیاست کے مقدمہ میں مذہب کے لئے سزائے موت تجویز کی تھی، آج خدا سے آبِ حیات کا راستہ دریافت کر رہے ہیں اور جو لوگ خداوندِ عالم سے آسمان پر مقابلہ کا ارادہ اور پروگرام رکھتے تھے، زمین پر اس کی حقیر حقیر مخلوق کے مقابلہ میں ہار جیت کا کھیل، کھیل رہے ہیں۔ اس میں کسی ملک، کسی قوم اور کسی نسل کی تخصیص نہیں، بلکہ وہ تمام قومیں شامل ہیں جو خدا کی زمین پر اپنے غرور کا سکہ چلانا چاہتی ہیں۔

عصری سیاست کا قافلہ مذہب سے جدا ہو کر آزادی، مساوات اور جمہوریت کے نعروں کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ آج جب اس کی واپسی عمل میں آ رہی ہے تو اس کے ساتھ کون ہے؟ آزادی کی جگہ غلامی، مساوات کی جگہ سیاسی اونچ نیچ اور جمہوریت کی جگہ جبرِ مطلق۔

جنگ کا آخری فیصلہ...... جنگ ہو رہی ہے، یہ جنگ کا پانچواں سال ہے۔ کوئی بھی حتیٰ کہ چرچل روزویلٹ اور ہٹلر تو جو خود بھی نہیں جانتے کہ یہ جنگ کب ختم ہوگی، جنگ کی تباہ کاریاں صرف میدانِ جنگ تک ہی محدود نہیں ہیں، بلکہ پوری دنیا اس کے شعلوں سے سلگ رہی ہے۔ عباد ہی نہیں بلاد بھی تباہ ہو رہے ہیں، مجھے یاد ہے کہ برطانوی سلطنت کے مدبر اعظم مسٹر بالڈون نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے زمانہ میں کہا تھا کہ: ''اگر جنگ ہوئی تو ہم ہی تباہ نہیں ہوں گے، ہماری سلطنت اور ہمارا تمدن بھی برباد ہو جائے گا۔''

واقعات سامنے رکھ کر دنیا اس قضیۂ شرطیہ کی تصدیق و تکذیب کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ جنگ جاری ہے اور ابھی

جاری رہے گی۔ گوڈیلی میل نے اپنے مقالہ ۱۲ مارچ ۱۹۴۴ء میں لکھا ہے کہ: "جنگ کے اچانک ختم ہو جانے کا امکان زیادہ واضح ہوتا جاتا ہے"۔ اور بلاشبہ یہ الفاظ پوری انسانیت کے دل کی پکار بھی ہیں۔ مگر واقعات ان پیشین گوئیوں اور پکاروں کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ کیوں کہ دنیا کے دوار اب انسانوں کو جن چیزوں کی ضرورت ہے، دنیا کے مدبرین ان کو بہم پہنچانے سے قاصر رہے ہیں۔

آزادی، جمہوریت اور شہنشاہیت...... دنیا کو عالمگیر آزادی کی ضرورت ہے جس کی رو سے کسی کمزور قوم کی آزادی سلب نہ ہو سکے۔ دنیا کو کسی ایک ملک کی پارلیمنٹ کی بجائے عالمگیر پارلیمنٹ کی ضرورت ہے جو جمہوریت عامہ کی ترجمان ہو۔ دنیا کو اپنی ساری پیداوار کسی ایک ملک کی بجائے ساری دنیا کے انسانوں کو پہنچانے کی ضرورت ہے جس سے سب مستحقین درجہ بدرجہ حصہ پاتے رہیں۔ دنیا کو استعمار اور شہنشاہیت کی بجائے بین الاقوامی عدالت اور بین الملکی قانون کی ضرورت ہے جو سب کو ایک رشتہ میں پرو دے۔ اگر متحارب قومیں (لڑنے والی قومیں) ان نکتوں کو تسلیم نہیں کرتیں تو جنگ جاری رہے گی اور اگر آج جنگ ختم بھی ہو گئی تو یہ خاتمہ ایک اس سے بھی بڑی جنگ کا مقدمہ ہوگا۔ ہاں! اگر جنگ کا فیصلہ دنیا کی حکومتیں نہیں خدا کی حکومت کرے گی اور اس کی ہمہ گیر حکومت ان چاروں نکتوں کو انسانیت سے منوا کر رہے گی۔

ہندوستان کی صورت حالی...... ہندوستان کا حال دنیا کے اس عام حال سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، ایک طرف اس ملک کی نہ ختم ہونے والی دردناک غلامی ہے جو اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے ایک صدی سے بہانے تلاش کر رہی ہے، دوسری طرف آزادی کی لہر ہے جس نے یہاں کی قوموں کو اپنے ہمہ گیر حصار میں لے لیا ہے اور پوری دنیا کی طرح وہ بھی ان چاروں نکات کے مطالبہ میں قوموں کی شریک ہے۔ اس سے زیادہ وہ ہنگامہ دلخراش ہے جس نے ہمارے سیاسی تدبر کو غلامی کی قوتوں کے سامنے مفلوج بنا دیا ہے اور سب سے آخر میں انہی نکات کے بارہ میں وہ طوفان مصائب ہے جو علماء کے سروں پر سے گزر رہا ہے۔ ان مرکب مصائب کے آتشیں سایہ میں ہمیں یہاں جمع ہونے کا موقع میسر آیا ہے تاکہ ہم اس ہمہ گیر درد دکھ کا کوئی ہمہ گیر مداوا سوچیں اور اپنی شکستہ کشتی کو ان طوفانی تھپیڑوں سے نکال لے جائیں:

گہے باشد کہ کارِ ناخدائی می کند طوفان   کہ از طغیانِ موجے کشتیم بر ساحل افتاد است

ان مہلک امراض کے کیا اسباب ہیں؟...... میں ایک سیاسی آدمی سے زائد ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنے علم و فہم کے مطابق جہاں تک غور کر سکا ہوں، دنیا میں قوموں کے لئے مہلک ترین امراض جنہوں نے اقوام کو ہمیشہ الٹ پلٹ کیا اور گھن بن کر ان کی فلک بوس عمارتوں کو پیوندِ خاک بنایا ہے، اصولاً کل تین ہیں جن میں سے دو بنیادی ہیں اور ایک ان دو کا قدرتی ثمرہ۔ 1 جہل 2 ظلم 3 اور غلامی۔

جہل...... جہل سے حدود و اشیاء نامعلوم رہ جاتی ہیں۔ اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی، کوئی قانونِ زندگی سامنے نہیں آتا اور انسان اپنے اس امتیازی فرق کو مٹا دیتا ہے جو خدائے حکیم نے اس میں اور جانوروں میں بطور حدِ فاصل کے

قائم فرمایا تھا، ظاہر ہے کہ ایک انسان بہائم میں مل جائے تو انسانی حلقوں میں اس کی کوئی پرسش نہیں ہوسکتی۔

ظلم...... ظلم، عدل کی ضد ہے۔ اس سے میری مراد ظلم اخلاق یعنی اخلاق کا عدل و اعتدال پر قائم نہ ہونا اور جبلی افراط و تفریط ہے، جو ظلمت نفس ہے۔ چونکہ اخلاق ہی اعمال کی قوت ہیں۔ اس لئے ان غیر معتدل اخلاق سے غیر معتدل ہی افعال کا ظہور ہوتا ہے اور ان اخلاقی بے اعتدالیوں سے قومی کریکٹر تباہ ہو جاتا ہے، قوم کی ساکھ اکھڑ جاتی ہے۔ خدا اور بندوں کی نگاہ سے یہ قوم گر جاتی ہے اور بالآخران بداخلاقیوں کے جراثیم سے پھر یہ قوم اس قابل نہیں سمجھی جاتی کہ باعزت اقوام کی صف میں اسے جگہ دی جاسکے۔

غلامی...... غلامی کی تباہ کاریاں فوضویت سے شروع ہوتی ہیں۔ فوضویت سے میری غرض یہ ہے کہ کسی قوم میں نظم نہ ہو، مرکزیت نہ ہو، اس کا کوئی سرگروہ باقی نہ رہے۔ قوم کا ہر فرد مستقل حکمران بن بیٹھے۔ باہمی تعاون وتناصر ختم ہو جائے۔ اس سے اجتماعی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ طوائف الملوکی اور انتشار کی حالت میں جبکہ قوم میں اس جہل و ظلم کی بدولت جان نہیں رہتی تو دوسری طاقت ور اقوام اس پر خروج کر کے مسلط ہو جاتی ہیں اور اس فوضویت کا ثمرہ غلامی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے جو ایک قوم کے لئے دنیا کا بدترین عذاب اور خدا کی طرف سے ایک انتہائی پھٹکار ہے اور پھر اس غلامی سے بالآخر یہ قوم اپنا قومی سرمایہ، کلچر، تہذیب، تمدن اور اپنے علم و عمل کی خصوصیات کھو بیٹھتی ہے اور انجام کار اس قومی اختلال اور طبقاتی انتشار کے جراثیم اس کے قومی وجود کو اس طرح نیست و نابود کر دیتے ہیں کہ بعد چندے دنیا میں کوئی اس کے نقش پا کا پتہ دینے والا بھی باقی نہیں رہتا۔

قرآن حکیم کا فیصلہ...... قرآن حکیم نے یہود کے مہلک ترین امراض کا خلاصہ یہی تین چیزیں قرار دی ہیں، جن میں سے ظلم و جہل کو اصل بتلایا اور غلامی کو ان کی فرع۔

ارشاد ربانی ہے: ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۔ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ.﴾ ①

”جم گئی ان پر ذلت اور پستی اور مستحق ہو گئے وہ غضب الٰہی کے۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکام الٰہیہ سے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو ناحق اور یہ اس وجہ سے کہ ان کے لوگوں نے عصیان کیا اور حدود سے نکل نکل جاتے تھے“۔

ذلت و مسکنت کا فوری کامل یہ تھا کہ ان سے قیامت تک کے لئے سلطنت چھین لی گئی اور مختلف سلاطین کی غلامی کے لئے ان کی زندگیاں مخصوص کر دی گئیں۔ کبھی یونانیوں اور کلدانیوں کے غلام، کبھی بخت نصر کے غلام، کبھی ایرانیوں اور مجوسیوں کے باج گزار، کبھی مسلمانوں کے زیر حکومت اور کبھی نصرانیوں کے۔ کہیں ہٹلر کے رحم و کرم پر اور کبھی امریکنوں کی لفظی ہمدردیوں پر۔

غرض دائمی غلامی ان کا قومی نشان قرار دی گئی۔ پھر جس قوم کے بھی غلام رہے اس نے کبھی ان کی کوئی ایسی بھی توقیر نہیں کی جو کم از کم آدمیت کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ آج جرمنی نے جس تذلیل کے ساتھ انہیں جلا

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۶۱.

وطن کیا ہے، اس کی نظیر ملنا مشکل ہے، ایک ایک کا مال و اسباب ضبط شہروں کے ہوٹلوں اور عام اجتماعات کے مواقع پر بورڈ چسپاں کئے گئے کہ کتا اور یہودی یہاں داخل نہ ہونے پائے۔ برطانیہ نے انہیں پناہ ضرور دی۔ مگر ان کی کسی ادنیٰ توقیر کا وہ بھی روادار نہیں۔ کیوں کہ برطانوی مدبروں کے انداز سے واضح ہے کہ وہ بھی اس قوم کو پرلے درجے کی ذلیل و رسوا قوم جانتے ہیں اور اسے دنیا کا خون چوسنے والی قوم کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

اسی طرح امریکہ کا عمل ممکن ہے کہ ان کے ساتھ ہو مگر کوئی اچھی رائے ان کے ساتھ نہیں۔ پس غلامی کے ساتھ انتہائی ذلت و مسکنت اور رسوائی بھی ان کے لئے قرآن نے مخصوص کر دی ہے۔ اس ذلت آمیز غلامی کا ایک سبب قرآن حکیم نے عصیان بتلایا ہے جو عملی سیہ کاری ہے اور اس کا سبب اعتداء فرمایا گیا۔ جس کی حقیقت حدود سے تجاوز اور تعدی ہے اور یہی وہ ظلم اور اخلاقی بے اعتدالی ہے جس سے تمام ظالمانہ حرکات سرزد ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ حدود سے تجاوز اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ یا حدود کا علم ہی نہ ہو یا ہو تو معاملہ ان کے ساتھ لاعلمی کا کیا جاوے اور یہی وہ جہل ہے جس سے خیر و شر کی تمیز باقی نہیں رہتی۔

پس یہود کی ذلت و مسکنت کی ترتیب اب یوں قائم ہو جاتی ہے کہ ان میں غلامی آئی بداعمالیوں سے اور بداعمالیوں کا منشاء ظلم اخلاق اور جہلِ نفس تھا۔ اس لئے وہ تینوں مہلک امراض جو کسی بڑی سے بڑی قوم کو برباد کرنے کے ضمانت دار ہیں، ظلم اور جہل اور غلامی نکلے اور تینوں کا ایک ہی آیت سے ثبوت بھی ہو گیا۔

دوسرے مواقع پر قرآن حکیم نے ان تینوں امراض کو الگ الگ مستقلاً بھی بیان فرمایا ہے جس سے ان کی اصولی حیثیت واضح ہوتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ انسان کو امانت الٰہیہ کا حامل بتاتے ہوئے اس کی بنیادی شرط ان دو چیزوں، ظلم و جہل کو قرار دیا ہے کہ انہیں کی اصلاح کے لئے اس جذبۂ امانت کی ضرورت پڑی اور انسان اس کے سبب ساری کائنات پر فائق ہو گیا۔

ارشادِ ربانی ہے: ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا﴾ ①

”ہم نے یہ امانت آسمان اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تھی، سو انہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور بڑا جاہل تھا“۔ یعنی اس میں قوتِ علمیہ اور قوتِ عملیہ (اخلاقِ حسنہ) کا فقدان تھا۔ مگر یہ امانت، اس میں علم اشیاء اور عدلِ اخلاق کی استعداد تھی جس سے وہ بڑا عادل اور بڑا عالم بن سکتا تھا۔

ایک جگہ اس طبعی ظلم و جہل کو مٹانے اور اس علمی و عملی استعداد کو بروئے کار لانے پر ہی آخرت کی نعمتوں کو دائر فرمایا۔

ارشادِ ربانی ہے: ﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ ②

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۷۲۔ ② پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۸۳۔

"یہ عالمِ آخرت ہم ان لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا اور نیک ثمرہ متقی لوگوں کو ملتا ہے"۔

ظاہر ہے علو و کبر ثمرۂ جہالت ہے کہ اپنی گندی اصلیت سے آدمی بے خبر ہو اور فساد ضد صلاح ہے اور صلاح و رشد کا فقدان وہی ظلم نفس ہے۔ خواہ علمی ہو خواہ اخلاقی، پس آیت جہل وظلم کو بتلا کر ان دونوں مہلکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ایک جگہ بتلایا گیا ہے کہ اگر انسان کی خلافت میں کوئی چیز رکاوٹ بھی جاسکتی ہے تو وہی اس کا جہل وظلم ہے گویا دوسرے لفظوں میں اگر کوئی چیز اس میں غلامی اور پستی و زیر دستی پیدا کرسکتی ہے تو یہی ظلم و جہالت۔ چنانچہ جب انسان کو خلافت ملنے لگی تو ملائکہ نے اس کی اسی جاہل و ظالم طبیعت کو محسوس کرکے اس کی خلافت کے بارہ میں خلجان ظاہر کیا تھا۔ جس کی حکایت حق تعالیٰ نے یوں فرمائی ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ﴾ ①

"اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ میں ضرور بناؤں گا زمین میں ایک نائب۔ فرشتے کہنے لگے کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگ جو فساد کریں گے اس میں اور خون ریزیاں کریں گے"۔

یہاں بھی وہی فساد کا لفظ بولا گیا ہے جو صلاح کی ضد ہے جس سے کھلا اشارہ ظلم کی طرف ہے اور سفاکی، حقیقت ناشناسی اور جاہلانہ حرکت ہے کہ نہ آدمی اپنی جان کی کوئی قیمت سمجھے نہ دوسرے کی جان کی۔ یہ جہل کی طرف اشارہ ہے۔ پس ہر سعادت سے محرومی کی جڑ، بنیاد یہی دو اصلیں ظلم اور جہل نکل آئیں۔

غلامی کے متعلق قرآنِ مجید کا حکم ...... ادھر قرآن حکیم نے اس تیسرے مرض میں غلامی کو دنیا کا بدترین عذاب شمار فرمایا ہے جو درحقیقت اسی ظلم وجہل کا ثمرہ ہے۔ بنی اسرائیل کی غلامی کے بارہ میں ارشاد ہے:

﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْهِمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ مَنْ یَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ ② ......

"اور وہ وقت یاد کرنا چاہئے کہ جب آپ کے رب نے یہ بات بتلا دی کہ وہ ان یہود پر قیامت تک ایسے لوگوں کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سزائے شدید کی تکلیف پہنچاتے رہیں گے"۔

یہ سزائے شدید اور اغیار کا تسلط وہی محکومی اور غلامی ہے جسے قرآن نے سوء عذاب یعنی بدترین عذاب بتلایا ہے۔ بہرحال ان آیات سے واضح ہوگیا کہ اسلام کی نگاہ میں قوموں کی تباہی و بربادی کے یہ تین ہی اصول ہیں۔ ظلم وجہل اور غلامی اور تاریخ کی دنیا میں ہر تباہ شدہ قوم ان ہی تین مہلکوں سے پچھڑی ہوئی نظر آئے گی۔

عرب اقوام چودہ صدی قبل ...... آج سے چودہ صدی پیشتر عربی اقوام کے قومی جسم میں یہی تین جراثیم تھے تو انہیں دنیا کی نگاہوں سے ایسا گرایا کہ وہ عالم کی کسی متمدن قوم ہی نہیں بلکہ مطلقاً کسی بھی بھلی قوم میں

① پارہ: ۱ سورۃ البقرہ، الآیۃ: ۳۰۔ ② پارہ: ۹ سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۶۷۔

شمار کیے جانے کے قابل نہ رہیں۔ ان کی تو پوچھنا جہالت نے ان میں سے خیر و شر کی تمیز اٹھا دی اچھے برے کا فرق مٹا دیا۔ حدود و اشیاء ان کے قلوب پر مخفی ہو گئیں۔ وہ خالق و مخلوق تک کا فرق بھلا چکے تھے۔ مخلوقاتی صفات خدا میں اور خدائی خصوصیات بندوں میں مان کر انواع و اقسام کے شرکوں میں مبتلا تھے۔ بندوں سے زیادہ خداؤں کا عدد (جمع) ہو گیا تھا۔ کعبۃ اللہ سینکڑوں بتوں کا بت خانہ تھا جو انسانی زندگی کے مالک تصور کیے جاتے تھے، انہی سے مرادیں مانگی جاتی تھیں، ان ہی پر جانوروں کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی اور ان کے سامنے سرِ عبودیت خم کیا جاتا تھا۔ وہ نبی اور اُمتی کا فرق مٹا چکے تھے، رسوم آباء کو سنن انبیاء کا درجہ دے دیا تھا اور سنن انبیاء کو منکرات کا۔ دین اور غیر دین کی تمیز اٹھ چکی تھی۔ دین کو غیر دین سمجھ کر الحاد کا شکار تھے اور غیر دین کو دین جان کو بدعات و محدثات میں گرفتار۔

ادھر ظلمِ اخلاق کے ماتحت معتدل اخلاق اور اخلاقِ فاضلہ کا ان میں کوئی شمہ (کم مقدار) باقی نہ رہا تھا۔ اخلاقی بے اعتدالیوں اور افراط و تفریط کی بدولت نہ ان میں حیاء ہی تھی نہ غیرت، نہ ہمدردی تھی نہ مروت، نہ ایثار، نہ تواضع، نہ بے نفسی، نہ للٰہیت، نہ صبر و شکر، نہ اعتماد نہ توکل۔ ہاں رات دن کا شیوہ تھا، تفاخر و اترابٹ، بے رحمی و قساوت، شیخی و رعونت، کبر و نخوت، سبعیت و بربریت، بے حجابی و بے باکی، ہوسناکی و خودستائی اور ان بداخلاقیوں سے جن بداعمالیوں کا ظہور ہوتا تھا، وہ لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت، زنا و شراب، جوا اور قمار، قتل اولاد وغیرہ تھیں۔ جنہوں نے ان کی دینی و دنیوی زندگی کو تباہ کر ڈالا تھا۔

ادھر غلامیت کا یہ عالم تھا کہ نہ ان میں کوئی مرکزیت تھی نہ سرگروہی، نہ قومی نظام تھا، نہ ملکی تمدن نہ شہریت تھی نہ شہری حقوق، نہ زندگی کا کوئی ضابطہ نہ قاعدہ، پورا ملک خانہ بدوشوں کا ایک غیر منظم ریوڑ تھا، جو جنگل جنگل مارا پھرتا تھا۔ بدویت و بربریت، طوائف الملوکی اور بدنظمی ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔ قومی اور ملکی انتشار اور رات دن کی خانہ جنگیوں نے بالآخر انہیں اسی ذلت و خواری اور محکومیت کے نتیجہ پر پہنچا دیا تھا جس پر ایسے انداز کی قومیں پہنچائی جاتی ہیں۔ کبھی رومیوں کے اسیر اور کبھی فارسیوں کے غلام، کبھی غیروں کے گرفتار اور کبھی خود اپنے شکار۔

غرض ظلم و جہل نے ان میں آثار نبوت مٹا دیے تھے اور غلامیت و غلامی نے ان میں آثار سلطنت محو کر دیے تھے۔ یعنی اس قوم میں نہ دیانت باقی رہی تھی، نہ سیاست، جس کا خون انہی تین امراض، ظلم و جہل اور غلامی کے سر تھا۔

رحمتِ الٰہی کا ظہور علم نبوت، مکارم اخلاق، اسوۂ حسنہ..... آخر کار رحمتِ خداوندی جوش میں آئی اور اس تاریک دل، تاریک پیکر، اور تاریک روش قوم پر ختم نبوت کا آفتاب جہاں تاب چمکا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین مہلک بیماریوں کے دفعیہ کے لئے تین ہی تیر بہدف علاج پیش فرمائے۔ اپنا تبیانی علم جس سے جہل کافور ہو۔ اپنا خلق عظیم جس سے ظلمت اخلاق دور ہو اور اپنا منظم اسوۂ حسنہ جس سے غلامی پاس نہ پھٹک سکے اور زندگی منظم ہو جائے۔ چناں چہ اپنی بھی تین شانیں تین جگہ انہی تین عنوانوں سے ظاہر فرمائیں۔ ایک جگہ بعثت کی غرض ظاہر فرماتے

ہوئے ارشاد فرمایا: "اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا." ① "میں بلاشبہ معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔ ایک جگہ اسی بعثت کی غرض ظاہر کرتے ہوئے فرمایا: "اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ." ② "میں بلاشبہ اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں"۔ ایک جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہوا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ ③ "البتہ تمہارے لئے اللہ کے رسول میں (علم واخلاق وعمل کے) پاکیزہ نمونے ہیں"۔

اپنے علمِ قطعی کے ضمن میں آپ نے وہ قانونِ عمل پیش فرمایا جس سے عمل کی حدود واشگاف ہوگئیں، حرام و حلال جائز و ناجائز اور روا اور ناروا کا امتیاز ہوا۔ اپنے خلقِ عظیم سے عمل کی وہ اخلاقی طاقت پیش فرمائی جس سے جائز اعمال کے دواعی دلوں میں ابھریں، عملی جذبات پیدا ہوں اور آدمی کسی کے اکسانے سے نہیں بلکہ خود اپنے ذاتی جذبے اور شوق سے عمل کی دنیا میں آجائے اور وہ سب کچھ کر گزرے جس کے کرنے کے لئے اسے نعمتِ حیات بخشی گئی ہے اور اپنے اسوۂ حسنہ سے اس علم کا اخلاق کا وہ عملی نظام زندگی پیش فرمایا جس سے پوری قوم میں حریت واستقلال کا ایک جامع اور محکم نظام پیدا ہو جائے۔ جس میں مرکزیت کے ساتھ اس علم و اخلاق کی نشر و اشاعت ہو اور اس کی پیروی ایک ایسی خاص ترتیب سے عمل میں آتی رہے جو پوری قوم میں وقار و شوکت، مادی و روحانی طاقت اور غلبہ وتسلط کے ہمہ گیر آثار پیدا کر دے۔

بہرحال قرنِ اول کی اصلاحی اکسیر کے یہی تین بنیادی اصول علمِ نافع (حکمتِ نظری) خلقِ عادل (حکمتِ اخلاقی) اسوۂ حسنہ (حکمتِ عملی) جنہوں نے قوم کے ظلم وجہل اور بدنظمی کو یکسر فنا کر کے دنیا میں ایک نئے حکیمانہ نظام کی بنیاد ڈالدی۔ علم سے انہوں نے دماغوں کو روشن کیا، اخلاق سے قلوب کو جگمگایا اور اسوۂ حسنہ کی پیروی سے اپنے جوارح کو شائستہ بنایا اور ان تینوں روشن ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جب وہ عالم میں نکلے تو دنیا نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان تین طاقتوں کے ذریعے خدا نے اپنے قرآنی وعدے کے مطابق ان کی خلافتِ ارضی کی جڑیں زمین میں جما دیں۔ بلاد فتح ہوئے، عباد (اللہ کے بندوں) کی گردنیں جھک گئیں اور صلاح ورشد، امن وسکون کا دنیا میں دور دورہ ہو گیا۔

مسلمان بحیثیت فاتحِ عالم...... چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے ہی مکہ، خیبر، بحرین اور تمام جزیرۃ العرب اور پوری ارضِ یمن فتح ہو گئی۔ فارس کے علاقوں میں مجوسِ ہجر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خراج لیا اور بعض اطرافِ شام تک پر اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا۔ سلاطینِ عالم پر یہ اثر ہوا کہ ہرقل شہنشاہ روم، مقوقس بادشاہ مصر، نجاشی بادشاہ حبشہ اور ملوکِ عمان نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں ہدایا بھیج کر اپنی گرویدگی کا اظہار کیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافتِ راشدہ ہی کے مختصر دور میں اسلامی فتوحات کا یہ عالم

① السنن لابن ماجه، المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم، ج:۱، ص:۲۴۵.

② السنن الكبرىٰ للبيهقي، كتاب آداب القاضي، باب بيان مكارم الاخلاق ومعاليها، ج:۱۰، ص:۱۹۲.

③ پارہ: ۲۱، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۲۱.

کھلا تو سانِ نبوت کی پیشین گوئی کے مطابق وہ پھیلتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ دنیا کے اکثر حصہ پر اس نے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ دورِ صدیقی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے دستِ حق پرست پر بہت سے بلادِ فارس (ملک) ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر متعدد بلادِ شام عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر کتنے ہی بلادِ مصر فتح ہوئے۔ دورِ فاروقی (رضی اللہ عنہ) آیا تو ان فتوحات کی تکمیل ہوئی۔ پورے دیارِ مصر، تمام اقلیم فارس اور روم و قسطنطنیہ تک اسلامی خلافت کا دائرہ وسیع ہو گیا اور اسلامی شعائر بلند ہو گئے، دولتِ عثمانی (رضی اللہ عنہ) کا زمانہ آیا تو ان فتوحات نے سیلاب کی صورت اختیار کر لی، زمین کے مشارق و مغارب تک بیدو جا پہنچی۔

بلادِ مغرب سے اقصاءِ اندلس، قبرص، قیروان، بلادِ سبتہ اور بحرِ محیط تک۔ ادھر ناحیہ مشرق سے اقصائے بلادِ چین۔ اقصائے ایران اور مدائن عراق و خراسان تک اسلامی قلمرو کا دائرہ وسیع ہو گیا اور ان تمام اقلیموں سے خراج جمع ہو مدینہ کی گلیوں میں پہنچنے لگا۔ اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ پیشن گوئی ارشاد فرمایا تھا کہ:

"اِنَّ اللّٰهَ زَوٰى لِيَ الْاَرْضَ فَرَاَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا وَسَيَبْلُغُ مُلْكُ اُمَّتِيْ مَازُوِيَ لِيْ مِنْهَا." ①

"اللہ نے ساری زمین مجھے دکھلائی تو میں نے تمام مشرق و مغرب کو دیکھا اور عنقریب میری امت کا ملک اس حد تک پہنچ کر رہے گا۔ جہاں تک زمین کو میں دیکھ چکا ہوں"۔

ظاہر ہے کہ خلافتِ راشدہ کے دوران میں زمین کے سارے مشارق و مغارب تک فتوحات کا دائرہ وسیع نہیں ہوا، بہت سے وہ ناچیے کونے باقی رہ گئے جن تک نگاہِ نبوت پہنچ چکی تھی، اس لئے خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی ملوکیت کے زمانہ میں بھی فتح کا سیلاب بڑھتا رہا۔ چناں چہ ہندوستان، افغانستان، جزائر شرق الہند، جاوا، سماٹرا اور کتنے ہی یورپین ممالک کے خطے اسلامی تلوار سے فتح ہوئے۔ جن کے کلچر، تہذیب، تمدن اور مذاہب کو بھی اسلام نے فتح کیا یا کم از کم ان کی ذہنیتوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ لیکن پھر بھی نگاہِ نبوت کی وسعتیں ابھی باقی ہیں اور وہ وقت دور نہیں ہے کہ ہر بیت و بر اور مدر (خیمے اور مکان) میں اسلام کا کلمہ داخل ہو کر پوری دنیا کو اپنی ہمہ گیر وسعتوں میں لے لے اور ساری دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دے۔

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ، وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا.﴾ ② ...... "وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت کی اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تا کہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے (باعتبار حجت و دلیل بھی اور بلحاظ شوکت و سلطنت بھی جس کا ظہور قرنِ اول میں ہوا "کَیْفًا" اور قرنِ آخر میں ہوگا "کَمًّا")"۔

بہر حال یہ سب مادی و روحانی برکات اسی مقدس قوم کے دستِ حق پرست پر ظاہر ہوئیں، جنہوں نے برکاتِ نبوت سے متبرک ہو کر ہوا پیے ظلم کو عدل و اخلاق سے، جہل کو علمِ نافع سے اور علم کو اسوۂ حسنہ کے منظم اعمال

① مسند احمد، حديث شداد بن اوس رضي الله عنه، ج:۳۳، ص: ۴۲۹. ② پارہ: ۲۶، سورة الفتح، الآية: ۲۸.

سے متنیر (روشن) کیا۔

زمانۂ جاہلیت..... آج اگر سوچو تو قوم کی اکثریت تیرہ صدی بعد پھر اسی جاہلیت اولیٰ کے تین اصول ظلم و جہل اور غلامی کا بہت حد تک شکار ہو چکی ہیں جس کا قبل از بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تھی۔

دفورِ جہل..... وفور جہل کا یہ عالم ہے کہ آج مسلمانوں کی عام زندگی فتنۂ جہل سے لبریز ہے۔ اسباب علم جتنے بڑھتے چلے جاتے ہیں اسی نسبت سے امت کا جہل ترقی کرتا جا رہا ہے۔ آج کے جہل نے بدیہیات دین کو نظری بنا دیا ہے۔ اصول اعتقادات تک میں شکوک وشبہات کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں۔ کسی کو خدا کے وجود میں کلام ہے، کسی کو اس کی صفات میں، کسی کو نبوت کی ضرورت میں کلام ہے اور کسی کو آثار نبوت یعنی کلام الٰہی کے منزل من اللہ ہونے میں کسی کو ختم نبوت میں کلام ہے اور کسی کو صحابیت کے عدل وثقہ میں، کسی نے پیغمبروں میں خدائی صفات سے علم کلی۔ احاطہ حاضر و ناظر۔ نفی بشریت وغیرہ مان رکھی ہیں اور کسی نے خدائی خصوصیات کی نفی کا خدا ہی سے اعلان عام کیا ہوا ہے۔ کوئی معاد کے جسمانی ہونے کا منکر ہے اور کوئی سرے ہی سے اسے دل کے بہلاؤ کا سامان کہہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان بنیادی عقائد میں علم کی قلت اور جہل کی کثرت کا یہ عالم ہے تو فروعی اعتقادات اور اعمال کے سلسلے میں جہالت کی جو نوعیت ہوگی اس کا اندازہ خود کر لیا جائے۔

مسلمانوں کے علمی ادارے جس کسمپرسی اور بے کسی کے عالم میں ہیں۔ اس سے کوئی ناواقف نہیں، دس کروڑ نفوس کی تعداد کے لحاظ سے حساب لگایا جائے کہ کتنے مدارس کی ضرورت ہو سکتی ہے اور واقعی کتنے ہیں اور پھر جس قدر بھی وہ علمی افراد تیار کر رہے ہیں، قوم کس حد تک ان کا خیر مقدم کر رہی ہے۔ اگر فی لاکھ ایک دو ان کی قدر کرتے ہیں تو فی صدی ۹۹ علم اور علماء کے خلاف اعلان جنگ کئے ہوئے ہیں۔ کوئی انٹی ازم قائم کر کے اس مولویانہ سسٹم ہی کو ختم کرنے کی فکر میں ہے۔ کوئی مولوی کا غلط مذہب کہہ کر اس روش کو ہی اڑا دینا چاہتا ہے۔ کوئی علماء کے اثرات زائل کرنے کی تدبیر سوچ لینے کو انتہائی کامیابی سمجھ رہا ہے۔ کوئی علماء حقانی کی تکفیر کو اسلام کا اہم ترین مقصد خیال کر رہا ہے۔ غرض اغیار نے اپنی مجموعی طاقتوں سے بھی وہ کچھ نہیں کیا تھا جو آج اپنے کر رہے ہیں۔ اس ایک لاعلمی ہی کا رونا نہیں ہے بلکہ علم دشمنی اور علم و اہل علم سے بیزاری، اس سے زیادہ مہلک مرض ہے جو مسلمانوں میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس صورت حال میں جہل اگر اپنی مہیب شکلوں کے ساتھ ان پر مسلط نہ ہو تو اور کیا ہو؟

اور ان حالات میں قوم پر شرعی مقاصد روشن ہوں تو کیونکر ہوں؟ اس افراط جہل کا نتیجہ یہ ہے کہ ۔

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

ہر شخص کا ایک خیالی افسانہ اس کا مسلک ہے اور جبکہ خیالات میں قدرتی تفاوت ہے تو اختلاف خیالات سے مسالک بھی اور مسلکوں کے سالک مختلف اور متصادم بن گئے۔ جس سے قوم میں گروہ بندی اور جماعت آرائی کی وبا پھیلی ہوئی ہے اور اس سے جماعتی و اجتماعی طاقت میں روز بروز خلل اور اضمحلال بڑھتا جا رہا ہے۔

فقدانِ اخلاق...... ادھر اخلاق بے مائگی علمی تہی دستی سے بھی زیادہ ہے۔ اکثر و بیشتر اخلاقی تربیت گاہیں رَنگی گدیاں اور تحصیل وصول (چندہ لینے) کی چوکیاں بن کر رہ گئی ہیں۔ اس قسم کی رسوم گاہوں سے بجائے اس کے کہ اسلامی وظائف کے جذبات لے کر لوگ نکلیں۔ سنن اسلام سے ہٹانے اور شعائرِ دین سے برگشتہ کرنے کے دواعی لے کر نکلتے ہیں۔ پھر علم کتاب وسنت کا انہیں ذوق نہیں رہتا۔ علماء سے بیزاری بڑھ جاتی ہے۔ سنن انبیاء سے بدظنی قائم ہو جاتی ہے۔ عادت وعبادت کی بدعات ومحدثات میں طبائع الجھ جاتی ہیں۔ آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان تربیت گاہوں سے آنے والوں کی تربیت سے مسلمان صرف چند رسوم کی پابندی کو پورا اسلام سمجھ کر حقیقی اسلام کو کفر اور پورے مسلمان کو کافر سمجھنے اور سمجھانے کے مشغلہ میں لگ کر اصل دین سے محروم ہو جاتے ہیں۔ نہ ان میں اخلاقِ ربانی کی نمود ہی قائم ہوتی ہے نہ اخلاقی احوال وکیفیات اور نہ مقامات واقوال جلتی۔ پھر بداخلاقیاں، حسد وریا، کبر وحرص، اسراف وبخل، جبن وودوں ہمتی جاہ پرستی وجاہ پسندی وغیرہ ہی ان میں راسخ ہو جاتی ہیں۔ نہ ان کی تعدیل ہوتی ہے نہ تکمیل وتتمیم جو مقصد نبوت تھا۔ اس کا ثمرہ یہ ہے کہ اصول کی بجائے نفسانی جذبات اور ان کا اظہار ہی سب سے بڑا کمال سمجھا جانے لگا ہے۔ اور جب ہر طرف سے جذبات کا مظاہرہ ہو تو اس کا قدرتی نتیجہ سر پھٹول اور نااتفاقی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ علمی فتنہ سے جماعتی اختلاف اور گروہ بندی کا فتنہ پھیلتا ہے، اور اس اخلاقی فتنہ سے انفرادی سر پھٹول، باہمی ناچاقی، ایک دوسرے سے بیزاری اور بے تعلقی پھیلتی رہتی ہے۔ آج امت اس میں بھی مبتلا ہے اور اس میں بھی اور مخصوص افراد کو چھوڑ کر جن کا اخلاص ان کے ہر عمل پر غالب ہو۔ عامہ قوم کی رفتار جماعتی اور انفرادی نزاع وجدال ہی کی طرف بڑھتی جاتی ہے، توافق اور توافق کی راہ میں غم خواری۔ دوسروں کی دل داری کے لئے دل سوزی اور دوسروں کی بات بنانے کے لیے شفقت وایثار گویا دنیا سے عنقا ہو چکا ہے۔

ثمراتِ غلامی...... ادھر محکومیت اور اس سے پیدا شدہ غلامی کی کیفیت یہ ہے کہ حقیقی حریت سے نفرت اور قومی استقلال وخودداری سے بیگانگی کافی حد تک قوم میں موجود ہے۔ قوم میں کوئی اخلاقی طاقت منظم نہیں۔ نہ علمی اداروں کا کوئی ایک نظام ہے۔ نہ اخلاقی تربیت گاہوں کا کوئی نظم ہے نہ معاشرت کسی نظام کے تحت ہے۔ نہ معیشت، نہ تنظیم ہے، نہ قومی وحدت۔ طبقاتی انتشار دھوئیں کی طرح افق قوم پر چھایا ہوا ہے اور سیاسی حلقوں میں جماعتی تفرق وتحزب کی اونچی اونچی عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر باوجود اتحادِ مقصد کے محض طریقۂ عمل کا بھی اختلاف آ جاتا ہے تو چونکہ اخلاقی اور علمی حالت کمزور ہے اس لئے یہ اختلاف نزاع وجدال بنے بغیر نہیں رہتا۔ پھر یہ اختلاف کسی اصولی راہ سے نہیں ہوتا بلکہ شخصی آراء وقیاسیات سے پروگرام بنتے ہیں اور ہر شخص کا دستور اور فارمولا خود اسی کا ساختہ پرداختہ ہوتا ہے اس لئے اسلامی رنگ سے عموماً بعید بھی ہوتا ہے اور مستقلاً ذریعۂ نزاع وجدال بھی بن جاتا ہے۔

دیانت وسیاست تباہ ہو جانے کے نتائجِ بد...... بہرحال قوم کا نظامِ علم واخلاق جو مجموعۂ دیانت ہے ایک طرف مختل ہے (درہم برہم) اور نظامِ آزادی جو خلاصہ سیاست ہے، دوسری طرف مضمحل (کمزور) ہے۔ اس لئے

آج مسلمانوں کی دیانت اور سیاست، دونوں تباہی کے کنارے پر ہیں اور خود ان کے ہاتھوں میں نہیں ہیں ان دونوں بنیادوں کے تزلزل سے جو آثار بدنمایاں ہونے چاہیے تھے، وہ ہو رہے ہیں اور نمایاں تر ہو چکے ہیں۔ تخریب و فساد مار دھاڑ اور جنگ نے دنیا کے کناروں کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے امن و سکون گھروں شہروں اور اقلیموں بلکہ پوری دنیا سے عنقا (نایاب) ہو چکا ہے۔ بے چینی اور اضطراب و پریشانی چار دانگ عالم پھیلی ہوئی ہے۔ انسانیت حد درجہ ذلت و خواری اور پستی میں آ چکی ہے۔ جو چیزیں انسان کی خادم اور غلامی کے لئے تھیں آج وہ اس کے سر پر ایک جلاد کی حیثیت سے مسلط ہیں اور جو چیزیں انسانوں نے اپنی راحت و عیش کی خاطر ایجاد کی تھیں وہی آج ان کے حق میں وبال جان بنی ہوئی ہیں نہ آج انسان کے لئے سطح زمین پر پناہ ہے کہ وہاں اسے آسمانی بم، زمینی گولیاں اور زہر یلے گیس دم بھر نجات نہیں لینے دیتے۔ نہ اسے سنگین قلعوں میں پناہ ہے کہ قلعہ شکن توپوں کے کھلے ہوئے دہانے اپنی دھواں دار فولادی بارش سے اسے سنگوا لیتے ہیں۔ نہ اسے سمندروں کے جگر میں پناہ ہے کہ تارپیڈو تحت البحریاں اسے اور زیادہ تہ سمندر میں اتار دیتی ہیں۔ نہ اس کے لئے آسمانی فضاؤں میں پناہ ہے کہ ایروپلین شکاری اور طیارہ شکن توپیں اس کا شکار کر لیتی ہیں۔ غرض جمادات، نباتات، حیوانات سب اس کی دشمنی پر کمر بستہ ہیں۔

پھر آج کا انسان اپنے گھر کی چہار دیواری میں پناہ لیتا ہے تو طرح طرح کے امراض و مصائب اس کے سر پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ اس سے بھاگنے کی سعی کرتا ہے تو خوف اعداء (دشمن) اور قسم قسم کے افکار و پراگندگی سے اسے نجات نہیں ملتی۔ غرض انسان کے لئے نہ آج انسان کارآمد ہے نہ غیر انسان، حاصل یہ ہے کہ انسان خود اپنے ہی کرتوتوں کے نتائج بھگت رہا ہے اور اس کے گلے پر اسی کے ہاتھ سے خنجر چلوائے جا رہے ہیں:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ ① ''خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں تاکہ اللہ ان کے بعض اعمال کا مزہ ان کو چکھا دے تاکہ وہ باز آ جائیں''۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ﴾ ''اور جو کچھ بھی تمہیں دکھ پہنچتا ہے سو وہ تمہارے ہی کرتوتوں کے سبب سے''۔

اور ظاہر ہے کہ جب اس نے خود اپنے کو پناہ دینا نہیں چاہا، تو اس کے لئے اس کے مالک ہی کے ہاں پناہ کے دروازے کب کھلے رہ سکتے تھے؟ اسی کی قانون شکنی کا تو یہ اثر ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی ہر ایک چیز اس کی دشمن ہو چکی ہے اور پورا خدائی کارخانہ اس کے خلاف کھڑا ہوا ہے۔ پس اس نے اپنے مالک کو کیا بھلایا کہ خود اپنے ہی کو بھلا دیا ہے۔ ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ ②

''اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنھوں نے خدا کو بھلا دیا، سو اللہ نے خود ان کی جانوں سے انہیں بھول میں ڈال دیا یہی لوگ نافرمان ہیں''۔

① پارہ: ۲۱، سورة الروم، الآية: ۴۱. ② پارہ: ۲۸، سورة الحشر، الآية: ۱۹.

اور ظاہر ہے کہ ان تمام مہالک ومفاسد کی جڑ، بنیاد وہی تین غلطیاں نکلیں گی جو زمانہ جاہلیت کی تباہ کاریوں کی روح رواں تھیں۔ یعنی جہل، ظلم اور غلامی اور دوسرے لفظوں میں بدیاتی اور بدسیاستی، اس لئے جو علاج جاہلیت عرب کے لئے مؤثر اور تیر بہدف ہوا تھا، وہی آج کی جاہلیت کو بھی دفع کرسکتا ہے۔ بقول حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے کہ: "لَا يُصْلِحُ اٰخِرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِهٖ اَوَّلُهَا" ① "اس امت کے آخر کی اصلاح بھی اسی چیز سے ہو سکتی ہے جس سے امت کے اول کی اصلاح ہوئی"۔

سو جب عرب جاہلیت کے ان امراض سہ گانہ جہل ظلم اور غلامی کو ان کی تین اضداد علم احکام عدل اخلاق اور اتباع اسوۂ حسنہ سے دفع کیا گیا تو آج کے بھی انہی امراض سہ گانہ میں تین اجزا نفع بخش ثابت ہو سکتے ہیں اور اسی لئے انہیں تین اجزا کو قرآن نے مقصد بعثت قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾ ② ..... "وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور دانشمندی سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے"۔

تعلیم احکام، تہذیب اخلاق، تنظیم اعمال..... آیت بالا میں تلاوت آیات کا ذکر فرما کر جس کا تعلق قرآن حکیم کی لفظی حیثیت سے ہے اس کی معنویت کے تین مقام ذکر فرمائے گئے ہیں۔ جس سے لمت کی اصلاحی اسکیم کے تین تین بنیادی اصول پیدا ہوتے ہیں۔ اول مسئلہ تعلیم جس کے معنی تمام احکام کو پیش کر دینے اور سکھلا دینے کے ہیں کہ جس پر لمت کے علم وفکر کی تکمیل وترقی موقوف ہے۔

دوسرا مسئلہ تزکیہ یا تہذیب اخلاق جس کے معنی دلوں کی کلیں درست کر دینے کے ہیں کہ تمام باطنی کیفیات ومقامات کو سامنے لاکر جن پر قلوب کی استقامت موقوف ہے، درست کیا جائے۔ تیسرا مسئلہ تلقین حکمت جس کے معنی ایک تفسیر کے مطابق شارع (پیغمبر) کی مجموعی زندگی اسوۂ حسنہ لمت کے سامنے لے آنے کے ہیں، جس کے مجموعہ پر لمت کی زندگی کی تنظیم موقوف ہے۔

قرآن کا اصلاحی پروگرام..... پس قرآن کریم کے اصلاحی پروگرام کے تین بنیادی اصول ہو گئے۔ ۱۔ تعلیم احکام ۲۔ تہذیب اخلاق ۳۔ تنظیم اعمال۔ عرف عام میں اول کا لقب شریعت ہے، دوسرے کا طریقت اور تیسرے کا سیاست، گویا یہ دین کے موالید ثلاثہ ہیں۔ جن سے دینی کائنات مرکب ہے۔ اسلام میں ان تینوں کے بغیر چارہ کار نہیں اور نہ ایک کے بغیر دوسرے کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

شریعت..... شریعت سے تو راہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر راستہ ہی سامنے نہ ہو تو قطع مسافت (راستہ طے کرنا) کیسے

① تخریج گذر چکی ہے۔ ② پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲.

ممکن ہے؟ طریقت سے اس راہ پر چلنے کی اخلاقی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اگر راہ روی کی طاقت نہ ہو تو محض راہ کی استقامت سے کیا ہوتا ہے اور سیاست سے راہ کے روڑے صاف ہوتے ہیں۔ اگر راستہ پر خار اور سنگ راہ سے لبریز ہو تو طاقت بھی کیا کام دے سکتی ہے۔ اگر پھر بھی کام لیا جائے تو ساری طاقت راستہ ہی پر صرف ہو کر رہ جائے گی، منزل مقصود تک رسائی ہی مشکل ہو جائے گی۔ پس شریعت راہ ہے، طریقت قوت راہ روی ہے اور سیاست تصفیہ راہ ہے۔ قوت ہمیشہ مخفی چیز ہوتی ہے۔ راستہ ہمیشہ نمایاں ہوتا ہے اور راستہ کی صفائی کا کام نمایاں ہی نہیں کافی شور و شغب بھی لئے ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی چیز ہے کہ:

طریقت...... طریقت اور تصوف کی بنیاد یکسوئی اور انفرادیت پر ہو۔ چنانچہ وہ اپنے مبانی واصول اور معانی و فروع کے لحاظ سے انسان کو طبعاً تخلی وخلوت اور یکسوئی کی طرف کشاں کشاں لے آتی ہے۔ صوفی بحیثیت ایک صوفی کے ساری دنیا سے یکسو اور الگ تھلگ ہو جاتا ہے، اسے صرف اپنی ذات اور اس کی صلاح وفلاح پیش نظر ہوتی ہے۔ وہ اگر دوسروں سے ملتا بھی ہے تو انہیں بھی اپنا ہم مذاق بنا کر مخلوق سے منقطع کر دیتا ہے، بہر حال خلوت پسندی سے اسے کوئی طاقت ہٹا نہیں سکتی جب تک کہ اس پر طریقت کا غلبہ ہو۔ لیکن شریعت کی بنیاد تعلقات کی کثرت اور ادائے حقوق پر ہے۔ ہدایت وارشاد کی خاطر مخلوق میں گھسنا، ان کی اڑی کڑی جھیلنا اور لگی آگ میں گھس کر جلتے ہوؤں کو نکالنا۔ طریقت میں جس مخلوق سے کنارہ کشی اختیار کی جاتی ہے شریعت میں اسی مخلوق سے رابطہ جوڑا جاتا ہے۔ وہاں "فرار عن الخلق" ہے اور یہاں "ذھاب الی الخلق"۔ پس ایک متشرع جس پر تشرع کا غلبہ ہو، بحیثیت ایک شرعی فرد ہونے کے سارے انسانوں کی طرف دوڑ کر ان کی اصلاح کی فکر میں رہے گا۔ اسے درد ہوگا اپنے گھر پھر اپنے قبیلہ کا پھر شہر کی عام برادری کا اور پھر ساری دنیا کے انسانوں کا پس اس جلوت پسندی سے اسے کوئی طاقت نہیں ہٹا سکتی جب تک کہ اس پر شرعی رنگ کا غلبہ ہوگا۔

سیاست...... ادھر سیاست کے دائرہ میں تعلقات کی نوعیت اور بھی زیادہ شدید و مدید اور ہمہ گیر ہو جاتی ہے۔ وہاں شریعت کی رو سے تو آدمی اپنے نفس سے نکل کر عباد تک آیا تھا اور یہاں سیاست میں عباد سے نکل کر بلاد تک اور بلاد ہی نہیں صحرا و جبال، زمینوں اور ان کی پیداوار، دریاؤں اور ان کے بہاؤ، حیوانات اور ان کے منافع۔ غرض ساری کائنات کے اجزاء اور ان کی تنظیم تک ایک سیاسی کو بڑھنا پڑتا ہے۔ وہاں ایصال حقوق الگ ہے اور دفاع مظالم الگ۔ حدود وقصاص الگ ہے اور جہاد و جانبازی الگ، احراز غنائم الگ ہے اور اسارۃ محاربین الگ۔ غرض ایک شوکت کو توڑنا اور ایک کا جھنڈا بلند کرنا، مفسدوں کو دبانا اور مصلحوں کو سر بلند کرنا، مبطلوں (باطل والوں) کا زور توڑنا اور محقوں (حق والوں) کو مدد دینا اور خلاصہ یہ کہ مادی وروحانی طاقتوں سے طرح طرح کے انقلابات کر کے سلطنتوں کو الٹ پلٹ کرنا اور نئے نئے نظاموں کی بنیادیں ڈال کر سارے عالم پر ایک شوکت قائم کرنا ایک سیاسی کا کام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں یکسوئی اور خلوت کہاں؟

یہاں تو عباد سے گزر کر بلاد، انسانوں سے گزر کر حیوانات، حیوانات سے گزر کر نباتات اور سب سے گزر کر ایک ایک چپہ زمین کے لئے اسی نفس کی ساعتیں صرف کی جاتی ہیں، جس کی ایک ایک گھڑی طریقت میں یکسوئی محض اور شریعت میں ایک خاص دائرہ تعلقات میں محدود تھی اس لئے طریقت خلوت محض ہے۔ سیاست جلوت محض ہے اور شریعت دونوں کے درمیان ایک برزخ ہے جو ان دونوں کو ملا کر خلوت در انجمن پیدا کر دیتی ہے۔

اس سے خود واضح ہوتا ہے کہ شریعت کا خلوت در انجمن میں آنا جب ہی ممکن ہے کہ اس کے دائیں بازو پر خلوت کا مخزن (طریقت) ہو اور بائیں بازو پر انجمن کا منبع (سیاست) ہو۔ ورنہ خلوت در انجمن اور دل بیار دست بکار کا وجود ہی نہیں ہو سکتا، ظاہر ہے کہ اس حالت میں ان تین عنصروں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے تو ان کے باہمی امتزاج کے قلوط منافع منقطع ہو کر ایک ایک مخصوص مضرت سر پر پڑ جائے گی۔

اگر طریقت محض رہ جائے جس میں شریعت وسیاست نہ ہو تو وہ وحشت اور خجالت محض ہے۔ اگر شریعت محضہ ہو جس کے ساتھ طریقت وسیاست نہ ہو تو وہ شدت وجمود محض ہے۔ اگر سیاست کے ساتھ شریعت وطریقت نہ ہو تو وہ نخوت وتجبر محض ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں صفات کمال نہیں ہیں۔ اس لئے ان سب میں کمال ہونے کی جامعیت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بدرقہ اور مصلح ہے اور اسی لئے دین نے ان سب کو جمع کر کے اپنا نام دین رکھا ہے۔ جیسا کہ حدیث جبریل سے واضح ہے، پس طریقت کی وحشت کا بدرقہ شریعت و سیاست ہے۔ جن کی آمیزش سے شفقت علی الخلق اور تربیت عالم کا ظہور ہوتا ہے اور خلافت الٰہی نمایاں ہو کر نفسانی جبر وقہر فنا ہو جاتا ہے۔ پھر شریعت وطریقت کی کسمپرسی و بے بسی کا بدرقہ ہے سیاست: جس کی مادی شوکت ان دونوں کے لئے سرمایۂ عظمت وحفاظت بنتی ہے۔

پس جب ایک طریقت اور تہذیب اخلاق کے ذریعہ نفس میں عدالت پیدا ہوگی۔ شریعت کے ذریعہ علم احکام اور تعلیم غیر کا جذبہ شفقت قائم ہوگیا اور سیاست وقوت کے ذریعہ اس علم احکام اور حسن اخلاق کے تنفیذ کی قدرت پیدا ہوگئی تو اب سیاست میں سے تو نخوت وتجبر نکل کر وقار وخودداری اور شہامت (بہادری) آ جائے گی۔

طریقت میں سے رسم خلوت نکل کر حقیقت خلوت یعنی تعلق مع اللہ اور انقیاد احکام کا ملکہ پیدا ہو جائے گا اور ادھر اتباع شریعت میں خشکی وجمود وتنگ نظری اور تقشف سے نکل کر وسعت نظر، جامعیت ہمہ گیر تعاون باہمی اور اتحاد وذات البین کے جذبات ابھر آئیں گے جس سے قوم کے مادی وروحانی عروج کا نقشہ خود بخود قائم ہو جائے گا، جس کے مجموعہ کو دین کہیں گے۔

جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ دین بغیر ان تینوں عنصروں کے جمع کئے ہوئے مکمل نہیں ہوتا اور خدام دین اس وقت تک صحیح معنی میں خدمت دین نہیں کر سکتے جب تک وہ بیک دم متشرع صوفی اور سیاسی نہ ہوں۔ افسوس یہ ہے کہ آج یہ تینوں چیزیں الگ الگ مستقل شمار کی جارہی ہیں اور ان کے حامل الگ الگ مستقل طبقات گنے جارہے

ہیں اور اس طرح شریعت و طریقت اور سیاست کو الگ الگ مستقل منہاج سمجھ لیا گیا ہے اور نہ صرف اسی پر اکتفاء کیا گیا ہے بلکہ صوفی اپنے تصوف کی تکمیل اس میں سمجھتے ہیں کہ وہ علماء کے مدمقابل آئیں۔ علماء صوفیوں کے مقابلہ پر ہوں اور سیاسی ان دونوں طبقوں کے بالمقابل کھڑے ہوئے ہوں اور یہ دونوں طبقے سیاسیوں کے۔

اس لئے قوم میں تین مستقل طبقے قائم ہیں اور وہ بجائے اس کے کہ مل کر کسی ایسی طاقت کے بالمقابل آئیں جس نے ان کا علم بھی غلط کر رکھا ہے اور عمل کا راستہ بھی غلط ڈال دیا ہے۔ اپنی اپنی طاقتیں آپس ہی آویزشوں میں ختم کر دیتے ہیں، جس سے تفرقہ انداز طاقت اور زیادہ قوی اور دلیر ہوتی جاتی ہے۔ میرے خیال میں جب تک یہ تینوں طبقے مل نہ جائیں اور نہ صرف افراد ہی مل جائیں بلکہ ان کے یہ تینوں فنون اس طرح باہم امیختہ (یکجا) نہ ہو جائیں کہ قوم کا ہر ہر فرد متشرع خالص، صوفی، صافی اور سیاسی مخلص ہو جائے اس وقت تک قوم بحیثیت مجموعی مکمل نہیں کہلا سکتی اور اسلامی نقطۂ نظر سے کامیابی کا منہ بھی نہیں دیکھ سکتی۔

اسلام میں دین سیاست سے الگ نہیں...... وجہ یہ ہے کہ ان میں سے دو جزو علم اور حسن اخلاق دیانت کے اساسی شعبے ہیں اور ایک جزو کمال نظم و اجتماعیت سیاست کا شعبہ ہے اور سیاست کو دیانت سے جب بھی علیحدہ کیا جائے گا جب ہی نہ حقیقی سیاست قائم رہے گی نہ حقیقی دیانت، اگر دیانت نہ رہے تو سیاست اِک کٹ کھنا اور جور و استبداد کا ملک ہوگا اور اگر سیاست نہ رہے تو دیانت بے کس بے بس اور علی شرف الزوال ہو جائے گی۔ قانون محض اور کوری سیاست سے دنیا بھی امن و چین کا منہ نہیں دیکھ سکتی اور نہ ہی عالم بشریت کی اصلاح و تنظیم ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو آج یورپ سب سے زیادہ صالح سب سے زیادہ باہم مربوط اور ساری دنیا سے زیادہ پر امن ہوتا۔ کیوں کہ وہاں تو آئین سیاست کی دفعات برساتی کیڑوں کے عدد سے کسی طرح کم نہیں ہیں، کتنی ہی قانون ساز جماعتیں بارہ مہینے وضع قانون میں مصروف ہیں۔ ہاؤس قانونی بحثوں کے لیے وقف ہیں۔ نئی نئی ضروریات پر روزانہ قانون بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں، لیکن جس حد تک سیاسی ضوابط بڑھتے جاتے ہیں اسی درجہ روابط باہمی گھٹتے جاتے ہیں۔ رقابتوں اور عداوتوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ انسانوں کی درندگی اور ہوسنا کی قانون کے دائرہ میں رہ کر قانونی غارت گریاں اور آئینی ظلم و ستم خوب خوب سیکھتے جا رہے ہیں، اور یورپ کی ساری دنیا قتل و غارت اور ہوا و ہوس کا ایک جہنم زار بنی ہوئی ہے۔ پس اگر سیاست محض اور روکھے قانون سے بشریت کی اصلاح و تنظیم ممکن ہوتی تو یورپ کو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا کہ وہاں نہ سیاست کی کمی ہے نہ قوانین کی۔ ہاں اگر کمی ہے تو دیانت کی ہے۔ یعنی وہاں کی سیاست کے پیچھے نہ اخلاق ربانی ہیں نہ مقاصد الٰہیہ کا علم ہے اور نہ ان کا کوئی نمونۂ عمل۔ اور جب سیاست کا محور ہی صحیح نہ ہو تو کوری سیاست اور خالی قانونی اتار چڑھاؤ سے امن نفوس اور سکون عالم کیسے نصیب ہو سکتا ہے؟

پس آج کی یورپین تباہ کاریاں اور عالم گیر سر پھٹول اور انسانیت کی یہ تباہی اور ذلت و خواری فقدان

سیاست سے نہیں بلکہ فقدانِ دیانت کے سبب سے ہے، جب آدمی ایک بے شعور درندہ بن جائے تو محض سیاست اس کے دل ودماغ کو تبدیل نہیں کرسکتی۔ یہ انقلاب ذہنیت صرف تہذیب اخلاق اور تعلیم کتاب اللہ سے ممکن ہے جو مجموعۂ دیانت ہے۔ ہاں مگر اسی طرح دیانت بلا سیاست اور علم واخلاق بلا شوکت بے بس کس اور عام نگاہوں میں بے وقعت ہو جانے کے سبب قبول عام اختیار نہیں کرسکتے اور نہ صرف یہی بلکہ اس ضعف آور صورت حال کے بڑھ جانے سے ان کی تحقیر واستہزاء اور تمسخر کی داغ بیل پڑتی ہے جس سے شوکت پرست طبقہ میں ان کی حقارت ایک مشن اور مقصد کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ فساق وفجار طبیعتیں جو شوکت دین سے دبی رہتی ہیں، ان حالات میں کھل کھیلتی ہیں اور اسی استہزاء وتمسخر کی سنّت سیئہ کو اور مضبوط بنادیتی ہیں۔ ساتھ ہی وہ طبقہ جو کوفسق و فجور کا شکار نہ ہو مگر تقوی وتقدس کی طرف بھی کوئی خاص میلان نہ رکھتا ہو، وہ بھی فجور کا غلبہ واستیلاء دیکھ کر ادھر ہی مائل ہو جاتا ہے اور اب وہ خالص حقانی طبقہ جو علم واخلاق کا سرمایہ لئے رہتا ہے بے کس بے بس رہ جاتا ہے۔ جن میں سے ضعفاء قلوب اس بے کسی کی مصیبت سے تنگ آ کر بالآخر ادھر ہی جا ملتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ دیانت بے سیاست اپنا وجود ختم کردیتی ہے۔ غلامی اور محکوی کے منحوس آثار رفعت وشوکت کے سارے جذبات ختم کر کے خود ہی بلا شرکت غیرے غالب آجاتے ہیں۔ غلام آباد ہندوستان میں دیانت وراست بازی کی کمی نہیں، بلکہ شاید وہ آزاد مسلم ممالک کی نسبت دینی سرمایہ کا زیادہ امین ہے۔ لیکن اس کی دیانت بے یار و مددگار اور زیر تشنیع وملامت ہے۔

مولوی کا غلط مذہب، جذبات، اپنی ملازم، تکفیر اہل حق، ازالۂ اثرات علماء کی مساعی اور اس کے بالمقابل الحاد وشرک، بدعات، محدثات، منکرات وفواحش اور معاصی سے اہل دیانت کی ترمیم صرف اسی کا نتیجہ ہیں کہ دیانت اپنی ہے اور سیاست دوسرے کی، یعنی مسجد اپنی ہے اور قفل دوسرے کے ہاتھ میں ہے۔ جب چاہے کھول دے اور جب چاہے بند کردے۔

پس اگر مغرب کی سیاست اس کے حق میں اس لئے مہلک ہے کہ اس کے ساتھ دیانت شامل نہیں تو مشرق کی دیانت اس لئے ناپائیدار اور غیر مستحکم ہے کہ اس کی پشت پر سیاسی طاقت نہیں۔ وہاں اگر فقدان دیانت سے مادی مصائب موت ہلاکت، طوفان زلزلوں وغیرہ کا ظہور ہو رہا ہے، تو یہاں فقدان سیاست سے روحانی خطرات الحاد ، دہریت بے دینی شرک وبدعت وغیرہ کا ظہور ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ صاف ہے کہ جب تک دیانت کے ساتھ سیاسی طاقت اور سیاست کے ساتھ علم واخلاق کی دیانت نہ ہو دنیا کبھی امن وچین کا سانس نہیں لے سکتی۔

اس لئے اسلام نے یہدین کی رہبانیت کو ختم کر کے تو اس کے ساتھ سلطنت ملائی اور سلطنت کی ملوکیت کو ختم کر کے اس کو خلافت الٰہی کا جامہ پہنچایا، جس سے دیانت وسیاست کا ایک حکیمانہ امتزاج قائم ہوا کہ دیانت کی بے مونسی سیاست سے ختم ہوگئی اور سیاست کا جور واستبداد دیانت سے پامال ہوگیا، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

اس جامعیت کی طرف کھلے اشارے فرمائے۔ ایک جگہ ارشاد ہے "اَلْمُلْکُ وَالدِّیْنُ تَوْأَمَانِ." ① "ملک اور دین دو جڑواں بچے ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے"۔ ایک جگہ ارشاد ہے: "بُعِثْتُ مَرْحَمَةً وَّمَلْحَمَةً." ② (حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم) "میں رحمت بنا کر بھی بھیجا گیا ہوں اور جنگ جو بنا کر بھی۔

ایک جگہ ارشاد ہے: "اَنَا الضَّحُوْکُ الْقَتَّالُ" ③ "میں بہت ہنس مکھ بھی ہوں اور جنگ آور بھی"۔ ایک جگہ دوام دیانت کا وعدہ دیا اور ایک جگہ دوام سیاست کا: "لَایَزَالُ مِنْ اُمَّتِیْ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ بِاَمْرِ اللّٰهِ (اَیِ الدِّیْنِ) حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُاللّٰهِ. (اَیِ الْقِیٰمَةُ) ④ اَلْجِهَادُ مَاضٍ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ." ⑤ "میری امت میں ہمیشہ ایک قوم تا قیامت دین کو برپا کرنے والی رہے گی (میری امت میں) جہاد قیامت تک باقی رہے گا۔"

قرآن نے نبوت کی بھی مدح سرائی کی، جو روحانی نعمتوں کا سرچشمہ ہے اور سلطنت کی بھی منقبت نوائی کی جو مادی نعمتوں کا سرمشا ہے۔ ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَآءَ وَجَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا وَّاٰتٰکُمْ مَّالَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ﴾ ⑥

"اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم اتم اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو کہ تم پر ہوا ہے، یاد کرو جب کہ اللہ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے اور تم کو صاحب سلطنت بنایا اور تم کو وہ چیزیں دیں جو دنیا جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دیں"۔

دین، سیاسی نظام کی حیثیت میں...... اسلام نے جیسے دیانات کی بنیاد پانچ اساسی چیزوں کلمۂ توحید، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صیام، حج پر رکھی ہے، ایسے ہی سیاسیات کی بنیاد بھی پانچ ہی اصولی چیزوں پر قائم کی ہے، جماعت، سمع، طاعت، ہجرت، جہاد۔

اسلام نے جہاں اخلاقی نظام قائم کیا جس سے انسانی نفوس، انسانی ذات البین اور قلوب و ارواح کی اصلاح ہو اور اس سلسلہ میں عادات و عبادات، اخلاقیات اور معاملات وغیرہ کے ابواب قائم کئے۔ وہیں سیاسی نظام بھی قائم کیا جس سے بین الملی احوال درست ہوں۔ فتن کا استیصال اور قانون الٰہی کے رواج پذیر ہونے میں کوئی قوی یا ضعیف رکاوٹ پیدا نہ ہو اور اس سلسلہ میں اس نے حدود و قصاص تعزیرات و کفارات، جہاد اور سدِ ثغور کے ابواب بھی پیش کئے۔

---

① علامہ صغانی نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔ الموضوعات للصغانی، ص: ۱، ص: ۲۔ ② حلیة الاولیاء، الجزء الرابع، وهب بن منبه ج: ۴ ص: ۱۰۵ قال ابونعیم: هذا حدیث غریب من حدیث الثوری، تفرد به حسن.
③ یہ حدیث نہیں ہے بلکہ کسی راہب کی حضور کے متعلق پیشن گوئی تھی دیکھئے۔ دلائل النبوة لابی نعیم، ج: ۲، ص: ۱۱. (ومن الانصار فی غزوة احد من الدلائل) ④ الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب سوال المشرکین ان یریهم النبی ﷺ ج: ۱۱، ص: ۳۶۶. ⑤ السنن لابی داؤد، کتاب الجهاد، باب فی الغزو مع ائمة الجور، ج: ۷، ص: ۶۳.
⑥ پارہ: ۶، سورة المائدة الآیة: ۲۰.

اسلام نے امیر المومنین کو جہاں سیاسی احکام کا منفذ نگراں اور امام بنایا وہیں اخلاقی اور دیاناتی امور کا بھی محافظ اور امام بنایا ہے۔ چنانچہ عدالت فوجداری و دیوانی، نظام عسکریت اور دفع مظالم کے ساتھ ساتھ امامت صلوٰۃ امامت جنائز، ذاتیاتی احوال کی اصلاح اور اخلاقی تربیت بھی اس کے متعلق رکھی گئی ہے۔ اس لئے امیر المومنین جہاں مسلمانوں کا بادشاہ ہوگا وہیں بمنزلہ باپ اور مربی و استاذ کے بھی ہوگا تاکہ ان کی دیانت و سیاست دونوں کی نگہداشت کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں کوئی سیاسی قانون بیان کیا گیا ہے وہیں آگے پیچھے کسی نہ کسی عنوان سے خشیت اللہ، خوف الٰہی، طہارت اور توجہ الی اللہ وغیرہ کی طرف بھی متوجہ کر دیا ہے، تاکہ سیاسی الجھنوں میں پڑ کر دیانت سے غافل نہ ہو جائیں۔ اور ایسے ہی جہاں دیانات کا کوئی شعبہ بیان کیا گیا ہے وہیں کوئی نہ کوئی سیاسی دھمکی اور تعذیب دنیا و آخرت کی کوئی نہ کوئی وعید بھی سامنے رکھ دی گئی ہے تاکہ دیانات کے استغراق میں سیاسیات سے غفلت نہ ہو جائے۔

دین اور سیاست کی علیحدگی ...... بہر حال اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں۔ نہ مذہب سے الگ سیاست کوئی چیز ہے اور نہ سیاست سے الگ مذہب کوئی چیز ہے۔ یہ فرق انہی مذاہب میں نکل سکتا ہے، جنہوں نے صرف تعلق مع اللہ کے چند اصول پر بطور تصوف یا جوگیت تہذیب نفس کی سعی کی ہے اور انسان کو دنیا کے تعلقات ولذائذ سے الگ کر کے خدا سے ملانے کی صورت رکھی ہے۔ ان میں ترک دنیا ہی معنی اصل ہے کہ آدمی دنیا کے تمام معاملات، تمام لذتوں اور تمام روابط کو ترک کر کے گھر بار، اولاد و بنیاد عزیز و اقارب تک سے یکسو ہو کر کسی پہاڑ کے گوشے اور دریا کے کنارے بیٹھ کر یاد الٰہی میں مشغول ہو۔ ظاہر ہے کہ وہاں تعلقات کی کثرت اور ہمہ گیری کب برداشت کی جا سکتی تھی۔ لیکن جس مذہب نے تعلق مع اللہ کے ساتھ تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس کے شعبے بھی اسی تفصیل سے پیش کئے ہوں۔ اس کے یہاں یہ قطع تعلقات اور ترک لذات کی رہبانیت نا تمام انسانیت سمجھی جاتی ہو اور ترک دنیا کا مفہوم گوشہ گیری نہ ہو، بلکہ دنیا کے ہجوم میں رہ کر اداءِ حقوق ہو وہ سیاسی اور معاشرتی تعلقات سے اپنے پیروؤں کو کب علیحدہ رکھ سکتا تھا اور اسے رہبانیت کب برداشت ہو سکتی تھی؟

پس اس کے یہاں جیسے دیانات مذہب کا جزو اعظم ہے۔ وہیں سیاسیات بھی مذہب کا جزو اہم ہے اور مذہب اور سیاست کے الگ الگ ہونے کے کوئی معنی نہیں۔ مذہب اور سیاست کی یہ تفریق ایسے ہی غلط ہے جیسا کہ آج مذہب اور سائنس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سائنس نے مذہب کی بنیادوں کو کمزور کر دیا ہے۔ اور یہ دونوں باہم جمع نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ سائنس انہی مذاہب کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی جنہوں نے تمدن کو مٹا کر رہبانیت دنیا میں قائم کی۔ لیکن جو مذہب تمدنی حقوق، تمدنی ضروریات اور وقت کے تقاضوں کے مناسب معاشرتی اقتصادی ضروریات کی تکمیل کا حامی ہو، اسے سائنس سے نقصان تو کیا پہنچتا سائنس اس کی ممد و معاون خادم ہے۔ ایسے ہی سیاست بھی دین کی خادم اور اس کا ایک جزو اہم ہے۔ البتہ اس سیاست کے معنی سیاست عصریہ کے نہیں، بلکہ سیاست شرعیہ کے

ہیں۔ جس کی بنیاد علم واخلاق، تقویٰ وطہارات اور فضائل اعمال پر ہے اور جو رذائل اخلاق واعمال کو مٹانے کے لئے دنیا میں بھیجی گئی ہے نہ کہ ان کی تقویت کے لئے اور بالفاظ دیگر سیاست نبوت مراد ہے سیاست ملوکیت نہیں۔

یہ سیاست مذہب کا جزو اعظم ہے جس سے کسی حال قطع نظر نہیں کی جاسکتی، ہاں مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ ان دونوں میں دیانت اصل اور مقصود بالذات ہے اور سیاست اس کی بقاء واستحکام کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزارہا انبیاء کرام علیہم السلام کے سلسلہ میں دیانات کے ابواب تو سب کو دیئے گئے مگر سیاسیات اور جہاد کی مشروعیت بعض کے لئے ہوئی اور بعض کے لئے نہیں۔ اگر ایک ہی درجہ کے دونوں مقاصد ہوتے تو یہ تفریق ناممکن تھی۔ اسی طرح جن اقوام کو دیانت اور سیاست دونوں دی گئیں جیسے بنی اسرائیل، وہاں بھی اتنی تفریق عموماً دیکھی جاتی ہے کہ انبیاء کا سلسلہ الگ ہے اور سلاطین کا الگ، شاذ ونادر ہی ایک آدھ جگہ جمع ہوا ہے۔ مگر مقصودیت دیانات کی شان وہاں بھی نمایاں رکھی گئی کہ دیانات کا حکم نبی کی طرف سے ہوتا تھا اور اس کی تنفیذ سلاطین اور امراءِ عدل کے ہاتھ سے۔ ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ دونوں شانیں لاکر جمع کردی گئیں۔ آپ بیک وقت خلیفۃ اللہ فی الارض بھی تھے اور مربی دین عالم بھی، مگر اصل دین تھا جو آپ کی سلطنت کا محور مرکز رہا۔ یعنی آپ کی ساری اسلامی سیاست دین کے محور پر گھومتی تھی اور صرف اس لئے تھی کہ اس کی قوت سے اوامر دین نفاذ پذیر ہوتے رہیں اور اجراء وترویج دین میں کوئی رکاوٹ نہ ہونے پائے۔ جس سے دیانت کا مقصود بالذات ہونا اور سیاست کا اس کے حق میں وسیلہ ہونا صاف واضح ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے اس کی تصریح کی ہے: ﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ﴾ [1] "یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے"۔

یہاں تمکین فی الارض یعنی سلطنت کی غرض وغایت دیانت کے شعبوں کو قرار دیا گیا ہے جس سے سلطنت کا ان امور کے حق میں وسیلہ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ جس کا راز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مقصد دنیا میں امانت کا پھیلانا ہے۔ جو ایمان اور امن کی زمین ہے اور جسے انسان کے سوا کائنات ارض وسماء کے کسی بڑے سے بڑے جزو نے بھی قبول کرنے سے کانوں پر ہاتھ دھر لیا تھا۔ اس امانت کی ضد فتنہ ہے جو اس کے حق میں سدِ راہ ہوتا ہے۔ یہ فتنہ کبھی علم کی راہ سے آتا ہے اور کبھی عمل کی۔

علمی فتنہ کا نام فتنۂ شبہات ہے اور عملی فتنہ کا نام فتنۂ شہوات ہے اور ظاہر ہے کہ فتنۂ شبہات جبکہ علم نافع میں مخل ہے، تو وہ جہل کی قسم سے ہوگا اور فتنۂ شہوات جبکہ عمل صالح میں مخل ہے، تو وہ از قسم ظلم ہوگا۔ اس لئے فتنہ مجموعۂ ظلم وجہل ہے اور امانت مجموعۂ علم واخلاق۔ انبیاء کرام علیہم السلام کا مقصد چوں کہ امانت پھیلانا ہے، جس کی راہ میں یہ

[1] پارہ: ۱۷، سورۃ الحج، الآیۃ: ۴۱۔

فتنہ خلل انداز ہوتا تھا۔ تو اس کا دفعیہ ضروری سمجھا گیا اور یہ فتنہ یعنی ظلم وجہل جبکہ انسان میں جبلی تھا، تو جبلت کا بدل دینا اور لوگوں کے خلاف طبع شبہات وشہوات سے انہیں نکالنا کوئی آسان کام نہ تھا کہ بغیر طاقت کے محض وعظ وپند سے پورا ہو جائے۔ اس لئے سیاسی قوت کی ضرورت پڑی، پس طاقت دیانات کے مستحکم کرنے اور ان میں علم و اخلاق نبوت پیدا کرنے کا ایک آلہ اور ذریعہ ہوا، تاکہ خلق خدا امن وسکون کے ساتھ اس علم وخلق سے اپنے مقصد زندگی یعنی طاعت وعبادت الٰہی کے فرائض انجام دیتی رہے۔

اسلامی سیاست اور عصری سیاست کا فرق...... اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی سیاست اور مسلمانوں کی کسی سیاسی جدوجہد کا مقصد وہ کبھی نہیں ہوسکتا جو آج کی عصری سیاستوں میں پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ جس کا تمام تر خلاصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں۔ زمین زر اور ذاتی اقتدار۔ آج اس کے سیاسی اور جنگی اقدامات کی آخری منزل اور حقوق طلبی کا آخری معیار اس کے سوا کچھ نہیں کہ فلاں فلاں خطہ جغرافیائی حیثیت سے چوں کہ فلاں ملک یا قوم کا حق ہے۔ لہٰذا اسے ملنا چاہیے، یا فلاں فلاں رقبہ میں فلاں قوم کا تجارتی نظام قومی یا نسلی یا وطنی حقوق کے ماتحت قائم ہونا چاہئے یا فلاں ریاست پر فلاں شہنشاہی کا اقتدار یا انتداب قائم ہونا چاہئے، ورنہ پھر جنگ ہے۔

ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں زمین، دوسری صورت میں زر اور تیسری میں ایک قوم کا ذاتی اقتدار نکلتا ہے، جسے جنگ کے لئے وجہ جواز اور کافی حجت سمجھ لیا جاتا ہے۔ آج کی دنیا کی دو ثلث آبادی انہیں تین وجوہ جواز سے کٹ مرنے اور سر پھٹول کے عذاب میں مبتلا ہے۔

اسلامی نظام حکومت اور اسباب جنگ...... اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ وجوہ جواز جنگ کی نہیں بلکہ حرمت جنگ کی ہیں، کہ وہاں جنگ یا آویزش کسی خطۂ زمین، کسی تجارتی مفاد یا کسی انسانی اقتدار کے لئے ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ اغراض اس کے نزدیک نہایت خسیس اور بے وزنی ہیں۔ اس کے نزدیک ہر کی زمین یا سرمایہ انسانی اقتدار کسی قوم اور کسی قبیلہ کا حق نہیں کہ اس پر ہجوم کرنے کا اسے حق ہو۔ زمین کے بارے میں ارشاد ربانی ہے: ﴿إِنَّ الْأَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ﴾ ① ”بلاشبہ زمین خدا کی ہے جسے چاہے اس کا وارث بنائے“۔ یہاں زمین کی ملکیت اللہ کے لئے ثابت کی ہے۔ انسان کے لئے نہیں وہ صرف بقدر وراثت حصہ پا سکتا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿إِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيْفَةً﴾ ② ”میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں“۔

یہاں انسان کے لئے خلافت ارضی ثابت کی گئی ہے نہ کہ ملکیت ارضی، یعنی مالک الملک خدا ہے اور یہ اس کی طرف سے نائب ہے، اس کی طرف سے زمین میں تصرف کرسکتا ہے، ذاتی طور پر نہیں۔ مال کے بارے میں فرمایا گیا ﴿وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ﴾ ③ ”اور لوگوں کو اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو دیا

① پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۲۸۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۳۰۔

③ پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۳۳۔

ہے''۔ یہاں سارے مال کو خدا کی ملک بتلایا گیا ہے، جس کے حق میں انسان امین اور وکیل ہے۔ اللہ کی اجازت اور ایماء سے اپنے اور اپنے متعلقین پر خرچ کر سکتا ہے، ذاتی موجبات سے نہیں۔ ایک جگہ فرمایا: ﴿اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ﴾ ① ''اور خرچ کرو اس مال میں سے جو ہم نے تم کو دیا''۔

یہاں رازقیت اللہ کے لیے ثابت کی گئی ہے جو اس کی مالکیت کی دلیل ہے اور انسان کو منفق اور محض خرچ کنندہ کہا گیا ہے جو اس کے صرف خزانچی ہونے کے دلیل ہے۔

حکومتِ الٰہی...... اسی طرح حکومت واقتدار اور انتداب کے بارے میں فرمایا گیا کہ۔ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ ② ''حکم کا منصب سوائے خدا کے کسی کو نہیں''۔ اس سے ایک خدا کی حاکمیت ثابت ہو کر غیر اللہ کی حکمرانی منفی ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾ ③ ...... ''اور کسی ایمان دار مرد اور کسی ایمان دار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دے دیں، کہ ان کو اس کام میں کوئی اختیار رہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا''۔

اس میں آمریت صرف اللہ کے لئے مخصوص کر کے انسان سے نہ صرف آمریت کی نفی ہی کر دی گئی ہے بلکہ اوامر الٰہی کے بعد بندہ کے چون و چرا اور ''لِمَ و کَیْفَ'' کی گنجائش بھی سلب کر لی گئی ہے۔ یعنی امر الٰہی کا نہ ماننا تو بجائے خود ہے اس میں تأمل کرنا بھی عصیان اور کھلی گمراہی بتایا گیا ہے۔

قرآن کے ان تینوں مقامات سے واضح ہے کہ مالکیت، آمریت، اور اقتدار، حکومت صرف خدا کے لئے ہے۔ ساری زمین اور سرمایہ صرف اسی کے حیطہ ملکیت (ملکیتی حدود) میں آیا ہوا ہے۔ اس تعلیم کے بعد کسی مسلم قوم کو جو اس فطری تعلیم سے آشنا ہو، ان اغراض کے لئے کسی سیاسی جدوجہد یا کسی جنگی اقدام کا حق نہیں پہنچتا۔ ہاں وہ اگر کسی زمین کا قصد کریں گے یا کسی قوم پر ہجوم کریں گے تو اپنے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے۔

الحکومت والجہاد...... چنانچہ قرن اول (پہلی صدی) کے جنگی اقدامات کی وجہ جواز یہ یادداشتیں نہ تھیں کہ فلاں خطہ جغرافیائی حیثیت سے عرب میں شامل ہونا چاہئے یا عرب انتداب کسی رقبہ پر ضروری ہے یا عرب تجارت کے لئے فلاں دریا کا کنارہ اس کے لئے مخصوص ہونا چاہئے ورنہ اعلان جنگ ہے، بلکہ کسی رقبۂ زمین پر وجہ جواز جنگ کے لئے تین چیزیں پیش کی جاتی تھیں۔ یا خدا کا دین قبول کرلو۔ یعنی اسلام میں داخل ہو جاؤ جو مجموعہ دیانت و سیاست اور چشمۂ علم واخلاق ہے، یہ نہیں تو خدا کے دین کی شوکت قبول کرلو اور اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے قانون الٰہی کے اقتدار کے نیچے آ جاؤ اور یہ اقوام پر اس لئے شاق بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ غیر اسلام میں کہیں مذہب و

① پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۴۔ ② پارہ: ۱۲، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۴۰۔

③ پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۶۔

سلطنت ایک چیز نہیں- یہ بھی نہ ہو تو خدائی اصول پر کوئی شریفانہ معاہدہ کرلو اور اپنے ملک میں آباد رہو۔ ان میں سے کوئی بات بھی قبول نہ ہو تو یہ اوامر الٰہی سے کھلی بغاوت اور اعلان جنگ ہے اور خدا کے باغی کے لئے ناتبان خداوندی کے پاس کوئی رعایت یا جان و مال کی حفاظت کی کوئی ادنیٰ ضمانت نہیں۔

اسلامی جہاد کی غرض وغایت...... پس اسلامی جہاد اور اسلامی سیاست یا اس کے کسی سیاسی اقدام کی غرض و غایت زمین و سرمایہ یا اقتصادی نظام وغیرہ تو کیا ہوتا، خود مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم کرنا بھی نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اشاعت دین اور محض خدا کی حکمرانی دنیا سے منوانا، اس کے کلمہ کو اونچا کرنا اور صرف اسی کے مستند قانون کو دنیا میں پھیلانا اور اقوام کی صفوف میں نظام ملت کی شوکت قائم رکھنا ہے۔

﴿لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا﴾ ①

آپ اندازہ کریں کہ ان مقدس اور ہمہ گیر مقاصد، اشاعت دین الٰہی، اقامت حکومت الٰہی، حفاظت نظام الٰہی سے دنیا کی کون سی دانشمند قوم اعراض کرسکتی ہے۔ اس میں کسی قوم کے اپنے اقتدار یا مفاد کا سوال ہی نہیں بلکہ صرف اقتدار خداوندی اساسی مقاصد ہے۔ گریز اگر ہوسکتا ہے تو کسی قوم کو کسی دوسری قوم کے ذاتی اقتدار کے تحت میں آنے سے ہوسکتا ہے اور ہونا چاہئے جبکہ انسان، انسان اور اقوام، اقوام سب برابر ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک قوم دوسری قوم پر خواہ مخواہ اپنا اقتدار قائم کرے یا اسے غلام بنانے کے منصوبے گانٹھے۔ لیکن جب ایک قوم اپنے اقتدار کا نہیں بلکہ انکسار کا اعلان کرکے یہ واضح کرے کہ وہ ذاتی اغراض یا مفاد کی خاطر مصروف جنگ ہونا نہیں چاہتی۔ بلکہ صرف اس لیے کہ خدا کا صحیح اور مستند علم اور خدا کے پاکیزہ اخلاق سے دنیا آشنا ہو، اسے ملک گیری اور طمع جاہ وجلال سے کوئی علاقہ نہیں، بلکہ وہ ہزار ملک فتح کرکے بھی اپنی ذوات کے حق میں درویش اور سادہ حال رہنا چاہتی ہے۔ اس کا جنگی مقصد ہوس زر و جواہر نہیں بلکہ زہد و قناعت سے دنیا کو ہمکنار کرنا ہے۔ اس کا مقصد خود وہ نہیں بلکہ اس کا خدا ہے۔

تو یہاں کسی کے ذاتی یا قومی اقتدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کسی قوم کو اس جنگی اقدام کے حق بجانب سمجھنے میں ذرا سا بھی شبہ دامن گیر ہو۔ پس بندوں کی حکومت بندوں پر تو موجب نزاع و فساد بن سکتی ہے لیکن خدا کی حکومت بندوں پر تو جب ہی وجہ نزاع بن سکتی ہے جب خدا ہی کے ماننے سے انکار کردیا جائے۔

ایک لمحہ غور و فکر...... اس لئے آج بھی اگر مسلمان اپنی قومی حکومت، قومی اقتدار یا کسی خاص خطہ زمین پر مخصوص انتداب یا سرمایہ اور اقتصادی نظام یا کسی خاص وطن کا جغرافیائی سوال لے کر کھڑے ہوں گے، تو قطع نظر اس سے کہ یہ مقاصد اسلامی مقاصد نہ ہوں، وہ کسی معقول طریقہ پر ان سوالات کو کسی سے منوا بھی نہیں سکتے اور نہ کسی وجدان صحیح کی روشنی میں خود ہی اپنا اطمینان حاصل کرسکتے ہیں۔ بہرحال کامیابی اور ناکامی تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن نصب العین اور نظریہ اگر صحیح اور موجب اطمینان و تسلی ہو تو ہر اقدام پر کیف اور پرسکون ہوجاتا ہے اور خود

① الصحيح للبخاري، كتاب الجهاد والسير باب من قاتل لتكون كلمة الله... ج: ۱ ص: ۲۲۲ (الطاف سنز).

مطمئن ہو کر آدمی دوسروں کو بھی مطمئن کر سکتا ہے۔اس لئے اگر ہم اپنا نصب العین وہی قائم کر کے جو قرن اول کا تھا۔یعنی قانون الٰہی کی ترویج اور اقتدار حق کی اشاعت،اعزاز نظام دین جن کا خلاصہ وہی تین امور نکلتے ہیں۔

تعلیم احکام،تہذیب اخلاق اور تنظیم اعمال یعنی اتباع اسوۂ حسنہ تو ہمارے ہر دعویٰ میں معنی بھی پیدا ہو جائیں گے اور ہمارا ہر اقدام ذاتی مفاد کی تہمت سے پاک ہو کر دنیا کے نزدیک قابل قبول بھی ہو جائے گا۔نیز کامیابی کی منزل بھی قریب تر آ جائے گی۔

خلافت راشدہ کے بعد......میں جہاں تک سمجھتا ہوں قرون خیر کے بعد اسلام کی بارہ سو سالہ عمر میں جس قدر بھی قومی انحطاط و تنزل یا اقدامات میں جس قدر بھی ناکامی کے آثار نمایاں ہوئے ہیں۔ان کا بنیادی سبب اکثر و بیشتر انہی تین اساسی چیزوں کی قلت یا قوم کے مزاج کا ان تینوں عنصروں کی آمیزش سے خالی رہ جانا یعنی فقدان جامعیت ہوا ہے۔یعنی ناکامی،یا علم کی قلت سے یا اخلاق کی کمزوری سے یا نظام کی ابتری سے پیدا ہوئی ہے۔

چنانچہ خلافت راشدہ اور اس کے تتمہ یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے بعد(جو ان تینوں عناصر کی جامعیت کا مکمل نقشہ اور طوفانی فتوحات کا حقیقی دور تھا)مسلمانوں کے تنزل کے سلسلہ میں اول فتوحات رکیں،پھر ملک ہاتھ سے نکلنے شروع ہوئے،پھر اندرونی کمزوریاں ابھر کر نظم میں ابتری پھیلی اور پھر انجام کار پستی اور زیردستی کے ایام آنے لگے۔

یہ محض اس لئے کہ مسلمانوں کے سامنے منزل مقصود نہ رہی،یا رہی تو راہ مقصود نامعلوم رہی یا راہ بھی معلوم ہوئی تو اس پر چلنے کی اخلاقی طاقت نہ رہی،اور یا وہ بھی رہی تو کوئی چلانے والا مرکز اور امام نہ ہوا جو اپنے علم و خلق سے اسی مقررہ نظام پر انہیں لے چلے اور اگر کوئی ایسا فرد بھی ہوا تو گروہی تعصب نے اس کی پیروی کی اجازت نہ دی۔غرض ان تینوں عنصروں علمی قوت،اخلاقی قوت اور انتظامی قوت کا زوال ان نتائج بد کا موجب بنتا رہا ہے۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کا زوال......تفصیلات کا موقع نہیں،لیکن اصولی طور پر اب اس کے ماننے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہئے کہ ہندوستان کی باگ دوڑ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے انہی تین عناصر کے زوال سے شروع ہوئی۔عالمگیری دور اور فتاویٰ عالمگیری کے فقہی نظام کے بعد بتدریج ان تین بنیادوں میں نقصان آیا،تو رفتہ رفتہ اس ملک پر مسلمانوں کی گرفت ڈھیلی ہونی شروع ہوئی اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں جہالت،ناتربیتی اور بدنظمی کے سبب بالآخر یہ ملک کلیۃً ہاتھ سے نکل گیا۔

حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ......۱۲۴۶ھ میں اللہ کے چند مخلص بندے حضرت سید صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ بریلوی اور حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں اٹھے بڑھے اور شہید بھی ہو گئے۔مگر تمام قوم کی لاعلمی اور ناتربیتی ناکامی کا باعث ہوئی اور اپنے ہی اجزاء ذریعہ شکست بن گئے۔

حضرت قاسم العلوم والخیرات رحمۃ اللہ علیہ......۱۸۵۷ء میں پھر ایک جدوجہد ہوئی۔حضرت مولانا محمد قاسم

صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کی قیادت میں اٹھے اور فتوحات کی لائن پر پڑ بھی گئے۔ مگر وہی قوم کی بے بصیرتی، ناتجربہ کاری اور نا تیاری سامنے آئی۔ ملک تعلیم و تربیت سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ اس لئے نتیجہ صفر کے درجہ میں رہا۔

عصر شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ...... ۱۳۳۹ھ میں حضرت اقدس مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نکل کر میدان تحریکات میں آئے۔ قوم کی طرف سے جوشیلا استقبال ہوا۔ عظمت رفتہ کی بازیافت کے لئے حقیقی تڑپ کے ساتھ قوم اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر تعلیم و تہذیب اخلاق کی قلت نے نتیجہ پھر پردۂ عدم ہی میں مستور رکھا اور فتن و مصائب بڑھتے ہی گئے اور آج جبکہ قدرتی انقلابات کے تحت اقوام کی قسمتوں کے فیصلے ہو رہے ہیں۔ کوئی قوم ابھر رہی ہے اور کوئی گر رہی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت علم و اخلاق اور نظم سے اتنی ہی دور ہے جس قدر کہ سو برس پہلے تھی۔

تحریص عمل...... اس سے انکار نہیں کہ جذبات و عواطف اور میلانات میں تغیر ضرور ہو رہا ہے۔ رفتار زمانہ نے انہیں جھنجھوڑ کر کچھ بیدار بھی کر دیا ہے اور خواب غفلت چھوڑ کر بیداری کی طرف آ بھی رہے ہیں۔ لیکن محض نیند سے جاگ اٹھنا تو کافی نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اٹھ کر منزل مقصود کا راستہ نہ پکڑا جائے اور گامزنی شروع نہ کر دی جائے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ تعمیری رنگ میں انہی عرض کردہ تین بنیادوں کو جو قرن اول کا اصلاحی پروگرام ہے، مضبوطی سے پھر سنبھالا جائے۔ یعنی تعلیم کتاب، تہذیب اخلاق، تکمیل اسوۂ حسنہ۔ جس کو ذرا اور عام عنوانات سے یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ اشاعت دین الٰہی اقامت حکومت الٰہی تنظیم حیات انسانی۔

اشاعت دین الٰہی

تعلیم:......اشاعت اسلام اور حفاظت دین کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز تعلیم ہے۔جس مذہب کی تعلیم باقی نہ رہے وہ مذہب بھی باقی نہیں رہ سکتا۔اس سلسلہ میں ایک مکمل تعلیم ہے جس سے جامع علماء پیدا ہوں اور اسلام کی حفاظت و مدافعت ہر ڈھنگ اور ہر رنگ سے کر سکیں۔یہ تعلیم مدارس ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے،جس کا تکفل اہل مدارس نے کیا ہوا ہے۔ایسے دینی مدارس ملک میں قائم ہیں مگر کم۔کمی حوصلہ افزائی کی کمی کی وجہ سے ہے۔اگر قوم اس ضرورت کا احساس کرے تو شہر میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے دینی مدارس قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ جس میں جامع علماء مسند درس پر بیٹھ کر مسلمان نونہالوں کو کتاب وسنت اور اس کے فقہی قانون سے واقف بنائیں اور ہر فتنہ کی مدافعت کر سکیں۔

قاسمی علوم اور فلسفہ......میں اس میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ تعلیم کے قدیم منہاج کو باقی رکھ کر نئی ضروریات نظر انداز نہ کی جائیں اور انہیں سامنے رکھ کر تعلیم کا پروگرام بنایا جائے۔صورت ایسی ہو کہ دعاوی قدیم ہوں اور دلائل جدید تاکہ پرانے دعاوی نئی دنیا کے دماغوں میں اتر سکیں۔

مرکز علوم دارالعلوم دیوبند......ہم اپنے تجربہ اور سالہا سال کے نتائج فکر کے لحاظ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسی جدید فکر جس میں منقول اسلام کو معقول اور پھر معقول کو محسوس کر کے دکھلا دیا گیا ہو۔اس جدید دور میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند نے پیش فرمایا ہے جو خاندان ولی اللہ کی حکمتوں کا نچوڑ اور اس حکمت کو اگر قصر فرض کیا جائے،تو یہ اس میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔یہ فکر شریعت،طریقت اور سیاست کے مجموعی امتزاج سے پیدا شدہ ہے اور اس کے منہاج پر چل کر ذہن میں اسلام کا جامع تصور قائم ہوتا ہے۔اس جامع تصور کا تعلیمی مرکز دارالعلوم دیوبند ہے۔ان بزرگوں کے عام فکر کے ساتھ خصوصی طور پر ان کی مخصوص کتابیں جیسے حجت اللہ البالغۃ اور تقریر دل پذیر وغیرہ داخل درس بھی ہیں۔

مستقبل کا تعلیمی پروگرام......اس حکمت شرعیہ کے ساتھ وہاں کے ذمہ داروں کا یہ بھی قصد ہے کہ حکمت عصریہ کے ضروری مضامین مثل قدیم علم السیاست،مبادیات سائنس،سیاسیات حال کے اصول،اقتصادیات وغیرہ بھی داخل نصاب کر دیئے جائیں تاکہ طلباء اپنی مخصوص حکمت کے ساتھ رائج الوقت نظریوں میں بھی بصیرت پیدا کر کے صحیح طور سے ان پر رائے زنی کر سکیں۔

بہر حال یہ کام مدارس کا ہے۔قوم کی طرف سے اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے تاکہ زیادہ سے زیادہ صحیح الخیال اور صحیح الاحوال علماء پیدا ہوں اور قوم کی رہنمائی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جائے۔

مسجدی تعلیم...... مگر یہ ظاہر ہے کہ مدارسی تعلیم کا دائرہ بہر حال محدود ہے، نہ ہر شخص مکمل عالم بننا چاہتا ہے اور نہ اس کی ضرورت بھی ہے۔اس لئے مدارسی تعلیم کے علاوہ ایسی ابتدائی تعلیم کی ضرورت پھر بھی باقی رہتی ہے جس سے عوام مسلمین کے تمام بچے مستفید ہو سکیں اور ضروریاتِ دین کا علم ہر مسلم گھرانے میں پہنچ جائے۔اس مسئلہ کا حل ابتدائی مکاتب ہیں جو ہر ہر محلہ کی مسجدوں میں قدیم طریقہ پر قائم ہوں اور ان کا تعلق بڑے اداروں سے رہے، ایسے مکاتب نہ صرف شہروں اور شہروں کے تمام محلوں میں ہوں، بلکہ دیہات میں بھی جا بجا قائم ہونے ضروری ہیں۔مسلمان زمیندار اپنے اثرات سے دیہات کی تمام مساجد میں ایسے مکاتب قائم کر دیں جن میں قرآنی تعلیم کے ساتھ اردو کے ایسے مختصر رسالے داخلِ درس کر دیئے جائیں، جو ضروریاتِ دین، عقائد فرائض، اخلاقیات، معاملات و معاشرات اور ابتدائی حساب کتاب کے مسائل پر حاوی ہوں۔

درسِ قرآن...... بہر حال خواص کی تعلیم مدارس سے اور بچوں کی تعلیم مکاتب سے پوری ہو جاتی ہے۔لیکن عوام رہ جاتے ہیں۔اس لئے اس کی شکل مساجد میں درسِ قرآن حکیم کی ہے۔جس میں قرآن کریم کا عام فہم اور سلیس ترجمہ سنایا جائے اور بہ ذیلِ ترجمہ فقہ کے عملی مسائل موقعہ بموقعہ بیان کئے جائیں تاکہ عوام بھی غافلِ محض اور جاہلِ صرف نہ رہ جائیں اور ان میں علم کا شوق اور عمل کا جذبہ پیدا ہو۔

تبلیغ...... لیکن تعلیم خواہ مدارس کی ہو یا مکاتب و مساجد کی، بہر حال پھر ایک محدود دائرہ رکھتی ہے اور صرف اسی حالت میں پایہ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے کہ طالب علم ان اداروں اور مکاتب میں آئیں اور کچھ لے کر جائیں۔ظاہر ہے کہ اس صورتِ حال سے قوم کی تعلیم عام اور دین کی صلائے عام کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔اسی لئے اس کے ساتھ اس کی بھی اشد ضرورت ہے کہ معلمین دین لوگوں کی طلب کا انتظار ترک کر کے خود ہی تعلیم دین کی طلب لے کر نکلیں اور لوگوں کے کانوں تک کلمۂ حق پہنچائیں اسی کو شرعی اصطلاح میں تبلیغ کہتے ہیں۔جو دین کا ایک اہم اور بنیادی مسئلہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کا اصلی اور حقیقی ورثہ ہے۔

تبلیغ ایک اجتماعی مؤثر کی حیثیت میں...... تبلیغ ہی ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے ہمیشہ اقلیت و اکثریت کا فیصلہ کیا ہے۔مکہ میں کلیت کفار کی تھی، تبلیغ نبوی سے اولاً مسلم اقلیت پیدا ہوئی، پھر اکثریت اور پھر کلیت بن گئی۔مدینہ میں بھی کلیت غیر مسلموں کی تھی۔ابتداءً جرأ عقبہ والی تبلیغ سے اقلیت بنی، پھر اکثریت ہوئی اور رفتہ رفتہ کلیت۔ یہاں تک کہ حجاز میں اقلیت و اکثریت کا سوال ہی باقی نہیں رہا اور تبلیغ نے قدرتی طور پر اس کا حل کر دیا۔

ایران میں فتوحاتِ ملکی کے ساتھ تبلیغ داخل ہوئی تو وہی مسلم اقلیت سے اکثریت اور پھر کلیت پیدا ہوگئی۔ غرض جن ملکی فتوحات میں تبلیغِ دین اور نشر و اشاعتِ اسلام کا مقصد سامنے رہا ہے وہیں مسلمان، مسلم و غیر مسلم

کشاکشی سے نجات پا گئے اور جہاں محض ملکی فتوحات ہو کر رہ گئیں اور روحانی فتوحات سے آنکھیں بند کر لی گئیں۔ جو تبلیغ سے ممکن تھیں، وہیں یہ کشمکش قائم ہے۔

مسلم سلاطین کا قصور..... اگر مسلم سلاطین ہند اس بنیادی مسئلہ کو سامنے رکھتے تو آج صوبوں کی اقلیت و اکثریت کے وہ متنازع فیہ مسائل پیدا نہ ہوتے جو ہو رہے ہیں اور جنہوں نے مسلم غیر مسلم آویزش ہی نہیں۔ بلکہ باہم مسلمانوں میں بھی اختلاف کی ایک وسیع خلیج حائل کر دی ہے۔

نقطۂ اتحاد..... بہر حال اس کا حل بھی مسئلہ اقلیت پر بحث سے نہیں بلکہ تبلیغ سے نکل آئے گا۔ اگر کام شروع ہو جائے تو کام کی برکات نتائج خود ہی سامنے لے آئیں گی۔ کاش مسلم جماعتیں اسی ایک مسئلہ کو اپنا مابہ الاتحاد بنالیں اور مل کر متحدانہ عمل شروع کر دیں۔ بہر حال اتحاد کسی متحدہ نصب العین سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں کی تعلیم اور تبلیغ کا مسئلہ متفق علیہ ہے جس سے کسی مسلمان فرد یا جماعت کو اختلاف نہیں ہو سکتا، تو کیا اتحاد کے دائرہ میں آنے کے لئے یہ عرض کردہ مسائل مقدمہ اور تمہید نہیں بن سکتے۔ میرے خیال میں بن سکتے ہیں اور انہیں بنالیا جائے اور اسی سے تنظیم ملت کا آغاز کر دیا جائے، جو آئندہ دوسرے مسائل میں بھی اجتماعی زندگی کے راستے ڈال دے گی۔

ان مبلغین دین کے لئے اگر استغناء کی صورتیں پیدا کر دی جائیں تو وہ ان کی تبلیغ میں موثر ہوں گی۔ انبیاء علیہم السلام کے تبلیغی اسوہ کا جزو اعظم یہ اعلان ہوتا تھا کہ: ﴿وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① ”اور میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اجرت نہیں چاہتا۔ میرا اجر تو اللہ رب العالمین پر ہے“۔

اس کے لئے قوم کے سرمایہ دار حضرات تعلیمی مکاتب کے ساتھ کچھ معمولی صنعتی مکاتب بھی قائم کر دیں جس سے مسلم عوام اپنے خطہ کے مناسب ایسی صنعتیں سیکھ سکیں۔ جن کی مقامی تمدن میں ضرورت ہے اور اس سے اپنے استغناء کی حفاظت کر سکیں۔ اسی کے ساتھ ان مکاتب صنائع کو اگر تجارتی اصول پر قائم کیا جائے اور اس کی تدریجی آمدنی میں اس کی بھی رعایت رکھی جائے کہ جو مبلغ کسی صنعت میں مہارت پیدا کر کے نکلے اور حاجت مند ہو تو اسی فنڈ سے اسے اس قدر سرمایہ بطور قرض دیا جائے، جس سے وہ اپنا کاروبار مختصر پیمانے پر کھول سکے اور اسی ضمن میں تبلیغ کے فرائض انجام دیتا رہے۔ تو یہ صورت بہت حد تک تبلیغ میں معین ثابت ہوگی اور مبلغین کے وقار کے لئے محافظ بن جائے گی۔

طریق تبلیغ..... تبلیغ میں اسی اسوۂ حسنہ کے نقش قدم کو مشعل راہ بنایا جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً اختیار فرمایا اور قرآن حکیم نے اسے اصولاً پیش کیا یعنی تبلیغ الاقرب فالاقرب (جو قریب سے قریب تر ہو) کے قاعدہ سے ہو۔ اولاً ایک شخص اپنے نفس کو اسلام سے آراستہ کرے پھر اپنے اہل بیت کو، پھر اہل قربت کو، پھر اہل شہر کو، پھر مضافات کو اور پھر ملک کو۔

یہ صورت حال اس طرح سہل ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کی ہر بستی میں یہ اصول پہنچ جائے اور ہر بستی کا مبلغ اسی

---

① پارہ: ۱۹، سورۃ الشعراء، الآیۃ: ۱۰۹۔

تدریجی اصول تبلیغ کو اختیار کرے تو ہر جگہ یہ تدریجی رفتارِ تبلیغ قائم ہو کر تبلیغ کو ہمہ گیر بنا دے گی۔ یہ تبلیغ جلسوں کی صورت میں نہ ہونی چاہئے بلکہ خاموش طریقہ پر عملی شکل میں۔

تذکیر...... اسی کے ساتھ تذکیر سے بھی اغماض نہ کیا جائے یعنی عام جلسوں کے ذریعہ مقرر تقریریں کر کے اصل مقصد کی یاددہانی کریں۔ موعظت ونصیحت کا بازار گرم ہو کہ ﴿وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ.﴾ ①
''بار بار یاددہانی کرو۔ کیوں کہ یاددہانی ایمان داروں کو نفع دیتی ہے''۔

لیکن یہ تعلیم خواہ مدارس کی ہو یا مکاتب کی، مساجد کی ہو یا تبلیغی رنگ کی۔ بہر صورت اس میں ایک جزو اہم اور لازمی رکھا جائے اور وہ مسلمانوں کو ان کے ماضی سے باخبر کرنا اور ان کی شاندار روایات سلف سے انہیں آشنا بنانا، جس کا مرکز ومحور سیرت مقدسہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہو اور اسی کے ساتھ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی ان کے سامنے لائی جائے۔

یہ دو صورتیں ان کے دل ودماغ اور روحوں میں انقلاب پیدا کر دیں گی اور ان میں آگے بڑھنے کا ولولہ خود بخود ابھر جائے گا۔ بشرطیکہ پڑھانے والا ان سیرتوں سے خود متاثر اور ان کے بنیادی نقطوں سے واقف کار ہو۔

دوسرا اہم جزو جس کا خصوصیت سے ان بچوں اور بڑوں کو تعلیم وتبلیغ اور درس وتذکیر میں سکھایا جانا ضروری ہے یہ ہے کہ: ''دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا'' اور ''دنیا میں اسلام سے روکنے کی کیا کیا تدابیر عمل میں لائی گئیں''؟

ان دونوں مضمونوں کا قدرتی ثمرہ ایک تو یہ ہوگا کہ نوجوانوں میں اشاعت اسلام کا جذبہ پیدا ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ اشاعت دین کے ڈھنگ اور تبلیغ کی بنیادیں معلوم ہوں گی اور اسی کے ساتھ موانع تبلیغ کی تفصیلات بھی سامنے آجائیں گی، جن پر قابو پالینے کا راستہ بہ سہولت سامنے آسکے گا۔

عسکریت...... ان تمام تعلیمات کے سلسلہ میں مدارس ومکاتب وغیرہ میں ایک اہم جزو کی اشاعت وترویج بلکہ عملی مشق وریاضت کرائے جانے کی شدید ضرورت ہے۔ اور وہ عسکریت کی روح ہے جو مسلمانوں کا قدیم اور روایتی جوہر ہے۔ مگر جسے آج کے عیش افزا تمدن اور مخالف طاقتوں کی پالیسیوں نے سست اور معطل بنا دیا ہے۔

اسی سلسلہ میں جہاں جسمانی حیثیت سے ورزش، سپہ گری، لکڑی بازی، نیزہ بازی، گدکا اور بنوٹ وغیرہ کھلائے جانے کی ضرورت ہے، وہیں نظری حیثیت سے نظری اسلحہ بازی پر بھی کماحقہ مطلع ہونے کی ضرورت ہے کیوں کہ آج کل کی جنگ اعصابی جنگ ہے۔ خیالات پر اثر ڈال کر صلح وجنگ کا میدان ہموار کیا جاتا ہے۔ اس لئے نوجوانوں میں سیاسی اور نظری حیثیت سے ایسا شعور پیدا کئے جانے کی ضرورت ہے جس سے وہ خیالاتی حربوں سے متاثر ہونے کی بجائے ان کی بنیادوں کو سمجھ سکیں اور یہ پرکھ سکیں کہ کن سے خیالات کہاں سے آرہے ہیں اور کون سا پروپیگنڈہ کہاں سے چلا ہے۔ اس کا منشا کیا ہے اور وہ کس رخ پر مسلمانوں کو ڈالنا چاہتا ہے اور اس کا دفعیہ کیا ہے۔

پس آج کی عسکریت کے لئے جہاں بقدر ضرورت استطاعت عملی فنون حرب یا بدنی استعداد بہم پہنچانے کی

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۵.

ضرورت ہے۔ وہیں ان فطری فنونِ جنگ سے بھی باخبر ہونے کی ضرورت ہے۔ جنہیں آج کی اصطلاح میں ڈپلومیسی اور اسلام کی اصطلاح میں خدعہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کی اطلاع تاریخ سیاست پر عبور کرنے سے ہوسکتی ہے اور اس کی تقویم اور اصلاح تاریخ شریعت پر عبور کرنے سے ہوسکتی ہے، جس کی معلومات کم از کم معلمین، مبلغین، مذکرین اور مدرسین کو ایک حد تک ہونی ضروری ہے۔ یہ تعلیمی تو عیتوں کا اجمالی نقشہ ہے جس سے قرآنی نظریات امت میں پھیل سکتے ہیں۔ لیکن علم کے بعد عمل اخلاقی طاقت سے ہوتا ہے۔

تزکیہ نفوس اور اصلاح عالم...... اس لئے تہذیب اخلاق تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے اگر اخلاقی کریکٹر بلند نہ ہو تو علم کی روشنی ہی کیا نفع پہنچا سکتی ہے۔ اخلاق عمل کی مخفی طاقت ہیں، اگر یہ طاقت مضمحل ہو تو علم بلا عمل کیا کارآمد ہوسکتا ہے؟

اس لئے اخلاقی تربیت ناگزیر ہے۔ جس کے لئے مسلمانوں کو مجاہدہ اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ اخلاق کے اعتدال کے لئے محنت و مشاق کی حاجت ہے۔ جس کے طریقے اور تدابیر فن تصوف میں مدون ہیں اور جن کو مشائخ حقانی ہی بروئے کار لا سکتے ہیں، جبکہ ان کے اپنے قلوب مزکی اور اس راہ تزکیہ پر چلے ہوئے اور پڑے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کی تبلیغ، اور اسلام کی اشاعت میں جس قدر بھی حصہ ہے وہ اخلاقی کریکٹر کا ہے۔ مسلمانوں کا صدق و عفاف، للہیت و بے نفسی، ایثار و تواضع اور معاملات کی صفائی دیکھ کر قلوب ان کی طرف خود بخود جھک جاتے تھے۔ آپ کا یہ سندھ ہندوستان میں اسلام لانے کا پہلا دروازہ ہے۔

صورت کا اثر سیرت پر...... مؤرخین لکھتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہ و تابعین جب سندھ کے بازاروں سے گزرتے تھے تو لوگ ان کی صورتیں دیکھ دیکھ کر اسلام قبول کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہوسکتے"۔

اس لئے اشاعت دین الٰہی کے لئے کردار اور کریکٹر اصل چیز ہے جو بغیر تہذیب اخلاق کے ناممکن ہے۔

ادھر ممالک کا انقلاب بھی درحقیقت اخلاقی انقلاب کے تابع ہے۔ اگر ذہنیتوں میں سے غلامی نکل جائے تو باہر سے بھی رفع ہو جائے۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ ① "خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت بدلے"۔

خانقاہیں...... پس نفوس کی اصلاح عالم کی اصلاح ہے اور اس کے معنی اخلاق نفسانی کی تہذیب اور تعدیل کے ہیں جس کے لئے مجاہدہ وریاضت درکار ہے۔ یہ کام خانقاہوں میں ہوتا تھا۔ مشکل یہ ہے کہ آج کل خانقاہیں باستثناء چند، عامۃً دوکانداری کے اصول پر قائم ہوگئی ہیں۔ رسمی گدیاں ہیں جن میں مریدوں سے تحصیل وصول (چندہ) کے سوا کسی تربیت کا کام جاری نہیں۔ حضرات مشائخ کے لئے اولاً تو یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے نفوس کو تمام مادی آلائشوں سے صاف کر کے اپنے متوسلین کو حقیقی تہذیب سے آراستہ کریں۔ لیکن اگر رسمی مشائخ اس کے لئے تیار نہ ہوں تو پھر میں عوام کو مشورہ دوں گا کہ وہ ان کے نذرانے بدستور قائم رکھ کر کہ بہر حال ان کے بزرگوں کی نسبتوں کا بھی حق ہے

---

① پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۱۱۔

کہ ان کی اولاد کی خدمت کی جائے ایسے مشائخ حقانی کی طرف رجوع کریں۔ جو اصلاحِ نفس اور تہذیبِ اخلاق کا کام کرتے ہوں۔ یعنی نذریں تو انہیں ہی دیں مگر مسائل طریقت حقیقی مشائخ سے دریافت کر کے اپنے باطن کی اصلاح کریں۔ بیعت وارشاد کے سلسلہ کو قائم کریں۔ ذکر اللہ سے غافل نہ رہیں۔ توبہ واستغفار کو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی طرح اپنا شعار بنائیں۔ اپنے اعمال کا تفقد اور نفوس کا محاسبہ کریں۔

علاوہ ازیں اغراضِ نفسانی سے نفوس کو صاف کریں تاکہ قوم کی گاڑی آگے چلے۔ ورنہ اس وقت علم کی کثرت کے باوجود اخلاقی کمزوریوں، جاہ وجلال کی ہوس، نفاق، تملق اور چاپلوسیوں کی خوئے بدنے پوری قوم کو گندہ بنا رکھا ہے۔

اس لئے تہذیب نفس کو کوئی رسمی بات خیال نہ کیا جائے۔ بلکہ حقیقی پیمانہ پر انجام دیا جائے کہ یہ بھی تعلیم کتاب کا شعبہ اور ایک اسلامی فریضہ ہے لیکن ابتدائی اور ہمہ گیر کام امر بالمعروف سے ہوتا ہے۔

یعنی ہر ایک مسلمان اپنے اور دوسرے مسلمان کے ایمان کا تفقد اور تحفظ کرے، جزوی خرابیوں پر روک ٹوک کرتا رہے۔ خلافِ شریعت امور دیکھ کر صبر نہ کرے بلکہ پیار ومحبت سے نصیحت کرے اور مخاطب کے دل کی راہ درست کرنے کی ہمدردانہ سعی سے دریغ نہ کرے۔ ایسی روک ٹوک اور دیکھ بھال میرے نزدیک ایک مسلمان سیاسی کی سیاست ہی کا جزو اصلاحِ اخلاق ہے۔ ورنہ اس کی سیاست بھی اپنے حقیقی نتائج تک نہیں پہنچا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جن فلسفی ریفارمروں (مصلح) نے سیاست کی بحثیں کیں اور وہ عملاً سیاست میں پڑے۔ انہوں نے بھی اپنے سیاسی پروگراموں کا ابتدائی باب عقائد واخلاق کی اصلاح کو قرار دیا ہے۔ یہ جداگانہ بات ہے کہ انہوں نے طریقِ اصلاح میں الہام کی بجائے محض اپنی عقل کو کافی سمجھا ہے۔ پس سیاسی مسائل میں تہذیبِ نفس سے چارہ کار انہوں نے بھی نہیں دیکھا۔

خلاصۂ نقاط بحث اور قرآن حکیم...... بہر حال یہ ضروری شعبے اشاعتِ دینِ الٰہی کے عنوان کے نیچے آ جاتے ہیں جن کی بنیاد تعلیم کتاب ہے۔

قرآن نے ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ﴾ سے تعلیم کی ضرورت ﴿بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ سے تبلیغ کی ضرورت ﴿وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ① سے تذکیر کی ضرورت اور ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ② سے تعلیم عسکریت کی ضرورت اور ﴿وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ﴾ ③ اور ﴿يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ﴾ ④ سے تعلیم صنعت وحرفت کی ضرورت جو آج کی سائنس کا عملی موضوع ہے۔ ﴿وَيُزَكِّيْهِمْ﴾ ⑤ سے تصفیۂ باطن کی ضرورت ﴿وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ⑥ سے خوبیوں کو پھیلانے اور خرابیوں کے دفع کرنے کی ضرورت اور حدیث (اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ لِكُلِّ مُسْلِمٍ) ⑦ سے جزئی روک

---

① پارہ: ۲۷، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۵۵۔ ② پارہ: ۹، سورۃ الانفال، الآیۃ: ۶۰۔ ③ پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۸۰۔ ④ پارہ: ۲۲، سورۃ سبا، الآیۃ: ۱۳۔ ⑤ پارہ: ۲۸، سورۃ الجمعۃ، الآیۃ: ۲۔ ⑥ پارہ: ۲۱، سورۃ لقمان، الآیۃ: ۱۷۔ ⑦ الصحیح للبخاری، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ الدین النصیحۃ للہ ولرسولہ، ج: ۱، ص: ۲۵۔

ٹوک اور نصیحت کی ضرورت کھلے الفاظ میں ظاہر فرمادی ہے، جس پر صرف عمل ہی کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ پروگرام بنا بنایا موجود ہے، ہاں پروگرام کے لئے سب سے پہلی چیز نصب العین ہے تاکہ قلوب کے لئے کوئی نظری مرکز پیدا ہو جائے اور وہ یکسو ہو کر عملی دنیا میں آسکیں۔

اقامت حکومت الٰہی ...... سو ظاہر ہے کہ ہر ایک نصب العین میں رائیں دو ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس نصب العین میں ایک کے سوا دوسری رائے کی گنجائش نہیں کہ ہم سب کا حاکم و بادشاہ خدا ہے۔ اس نظریہ سے اختلاف وہی کرسکتا ہے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کا منکر ہو۔ اس لئے قومی اتحاد کے پروگرام کا جامع نقطہ اس کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام نے سب سے پہلے اللہ کی ذات واحد کو بطور مرکز قلوب پیش کیا تاکہ تمام قلوب سب سے کٹ کر اس ایک پر جمع ہو جائیں کہ توحید سب سے بڑا مرکز اتحاد ہے۔ آج کے اختلافات درحقیقت توحید اعتقادی یا توحید عملی ہی کی کمزوری سے پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر ہر عمل میں انسان سب سے بیگانہ بن کر صرف ایک خدا کے لئے اپنا مرنا اور جینا متعین کرلے تو وہ سب سے متحد ہو جائے گا اور سب اس سے متحد بن جائیں گے۔

ورنہ جس حد تک شرک آتا جائے گا اسی حد تک انسانوں میں پراگندگی بڑھتی رہے گی۔ کیوں کہ مرکز قلوب واحد نہ رہے گا۔ اس لئے اس کی واحد ذات، اسی کے واحد کلام، اسی کے واحد کعبہ، اسی کے واحد رسول کی طرف تمام امت کو علمی، اعتقادی اور عملی دعوت دی گئی ہے۔ تاکہ دلوں پر اور پھر دلوں سے باہر پورے عالم بشریت پر ایک اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم ہو جائے۔ پس پورے دل و دماغ سے ذات الٰہی پر جماؤ حکومت الٰہی کا پہلا قدم ہوگا۔ جس کے بغیر اقامت حکومت الٰہی کا دعویٰ محض زبانی دعویٰ ہوگا جس کی کوئی اصلیت نہ ہوگی۔

پھر قانون الٰہی "کتاب اللہ" کی پیروی اور اخلاق الٰہی سے متخلق (اخلاق یافتہ) ہو کر اس قانون پر چلنا اور اسے چلانا حکومت الٰہی کا دوسرا قدم ہے۔ کیوں کہ جب تک بادشاہ کے اقتدار اور قانون کا علم نہ ہو، اس کی حکومت پوری طرح دلوں پر مسلط نہیں ہوسکتی اور نہ ہر شعبۂ زندگی میں وہ مشعل راہ بنایا جاسکتا ہے۔ اسی کے ساتھ پھر اپنی خصومات اور منازعات میں اس کو حکم بنانا حکومت الٰہی کا تیسرا قدم ہے۔ جس کی شکل یہ ہے کہ ہر محلہ میں غیر رسمی طور پر اسلامی عدالت قائم ہو۔ ایک مستند عالم جو فقہ اسلامی کا ماہر ہو، ہمارے روزمرہ کے نزاعات میں فیصلہ کردے۔ اس تحکیم سے جب کہ ہم نے مالک الملک کو حکم بنادیا ہو آپ اندازہ کریں کہ فیصلہ کس قدر اطمینان بخش اور کتنا سہل اور مالی مصارف اور کچہری کی بادوڑی سے کس درجہ پاک ہوگا؟ البتہ مہم مسائل جو قوت کے بغیر طے نہ ہو سکیں، گورنمنٹ سے محکمۂ قضا کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے جس کے لئے متحدہ سعی کی ضرورت ہے۔ حکومت الٰہی کا چوتھا قدم ہے۔

حکومت الٰہی اور قانون الٰہی ...... کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے جب کہ ہم حکومت الٰہی کے مدعی ہوں کہ ہم قانون الٰہی کو جو حکمت الٰہی کا مظہر اتم ہے۔ نماز روزہ سے زیادہ نکاح وطلاق تک محدود نہ رکھیں۔ بلکہ اپنے گھربار، جائداد و املاک اور عام معاشرتی و اخلاقی سلسلوں میں بھی اس مقدس قانون کو مشعل راہ بنائیں؟ اور اس کے بالمقابل رواج

کی جہالتوں میں نہ پھنسے رہیں۔ اگر حکومت الٰہی کے ادعاء کے بعد بھی ہم اپنی طرف سے بطوع ورغبت رواج پسندی اور شرعی قانون سے لاپرواہی قائم رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا نام قانون الٰہی سے بغاوت نہ رکھا جائے۔

پس ایسی صورت میں جب کہ ایک قوم خود اپنے بادشاہ کے قانون سے منحرف اور بغاوت میں ملوث ہو، وہ حکومت الٰہی کے عنوان کی دعویدار کس منہ سے ہو سکتی ہے؟

حکومت الٰہی کے سلسلہ میں یہ چار ابتدائی قدم ہیں۔ ان کے ذریعہ عمل کا نقش قدم قائم ہو کر آئندہ دوسرے قدم بھی اس سلسلہ میں اٹھائے جا سکتے ہیں جس سے شعائر اللہ کی عظمت کا دنیا میں سکہ رواں ہو۔ مگر

ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مکانے دارد

حفاظت نظام زندگی...... "آزادی" اس نصب العین (حکومت الٰہی) کے ماتحت اب سوال زندگی گزارنے کا ہے۔ سوال کے لئے سب سے مقدم اور سب سے آخری چیز جذبۂ آزادی ہے، جو دلوں کے رگ وپے میں خون کی طرح دوڑ رہا ہو۔ کیوں کہ غلامی کے جذبہ یا اس پر قناعت کے ساتھ کوئی نصب العین اور کوئی نظریہ بھی بروئے کار نہیں لایا جا سکتا۔ جذبۂ آزادی کے بعد زندگی کو آزاد، ضمیر کو آزاد اور عمل کو ہر رنگی ماحول کے اثرات سے آزاد کر دینے والا پروگرام وہی اسوۂ حسنہ ہے۔ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منظم اور مقدس زندگی کا ایک شرعی عنوان ہے۔ یہ پاک زندگی حکومت الٰہی کا عملی نمونہ اور ایک کی غلامی کر کے سب سے آزادی حاصل کر لینے بلکہ سب پر آقا ہو جانے کا ایک مکمل نقشہ ہے۔ ساری آزادیاں اس میں پنہاں ہیں۔ آزادی ضمیر اس کا پہلا قدم ہے کہ قلب پر غیر اللہ کا کوئی رعب اور کوئی ادنیٰ خوف باقی نہ رہے۔

﴿اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَیَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِیْبًا﴾ ① ﴿وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ ② "یہ (انبیاء) سب ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغام پہنچایا کرتے تھے اور اللہ سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے اور اللہ حساب لینے کے لئے کافی ہے، پھر سچ قول اور سچ عمل کے اظہار میں کسی کی ملامت کا خطرہ باقی نہ رہے۔ (دشمن حق کے مقابلہ میں کوئی ادنیٰ رقت یا لین محسوس نہ کریں)"۔ ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ﴾ ③ "کفار پر سخت اور آپس میں مہربان"۔

بہر حال صلہ رحمی، تعاون باہمی، ایثار مروت، ہمدردی ومحبت، غریبوں کی مدد، چھوٹوں پر رحمت، بڑوں کی توقیر، علماء سے حیا، بزرگوں کی تعظیم، اطعام طعام، تحیہ وسلام، عبادت الٰہی، شفقت علی الخلق، پڑوسیوں کی خبر گیری، یتامیٰ ومساکین کی اعانت، بیماروں کی عیادت، جنازوں کی مشایعت، مظلوموں کی دادرسی، ظالموں کی بیخ کنی، اداء حقوق، دفع مظالم، سادگی بے تکلفی، قناعت وزہد، حب آخرت، طلب حق، انصاف وحق پرستی، امت مرحومہ کے

---

① پارہ: ۲۲، سورۃ الاحزاب، الآیۃ: ۳۹. ② پارہ: ۶، سورۃ المائدۃ، الآیۃ: ۵۴.

③ پارہ: ۲۶، سورۃ الفتح، الآیۃ: ۲۹.

جماعتی مفاد کی کلی حفاظت وغیرہ، وہ ابواب ہیں جو اسوۂ حسنہ اور مقدس زندگی کی موٹی موٹی سرخیاں ہیں اور جن کا شیریں پھل آزادی و تنظیم ہے۔

اس اسوہ حسنہ کی خاصیت یہی ہے کہ قومی منزلی شخصی اور جماعتی افتشار رفع ہوتا ہے۔ غلامی کا فور ہو جاتی ہے۔ آزادی مذہب، آزادی ضمیر اور آزادی علم و عمل حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر اس اسوۂ حسنہ کے عالم جو علماء امت ہی ہو سکتے ہیں اپنی جماعتی قوت سے امت کو منظم کرنا چاہیں تو اسی اسوۂ حسنہ کو سامنے لاکر باآسانی کر سکتے ہیں، کہ وہ اس حقیقی تنظیم کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اگر اس نظم زندگی کے ساتھ ابتدائی دو عنوانوں ''اشاعت دین الٰہی،، اور'' اقامت حکومت الٰہی'' کی عرض کردہ دفعات شامل کر لی جائیں تو قوم اسی طرح عروج پر پہنچ سکتی ہے۔ جس پر ایک دفعہ قرون اولیٰ میں پہنچ چکی ہے۔

پروگرام کا یہ حصہ تعمیری ہے جس کا تمام تر رنگ شرعی ہے۔ مگر وقت کے تمام سیاسی مسائل میں اس سے راہ مل سکتی ہے۔ اگر اسے زیر نظر رکھا جائے۔

دفاع ملی...... دفاع ملی کا شعبہ ایک مستقل شعبہ ہے جس پر اب تک کام ہوتا رہا ہے ۱۹۱۹ء جب سے تحریک خلافت نے حکومت سے سیاسی زور آزمائی شروع کی آج تک مختلف قسم کے وقتی پروگرام بنے اور ان پر عمل درآمد ہوا، جمعیت العلماء نے کسی وقت بھی مسلمانوں کی راہنمائی سے گریز نہیں کیا۔ اس کے ربع صدی کے کارنامے ملک کی نگاہوں سے مخفی نہیں ہیں۔

جمعیت علماء ہند کے پچیس سال...... اس دوران آج تک کون سی تحریک ہے جس میں جمعیت علماء کے مجاہدوں نے صحیح خدمات انجام نہیں دیں۔ آخر وہ کون تھا جس نے ۱۹۲۲ء میں خلافت تحریک کو چانگام سے لے کر سرحد یاغستان تک پہنچا دیا۔ جس نے کانگریس کے جلسوں میں آزادی کی روح پھونک دی اور کانگریس کو بیس سال تک صحیح راہ چلایا۔ جس نے سب سے پہلے اسلامی حقوق کی صحیح آواز بلند کی۔ جس نے شدھی کی تحریک سنگھٹن کے ہنگاموں نہرو رپورٹ کی بے انصافیوں اور سارداایکٹ کی مداخلت فی الدین کا مقابلہ کیا؟ کیا وہ جماعت جمعیت علماء ہند ہی کی نہ تھی؟

چونکہ یہ جماعت مستقل جماعت تھی، اس کا نصب العین مستقل، اس کا نظام عمل مستقل تھا۔ اس لئے کانگریس اور حکومت دونوں کے افعال اور نظریوں کو اپنے اصول پر پرکھ کر اس نے رائے قائم کی۔ کسی ادارے سے اس کی موافقت یا مخالفت کسی اتباع یا پیروی کے معیار سے کبھی نہیں ہوئی۔ بلکہ اپنے اصول کے معیار سے ہوئی ہے۔ وہ جس طرح کانگریس کی ہر ایسی اصولی چیز ماننے کو تیار ہو سکتی ہے۔ جو اصول شرعیہ پر پوری اترتی ہے۔ ایسے ہی لیگ اور دوسری جماعتوں کی بھی ہر وہ بات ماننے کے لئے آمادہ ہے۔ جو اس کے سمجھے ہوئے شرعی اصولوں کے خلاف نہ ہو۔ اسی پرواز پر اس نے دفاع ملی کا ۲۵ برس کامیاب کام کیا اور اب بقدر استطاعت کر رہی ہے۔ جب کہ اس کے

کارناموں کو دفن کرنے کی فکریں کی جارہی ہیں۔

بہرحال جمعیت العلماء کوئی آج کی جمعیت نہیں ہے۔ اس کی تشکیلات بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن اس کا قوام آج کے سارے سیاسی اداروں سے قدیم ہے۔

جمعیت علما ہند تاریخ کے آئینے میں...... جمعیت علما ہند دلی کے لال قلعہ کے ویران شدہ کھنڈروں میں ایک سرسبز شاداب درخت کی مانند ہے، جس کے پھولوں اور پھلوں سے ہمارے مقاصد زندگی اور عزائم کو "بعون اللہ" حیات تازہ ملتی ہے۔ اس جماعت کے سلسلے کے ابتدائی بزرگوں نے جن کا دور رکی تشکیلات سے پہلے کا ہے بالا کوٹ (سرحد) کے میدانوں میں اسلام کی مخالف طاقتوں کا مقابلہ میدان جہاد میں کیا اور شہادت کی رسم کہن کو زندہ کر کے زندہ جاوید ہونے کی سند حاصل کی۔ اسی جماعت کے اکابر تھے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ آتشیں کے موقعہ پر اپنے سوز سے آپ پگھل گئے۔ خانماں برباد ہوئے اور اس وقت جیل کی مشقتوں سے دوچار ہوئے۔ جب ہندوستان کی سیاسی دنیا جیل کے نام سے آشنا نہ تھی یہ ماضی قریب کی تاریخ حال کے لئے میراث ہے۔ کیوں کہ ماضی وحال ہمارے ایک ہی سلسلہ کی تاریخ کے دو پہلو ہیں۔ ہم ایک کی وجہ سے دوسرے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

بزرگان دیو بند...... حال کے ہنگاموں اور اپنوں بیگانوں کی صبر آزما مخالفتوں کے ہجوم میں ہم بالاکوٹ کے اس سرحدی مقام کو فراموش نہیں کر سکتے۔ جہاں خاندان ولی الٰہی کی چشم و چراغ چند جانباز ہستیاں ردائے شہادت اوڑھے ہوئے آرام فرما ہیں۔ نہ ہمیں وہ ویران بستیاں فراموش ہوسکتی ہیں، جہاں حجت الاسلام قاسم العلوم والخیرات بانی دارالعلوم دیوبند ۱۸۵۷ء کے پرآشوب دور میں وارنٹ نکلنے پر گرم نگاہوں سے روپوش رہے۔ نہ مظفر نگر کی جیل بھلائی جاسکتی ہے جہاں شمس العلوم حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ قید و بند سے دوچار رہے۔ نہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کی مجاہد جلیل شخصیت فراموش کی جاسکتی ہے۔ جس نے جہاد حریت کے سلسلے میں پانچ برس مالٹا میں اسیری کی زندگی گذاری اور ہندوستان میں جدید مذہبی سیاست کا سنگ بنیاد رکھا۔ جو آج جمعیت علماء ہند کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے جس کی روح نے بہت سی مردہ اور افسردہ جماعتوں کو جگایا۔

۱۹۱۴ء کے مجاہدین...... ۱۹۱۴ء کے مجاہدین علم و عمل میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے امین اسرار حضرت مولانا حبیب اللہ خود آپ کے سندھ کی مقدس یادگاریں ہیں۔ جن کا چہرہ زمانہ کے دردناک مصائب پر گواہ ہے۔ آپ حضرات کا ناز پروردہ دل کوٹھیوں میں بیٹھ کر ان مصائب کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جو محمود ح نے سرحد افغانستان سے لے کر متمدن یورپ اور وہاں سے چل کر حرم کعبہ کے سنگریزوں پر سر رکھ کر اٹھائی ہیں۔ اس سلسلہ میں میرے برادر معظم اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے محبوب ترین شاگرد مجاہد جلیل مولانا محمد میاں منصور انصاری آج بھی کابل میں اپنی جلاوطنی کی دردناک راتیں صبح امید کے طلوع ہونے کی امید میں گزار رہے ہیں۔ انہوں نے حجاز، افغانستان اور بخارا کا انقلاب دیکھا۔ روس کا انقلاب ماسکو پہنچ کر دیکھا اور جب ترکی میں انقلاب ہو رہا تھا تو وہ

انگورہ کے خزاں رسیدہ درختوں کے نیچے تھے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی فوج میں صرف اس ایک سپاہی کا ایک لحہ اس ساری سیاست کا جواب ہے جس کی رو سے کتنے ہی سیاسی رہنما علماء کے وجود کو ختم کر دینے کا چیلنج دیتے ہیں۔

حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ..... حضرت شیخ الہند کی اس سیاسی اولاد اور جمعیت علماء ہند کے ذمہ دار رہنماؤں کے سلسلے میں آپ کی نگاہیں حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی یہاں تلاش کر رہی ہیں اور آپ کے قلوب ان کی ذات سے لگے ہوئے ہیں۔ اور وہ کتنی ہی مختلف جیلیں کاٹنے کے بعد آج نینی تال جیل بیٹھے ہوئے اللہ کی تقدیر مبرم کا انتظار کر رہے ہیں۔ حضرت محترم اس وقت جمعیت العلماء کے صدر اور مسلمانوں میں قافلۂ آزادی کے سالار کارواں ہیں۔

حضرت ممدوح اس وقت حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم کے پیدا کردہ جذبات کے امین، حضرت مولانا حاجی امداد اللہ قدس سرہ مہاجر مکی کے مجاز، حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کے خلیفہ اور حضرت شیخ الہند کے شہرہ آفاق شاگرد و جانشین ہیں۔ ان کے عزم اور قربانیوں سے کوئی ناواقف نہیں۔ ممدوح کے سیاسی خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے جذبۂ اخلاص وایثار سے ان کے مخالف بھی انکار نہیں کر سکتے۔

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ..... اسی سلسلہ میں حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دامت برکاتہم ہمارے سر پر سایہ فگن ہیں، حضرت ممدوح سیاست کی تاریکیوں میں علم وتدبر کا روشن مینار ہیں۔ جن کو دیکھ کر ہماری ہمتیں بلند ہو جاتی ہیں اور ہم ان کی رہنمائی سے وقت کی مشکلات میں راہ پا لیتے ہیں۔ حضرت محترم کی ذات جمعیت علماء ہند کی چوتھائی صدی کی تاریخ کا مرقع ہے اور زمانہ ان کی خدمات پر غلاف نہیں ڈال سکتا۔ بہر حال جمعیت علماء کی رکنی اور غیر رکنی تاریخ ایک صدی اوپر سے شروع ہوتی ہے۔ جس کی ابتداء حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں اور انتہاء ذمہ داران وقت علماء کی مقدس جماعت ہے۔ بہر حال جمعیت علماء اور اس کے مقدس افراد کی جماعت اسی ساعت سے آزادی کے لئے جہاد حریت کرتی آرہی ہے۔ جب سے مسلمانوں کی آزادی غلامی کی صورت میں تبدیل ہوئی، گو اس کی خدمات کے رنگ ہر زمانہ کے مناسب جدا جدا رہے۔ آج کے دور میں اس کی وہی جدوجہد عسکری رنگ کی بجائے علمی اور تحریکاتی رنگ میں ہمارے سامنے ہے۔ اس لئے میرے نزدیک دفاع کلی کے سلسلہ کی تفصیلات پیش کرنے سے یہ زیادہ بہتر تھا کہ میں جمعیت العلماء کا یہ پچیس سالہ طرز عمل پیش کر دوں اور اپنی اس تحریر میں تعمیری پروگرام ہی پر زیادہ زور دوں اور وہ بھی جمعیت کے سامنے پیش کرنے کے لئے ہے کہ ذمہ داران جمعیت اس پر غور وفکر کر کے مناسب اجزاء کا انتخاب کر سکیں۔ پروگرام کا یہ حصہ تعمیری ہے اور شرعی رنگ میں تمام سیاسی مسائل کے لئے اس میں راہ مل سکتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

تعمیری اور تعلیمی پروگرام کا خلاصہ..... اشاعت دین الٰہی کے سلسلہ میں تعلیم خواص، تعلیم عوام اور شہرو

دیہات میں اس کی ہمہ گیری، درس قرآن، تاریخ سلف، تعلیم سپہ گری، تعلیم سیاست عصر، تعلیم طرق اشاعت اسلام، مسئلہ تبلیغ، مسئلہ تذکیر وموعظت، تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفوس، شخصی تربیت، امر بالمعروف نہی عن المنکر۔

اقامت حکومت الٰہی کے سلسلہ میں نصب العین کی تعیین، توحید اعتقادی وعملی، قانون الٰہی کی تنفیذ۔ فصل خصومات محکمۂ قضاء شرع، حفاظت نظام حیات کے سلسلہ میں حصول آزادی کی تڑپ کے ساتھ اتباع اسوہ حسنہ، توحید مطلب، عام شعب ایمان کی عملی ترویج جس سے بدنظمی اور انتشار دفع ہوتا ہے وغیرہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو بالآخر اسی پروگرام پر آنا ہے وہ خود نہ آئیں گے تو زمانہ لائے گا، لیکن اس کو چلانے والی طاقت صرف مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور اشتراک عمل کی قوت ہو سکتی ہے اور اتحاد اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم اختراعی اور قیاسی پروگرام کو چھوڑ کر کسی ایسے نصب العین کا دامن سنبھالیں، جو اختراعات کی دنیا سے بالاتر علم ویقین کی قطعیت لئے ہوئے ہو اور ساری دنیا کے سارے ہی پروگراموں کو اپنی لپیٹ میں لے سکے۔

ظاہر ہے کہ ایسا نظریہ خدائی نظریہ ہی ہو سکتا ہے۔ چونکہ ہر انسانی نظریہ میں دوسری انسان کی رائے کا تزاحم ممکن ہے۔ لیکن الٰہی نصب العین کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر انسان سے اوپر کی چیز ہے، اس لئے سارے انسان اس پر جمع ہو سکتے ہیں کہ وہاں ایجاد واختراع کا کوئی دخل بھی نہیں۔ اسلام نے اپنا نصب العین اسی خدائی قانون اور الٰہی پروگرام کو رکھا ہے۔ اس نے تمام بنیادی ازم مثلاً نیشنلزم، فاشزم، کیمونزم وغیرہ رد کر کے ایک اور صرف ایک خدائی ازم یا اسلام ازم رکھا ہے، جس کے پلیٹ فارم پر دنیا کی ساری قومیں جمع ہو سکتی ہیں۔ اس لئے اسلام نے نہ قومیت کا اعلان کیا کہ قومیں، قومیں سب برابر تھیں، اس نام پر ہر قوم جمع نہیں ہو سکتی تھی۔ نہ بادشاہت کا اعلان کیا کہ انسان، انسان سب برابر تھے۔ پھر ان میں حاکم ومحکوم کی تفریق کیسی؟ اور اگر کی جاتی تو وہ نوع ورعیت سے چل کیسے سکتی تھی۔ بلکہ اس نے لامحدود بادشاہت یعنی حکومت الٰہی کا اعلان کر دیا، جس کا قانون اسلام اور عرض کردہ پروگرام ہے۔ پس اس سے بہتر ذریعہ اتحاد مسلمانوں کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے؟

اس لئے اگر مسلمان خلوص دل سے متحد ہونا چاہتے ہیں تو اس عنوان کے نیچے جمع ہو جائیں اور اپنی قوتوں کو منظم کر کے کچھ کر کے دکھلائیں اور مسلمانوں پر رحم کھائیں اور اختراعی اور دل آفریں نصب العین سامنے لا لا کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیں۔ لیکن پروگرام کتنا ہی معقول اور ہمہ گیر کیوں نہ ہو اس کے چلانے کے لئے بہر حال جماعت اور اس کے ساتھ پلیٹ فارم کی ضرورت ہے۔ ہم اس کو کس پلیٹ فارم کے سپرد کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں اگر نظر پڑ سکتی ہے تو جمعیت العلماء پر۔

کانگریس اور لیگ..... کانگریس اور لیگ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ کانگریس کو انگریزوں نے قائم کیا، اعتدال پسند ہندو اور مسلمانوں نے پروان چڑھایا۔ خلافتی مسلمانوں اور سوراجی ہندوؤں کے اشتراک عمل سے اس کو پھل پھول لگے۔ گاندھی جی کے دماغ نے اسے مبہم اور غیر متعین آزادی کے سوا نیز وتک پہنچایا اور بالآخر پنڈت

مالویہ اور سوامی شردھانند نے اسے فرقہ پرستی کے بحر ظلمات میں لے جا کر غرق کر دیا۔

کانگریس کی تاسیس ..... کانگریس کا قیام درحقیقت ۵۷ء کے ناکام انقلاب کا کامیاب انتقام تھا، حکومت برطانیہ دولت عظمٰی بننا چاہتی تھی اور اسے اس مقصد کے لئے لال قلعہ کی شاہی کی جگہ ایک ایسی طاقت پیدا کرنی تھی، جو ہندوستان کے انقلابی رجحانات کا رخ آئینی اور دفتری تحریکات کی طرف منتقل کر دے۔ نتیجہ صحیح برآمد ہوا۔ چار کروڑ انسانوں کی سفید فام قوم (انگریز) چالیس کروڑ انسانوں (اہل ہند) پر حکمران ہوگئی اور کانگریس ۱۹۱۴ء تک آئینی شکل میں تجویزیں پاس کرتی رہی۔

کانگریس ۱۹۱۶ء میں ..... ۱۹۱۶ء میں کانگریس کی رگوں میں نوجوان خون داخل ہوا۔ ۱۹۲۰ء کے مسلمانوں نے اسے زندگی کا نصب العین دیا اور آزادی کا پرجوش ولولہ عطا کیا۔ مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں برطانیہ کی زمین دوز سیاست کے بطن سے پیدا ہوئی۔ اگر کانگریس کو برطانیہ کی بیٹی مان لیا جائے تو ۱۹۰۶ء کی لیگ کو کانگریس کی بیٹی اور برطانیہ کی نواسی کہہ دیا جانا بے جا نہ ہوگا۔ مسلم لیگ ہندوستان کے سیاسی ترازو کا دوسرا پلہ تھا اور یہ اس کے موجد کا کمال تھا کہ اس کے دونوں پلے نصف صدی گذارنے اور سو بار پاسنگ کرنے کے بعد بھی کبھی برابر نہ ہوئے۔

کانگریس نے ۱۹۲۰ء کے بعد سے آزادی کے لئے جو کچھ جدوجہد کی ہے اس کی سیاسی قدر و قیمت کا اعتراف کرتا ہوں اور لیگ نے اپنے جدید دور میں مسلمانوں کے حقوق طلبی اور تنظیم کے سلسلے میں جو نام پیدا کیا، مجھے اس سے بھی انکار نہیں۔ لیکن مجھے برملا کہنا پڑتا ہے کہ ان دونوں تاریخی جماعتوں کی محنتوں کا حاصل یہ ہے کہ مسٹر چرچل اور ایمری اس کا پھل کھا رہے ہیں اور ہندوستان والے اور پاکستان والے دونوں چھلکوں پر لڑ رہے ہیں، مگر کما حقہ پھلوں کی فکر نہیں کرتے۔

ایک واقعاتی لطیفہ ..... یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک طرف ہندوستانی فوج برطانیہ کے جھنڈے کے نیچے ایک صدی سے متحد ہو کر دنیا سے لڑ رہی ہے اور دوسری طرف ہندوستانی قوم آزادی کے محاذ پر آپس میں دست و گریبان ہے۔ یعنی اس فوجی میدان میں وہی قوم اتحاد کا مظاہرہ کر رہی ہے جو قومی میدان میں باہم لڑ رہے ہیں۔ جس سے یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں کہ اس مختلف العناصر قوم میں توافق اور اتفاق بحالات موجود بھی ناممکن نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی اگر قومی مفاد کے سلسلے میں یہ ممکن ناممکن ہے تو اس کے معنی یہ ہیں، ہندوستان ایک ایسا درخت ہے جس کی شاخیں مخالف ہوا کے جھونکوں سے خود آپس میں ٹکراتی ہیں، دوسروں کے لئے اپنا پھل جھاڑتی ہیں اور خود پھل سے خالی رہ جاتی ہیں۔ یا ہندوستانی سیاست ایک ایسا جھولا ہے جس میں ایک طرف ہندو ہیں اور دوسری طرف مسلمان اور یہ جھولا برطانوی مفاد کے لئے ہلتا رہتا ہے اور جب ہندوستان کی آزادی کا وقت آتا ہے تو وہ ٹھہر جاتا ہے۔ ہندو ایک طرف نظر آتے ہیں اور مسلمان دوسری طرف۔ آج یہ جھولا پاکستان پر آ کر رکا ہوا ہے۔

مسئلہ پاکستان ..... ظاہر ہے کہ پاکستان ایک نظریہ ہے۔ ایک سیاسی تصور اور ایک اسکیم ہے الہام نہیں ہے۔

دنیا میں جب کوئی اسکیم ابھرتی ہے تو اس کو رائے عامہ کبھی منظور کرتی ہے اور کبھی مسترد کردیتی ہے۔ بلاشبہ پاکستان نے ہندوستان کے سیاسی ماحول میں نمایاں اہمیت حاصل کرلی ہے۔ کل تک یہ تصور تھا اور آج عقیدہ اور نصب العین ہے اور بہت سے مسلم لیگی خلوص کے ساتھ اسے اپنے اندر لئے ہوئے ہیں، جن کا خلوص بہرصورت قابل قدر ہے۔ لیکن میں ایک تعلیمی خادم کی حیثیت سے یہ عرض کرنے میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتا کہ کم از کم میرے لئے پاکستان ایک مبہم اور غیر منقح تصور ہے۔ جس کی بحالات موجودہ مخالفت بھی خطرناک ہے اور موافقت بھی۔

تاہم پھر بھی میں پاکستان کے مجوزین سے تو یہ عرض کروں گا کہ اس گول مول پاکستان کی شرح و تنقیح کی تکلیف گوارہ فرما کر اس کی تمام دفعات واضح کردیں اور پھر نہ صرف خود ہی اسے سمجھ لینے پر قناعت کریں۔ بلکہ مسلمانوں کی تمام ذمہ دار جماعتوں کی ایک مشترک مجلس (مسلم کونشن) میں اسے غور و بحث کے لئے پیش کردیں۔ تاکہ جن مسلمانانِ ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لئے یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے، وہ بھی اسے سمجھ لیں اور مطمئن ہو کر اس کی طرف کوئی عملی قدم بڑھا سکیں۔

مخالفین پاکستان ...... ادھر پاکستان کے مخالفین سے یہ عرض کروں گا کہ جب کہ مسٹر ایمری اور لارڈ ہالیفکس اور مسٹر چرچل سب ہندوستان سے چشمک کر رہے ہیں اور لارڈ ارون صاف لفظوں میں کہہ رہے ہیں کہ آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستان کی نااتفاقی اور اختلاف ہے۔ جب تک تمام ہندوستان متحد نہ ہو جائیں ہم ہندوستان چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں اگر فی الحقیقت اتحاد کا اصول خزانہ جس سے ہم آزادی کی متاعِ گرانمایہ حاصل کرسکیں۔ اس پاکستان کے ماننے ہی سے مل سکتا ہے تو انہیں بلا کسی کھٹکے اور تردد کے اس عنوان کو قبول کرلینا چاہئے، فی الحقیقت اس نظریہ میں پاؤں چلنے کی کوئی صلاحیت ہے تو یہ چل جائے گا اور اسے چلتا ہوا دیکھ کر ماننے والوں کو بھی کسی پشیمانی سے دوچار نہ ہونا پڑے گا۔

اور اگر یہ لفظ ہی لفظ ہے جس کے پیچھے معنی کا کوئی ذخیرہ نہیں، اس لئے اس میں آگے بڑھنے کی کوئی سکت ہی نہ ہوگی تو وہ خود ہی رہ جائے گا۔ محض آپ کے مان لینے سے اس کی کوئی ہستی قائم نہیں ہوجائے گی۔ جب تک کہ خود اس کی اپنی بنیادیں استوار نہ ہوں۔

بہرحال یا اس کی توضیح و تشریح سامنے آئے تاکہ اسے اجتماعی بصیرت کی کسوٹی پر جانچا جاسکے اور یا اس کے ابہام و اجمال کے باوجود اس کی کسی کھلنے والی معنویت پر بھروسہ کرکے اس اختلاف کی خلیج کو پاٹ دیا جائے تاکہ منزل مقصود سامنے آئے اور اس کی حقیقت کو خود کھولنے کی بجائے اسی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ آپ کھل کر یا دنیا کی سر آنکھوں پر آجائے یا اس کے قدموں سے پامال ہوجائے۔ محض اس مبہم لفظ پر ایک دیوار بنا کر آگے بڑھنے کا راستہ بند کردیا جانا خواہ منوانے کی ضد کے ساتھ یا نہ ماننے کی ضد کے ساتھ، سوائے منزل کھوٹی کرنے کے اور کس عنوان سے تعبیر کیا جائے؟ البتہ یہ میں پھر عرض کروں گا کہ ان دونوں صورتوں میں ذمہ داری بہرصورت مجوزین پاکستان

ہی عائد ہوگی۔ کیوں کہ اگر پاکستان کو اس ابہام کے ساتھ محض ان کی خاطر یا بوجہ اتحاد قبول کرلیا جائے تو ظاہر ہے کہ مستقبل کے نفع وضرر کے وہی ذمہ دار ہوسکتے ہیں جو اسے کھولنا نہیں چاہتے۔ اور اگر اسے اس ابہام کی وجہ سے رد کردیا جائے تو اس تردید کے معقول ہونے کی بناء پر پھر بھی ذمہ داری انہیں پر ہے، جو تہ اسے واضح کرنا چاہتے ہیں اور نہ اسے کھلی منڈی میں کھول کر رکھنا چاہتے ہیں کہ لوگ اس کی صحت وسقم کو ہر پہلو سے الٹ پلٹ کر جانچ سکیں۔ البتہ اگر مسلمانوں کی طبقاتی رائے عامہ اسے اجتماعی حیثیت سے قبول کرلے تو پھر بلا شبہ اجتماعی حیثیت سے ذمہ داری مشترک رہتی ہے جس کا الزام تنہا مجوزین پر عائد نہیں ہوسکے گا۔ ایسی صورت میں مجوزین پاکستان اسے کھول دینے یا گول مول منوانے کے اصرار پر مزید غور وفکر کرلیں مگر آزادی وطن کے اصل مقصد کو زیر نظر رکھ کر۔

لیکن لیگ اور کانگریس اگر پاکستان پر متحد بھی ہو جائیں تو قوم کی اسلامی تعمیر اور شرعی سیاست کی تکمیل کا مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہوتا اور وہ پروگرام جس کو تعمیری حیثیت سے میں نے عرض کیا ہے۔ بدستور محتاج تکمیل رہتا ہے جس میں پاکستان کے قبول وعدم قبول سے کوئی فرق نہیں پڑتا یا بالفاظ دیگر حقیقی آزادی اور صحیح معنی میں مسلم قوم کی آزادی کا رخ روشن پھر بھی پنہاں ہی رہتا ہے جس کو پاکستان کا آئینہ بھی نمایاں نہیں کرسکتا۔

جماعت اور جماعتی پلیٹ فارم...... اس لئے ناگزیر طریقہ پر اس شرعی تعمیری پروگرام کی تکمیل کے لئے جماعت اور پلیٹ فارم کا سوال پھر بھی باقی رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی تکمیل وہی جماعت کرسکتی ہے جو مسلم اقوام کی اسلامی تعمیر کی لائنوں سے ہمیشہ گزرتی رہی ہے۔ جس نے اس وقت مکمل آزادی کو مسلمانوں کا شرعی اور مذہبی حق بتلاکر عملی راہنمائی کی، جبکہ ملک کی دوسری جماعتیں محض رسمی اور سیاسی طور پر آزادی کا نام لے رہی تھیں اور جس نے ہندوستان کے مسلم عوام کو شرعی طور پر اس لئے آمادہ کیا کہ آزادی ملک کی نعمت اگر آج عسکری جہاد سے حاصل نہیں کی جاسکتی ہے تو سیاسی جہاد سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جماعت بجز جمعیت العلماء کے اور کون ہے جو ان مقاصد کی شرعی تکمیل کی اہل ہو؟ اس لئے بھی کہ تجربہ اور عمل پیہم اس کے ساتھ ہے اور اس لئے بھی کہ مسلمانوں کا ہر ایک پروگرام کتاب وسنت کے سوا اور کسی ماخذ سے ماخوذ نہیں ہوسکتا اور کتاب وسنت کے صحیح علم کے لئے اسی جماعت کو منجانب اللہ موفق کیا گیا ہے۔ اس لئے میں اپنی اس بضاعت مزجاۃ (حقیر کوشش) کو اسی مقدس جماعت کے سامنے مستفیدانہ طریق پر پیش کرتا ہوں۔ کہ وہ اس کے کھرے کھوٹے کو جانچ کر مناسب سمجھے تو ان عرض کردہ اصول اصلاح اور اصلاحی پروگرام پر مسلمانوں کی تعمیری خدمت شروع کردے کہ صحیح معنی میں وہی مسلمانوں کی دینی اور سیاسی قیادت کرسکتی ہے۔ اس نے اب تک جس طرح دفاع ملی کی زریں خدمات انجام دی ہیں، جنہیں تاریخ کے صفحات سے کبھی محو نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح اب بلحاظ وقت ومصالح وہ تعمیری کاموں کا بھی سلسلہ چھیڑ کر اپنے قدیم قائدانہ جذبات کو عمل میں لائے۔

جمعیت علماء ہند کی قدر وقیمت...... ضرورت ہے کہ اولاً علماء حق کی تنظیم خالص کتاب وسنت کے اصول پر ہو

اور پھر اسی تنظیم کے ماتحت اصول مذکورہ پر عوام کی تنظیم کی جائے۔ بلاشبہ ان تنظیمات کے سلسلہ میں موانع، دواعی سے زیادہ ہیں۔ لیکن جبکہ اس پر حوصلہ جماعت نے ہمیشہ موانع ہی کے ہجوم میں کام کیا ہے اور بالآخر اس کے مخلص افراد کی للّٰہیت و بے نفسی موانع شکن ثابت ہوئی تو کوئی وجہ نہیں کہ آج کے موانع کو سامنے رکھ کر ہم اس مقدس قوم کی پچھلی تاریخ بھول جائیں۔ یہ پیغام میں اس مقدس صوبہ میں دے رہا ہوں جو ہندوستان میں اسلام کا سب سے پہلا گہوارہ ہے اور اسلام کی تام و کامل دولت ہند، کو سندھ ہی کی بدولت نصیب ہوئی کیا عجب ہندوستانی مسلمانوں کے اسلام کی سیاسی تجدید بھی اسی صوبہ سے شروع ہو اور یہیں سے اسلام کا تعمیری پروگرام پھلتا پھولتا نظر آئے۔ ﴿وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ﴾

آخر میں مکرر مخلصانہ شکریہ عرض کرتا ہوں کہ جمعیت علماء صوبہ سندھ کے مقدس ارباب حل وعقد نے مجھ ناچیز کو اس کا موقع دیا کہ میں اپنے طالب علمانہ خیالات کو مستفیدانہ انداز سے ان کے سامنے رکھ سکوں۔

ورنہ کہاں میں اور کہاں مداوائے لشعہ کا علمی میدان۔ یہ محض ان کی کرم فرمائی تھی کہ ایک ذرہ بے مقدار ان کی وسعت ظرف سے اس اوج پر نظر آ رہا ہے۔

گدا بہ تخت نشانند و بادشاہ گیرند

حق تعالیٰ اس جماعت مقدسہ کو اس کے شرعی مقاصد میں کامیاب فرمائے اور ہم سب مسلمانوں کو اخلاص و للّٰہیت سے ان کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے اور امر الٰہی کی مخالفت اور اس کے آثار بد سے محفوظ رکھے۔

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ. اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ ①

محمد طیب غفرلہ
مہتمم دار العلوم دیوبند
۱۵ اپریل ۱۹۴۳ء

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۶۳، ۶۴.

مسلم پرسنل لاء

آج اگر سب مل کر اس پر جمع ہو جائیں کہ پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک جو ''اسلامی معاشرت،، ہے، ہم اسے قائم کرکے رہیں گے سارے مل کر، اگر عمل کریں تو عمل کے اندر خود وہ طاقت ہے کہ دوسروں کے چھکے چھوٹ جائیں گے زبان سے بھی کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ ہمارا اور آپ کا کام یہ ہے کہ ایک تو عمل درآمد ہو اس کے اوپر۔ اور ایک اس کا اعلان ہو اور اس کی پوری اطلاع دیدی جائے کہ اس قانون میں تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ہم اس کو ایک منٹ کے لئے گوارہ کر سکتے ہیں۔ ہماری جانیں جاسکتی ہیں، مگر اس قانون پر آنچ نہیں آسکتی۔

از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ

''اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ أَنْ لَّا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، أَرْسَلَہُ اللّٰہُ إِلٰی کَافَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا إِلَیْہِ بِإِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا۔

أَمَّا بَعْدُ! فَأَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿ أَفَغَیْرَ اللّٰہِ أَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّھُوَ الَّذِیْٓ أَنْزَلَ إِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا﴾① ۔ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ

حسن مقام..... بزرگانِ محترم! آپ کے اس عظیم الشان شہر میں جو اپنے حسن وخوبصورتی، فضا کی وسعت، آب وہوا کے اعتدال اور مناظر کی خوبی کے لحاظ سے ہندوستان کے شہروں میں ایک ممتاز ترین شہر ہے اس کی طرف قدرتی طور پر قلوب اور طبائع کی کشش ہوتی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر میں وزارت عظمی سے ریٹائرڈ ہوا تو بنگلور میں جا کر قیام کروں گا، اس سے بہتر ہندوستان میں دوسرا شہر نہیں ہے۔ بہر حال یہ اپنی خوبیوں اور خصوصیات کے لحاظ سے ایک ممتاز شہر ہے۔

مرکز جہاد وشہادت..... سلطان ٹیپو کا یہ وطن ہے، ان کے مجاہدانہ کارناموں کا یہ مرکز رہا ہے۔ ان کی شہادت اسی مقام پر ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ ایک سلطان وقت کی شہادت تنہا ایک کی شہادت نہیں ہوتی، معلوم نہیں کتنے

① پارہ:۸، سورۃ الانعام، الآیۃ:۱۱۴.

افراد کو انہوں نے جام شہادت پلایا ہوگا اور کتنے لوگ یہاں شہید ہوئے ہوں گے۔ انہی شہداء کی اولاد آپ ہیں، یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کے جذبات آپ کے اندر نہ ہوں۔

وہ ولولہ، وہ جوش جہاد، وہ شہادت کا ذوق آبائی ہے جو آپ کے اندر موجود ہے خواہ آپ کو احساس نہ ہو "الولد سر لابیہ" باپ کے جو جذبات ہوتے ہیں وہ قدرتی طور پر اولاد میں منتقل ہوتے ہیں۔ تو اپنی معنویت کے لحاظ سے یہ زمین جوش اور جذبہ اور دینی ولولہ بھی رکھتی ہے۔

اکرام ضیف..... اسی کے ساتھ ساتھ جو چیز ہم لوگوں کے سامنے آئی وہ آپ کے اخلاق کی وسعت ہے۔ ہم لوگ حاضر ہوئے۔ یہ واقعہ ہے کہ مہمانوں کی مدارات میں، ضیافت میں، اکرام اور توقیر میں یہاں کے لوگوں نے جو جذبہ دکھلایا ہے، وہ ایک ممتاز قسم کا جذبہ ہے جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ﴿مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ.﴾ ① "جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اس کو چاہئے کہ وہ مہمان کی عزت کرے"۔ اس تعلیم نبوت کے ماتحت آپ نے مدارات میں انتہاء کی خوش سلیقگی کے ساتھ نظم کی خوبی کے ساتھ، مہمانوں کا قیام، ان کی آمد، ان کی توقیر، یہ ایک ممتاز صورت رہی ہے۔

یہاں اس سے بھی بڑھ کر عالی ظرفی کی بات یہ ہے کہ آنے والوں کا آپ شکریہ بھی ادا کر رہے ہیں اور محض ظاہر داری کے طور پر نہیں بلکہ دلوں کے جذبے سے حضرت مولانا ابوالسعود صاحب جو صدر استقبالیہ ہیں، انہوں نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں آپ کی طرف سے، اپنی طرف سے بھرپور الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔ تو حیرت یہ ہے کہ مالی قربانیاں آپ نے دیں، جانی محنت آپ نے کی، مہمانوں کو راحت پہنچانے میں انتہاء آپ نے کی۔ اوپر سے شکریہ بھی ادا کر رہے ہیں یہ عالی ظرفی اور قدر شناسی کی انتہاء ہے کہ آدمی سب کچھ کرے اور پھر یہ کہے کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔

ہمارے یہاں ایک مثل مشہور ہے کہ بادل وہ ہے جو برسے اور گرما دے یعنی برس کر گرماتا ہے کہ وہ پھر آمادہ ہے برسنے پر، اس کا جذبہ یہی ہے کہ میں مخلوق کو پانی دوں اور حیات بہم پہنچاؤں، دوسرا مصرعہ ہے کہ سخی وہ ہے جو دیوے اور شرماوے تو سب کچھ دے رہے ہیں اور شرما بھی رہے ہیں۔ ندامت کا بھی اظہار کر رہے ہیں۔ یہ کام تو ہمارا تھا کہ ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے۔ لیکن ہمارا فریضہ بھی آپ ہی نے ادا کر دیا اب ہم سوچتے ہیں کہ ہم کیا چیز ادا کریں اور ادا کریں بھی تو واقعہ یہ ہے کہ جتنے جامع طریق پر آپ نے مہمان داری فرمائی، جلسہ کو کامیاب بنایا ہمارے پاس الفاظ اتنے جامع نہیں ہیں کہ جو حاوی ہو جاویں آپ کے شکریہ کے اوپر۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا طریق شکر...... لیکن شکریہ کا ایسا طریقہ کیا ہو کہ جب انعام اور نعمت تو ہو بے انتہاء اور شکریہ کے الفاظ ہوں محدود۔ ایسے موقع کے لئے خود شریعت نے ہمیں بتلا دیا کہ لامحدود شکریہ کس طرح ادا کر دیں۔

ایک طریقہ تو حضرت داؤد علیہ السلام نے بتلایا۔ حق تعالیٰ نے جب ارشاد فرمایا: ﴿اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ

① الصحیح للبخاری، کتاب الادب، باب من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر، ج: ۱۸، ص: ۳۳۶.

شُکْــرًا﴾ ① ''اے داؤد! میری نعمتوں کا شکر ادا کرو''۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے کلام کو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ حقائق الٰہیہ کی جو سمجھ اور فہم انبیاء علیہم السلام کو دی جاتی ہے۔ وہ کسی کو نہیں دی جاتی۔ بلکہ جتنی باتیں آتی ہیں وہ سب ان کی ہی جوتیوں کے صدقے سے آتی ہیں اور ان ہی کی برکات سے آتی ہیں۔ تو داؤد علیہم السلام کو حکم دیا گیا کہ میرا شکر ادا کرو۔ انہوں نے عرض کیا، یا اللہ! کس طرح ادا کروں یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے کہ جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا تو اس شکر ادا کرنے کی توفیق بھی تو آپ ہی دیں گے۔ جب ہی تو شکر ادا کر سکوں گا۔ اس کی طاقت بھی تو آپ ہی دیں گے۔ تو یہ توفیق دینا، طاقت دینا خود ایک مستقل نعمت ہوگئی پھر میں اس کا شکریہ ادا کروں اور اس کا جب شکر ادا کروں گا تو اس کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے تو پھر ایک نعمت پہلے نکل آئی، پھر میں اس کا شکریہ ادا کروں۔ تو ہر شکر سے پہلے ایک شکر نکلتا ہے۔ تو میں عاجز ہوں کہ شروع کس طرح سے کروں شکریہ کو اور ادا کس طرح سے کروں۔ ہر شکر سے پہلے ایک شکر اور ہر شکر سے پہلے ایک شکر۔ تو میں عاجز ہوں شکر ادا کرنے سے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا:

اے داؤد! جب تم نے اپنے عجز کا اعتراف کر لیا اور تم شکر ادا کرنے سے عاجز ہو تو یہی ہمارے شکر کی ادائگی ہے، کون ہے جو شکر کا حق ادا کر سکے۔ ②

نعمتیں لامحدود اور شکر ہمارا محدود، طاقتیں ہماری محدود، ممکن نہیں کہ اللہ کا شکر کما حقہ ادا کر سکیں۔ اس لئے صورت یہی ہے کہ اپنے عجز کا اظہار کرے اور اپنے قصور کا اعتراف کرلے کہ بھائی ہم شکر کو ادا نہیں کر سکتے، تو یہی ادائگی شکر ہے۔ یہ تو طریقہ داؤدی ہے جو انہوں نے ارشاد فرمایا۔ کہ جب شکر بہت سا لازم ہو جائے اور ادا کرنے سے عاجز ہو جائے تو اعتراف کرلو عجز کا کہ بھائی! عاجز ہیں۔ نہیں ادا کر سکتے شکر کو، یہی شکر کا قائم مقام ہو جائے گا۔

طریق شکر نبوی (علیہ الصلوٰۃ والسلام)...... ایک طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر نعمتیں لامحدود ہوں تو تم بھی لامحدود شکریہ ادا کرو۔ مگر بندہ ہے محدود، وہ لامحدود شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ تو الفاظ ایسے ارشاد فرمائے کہ وہ لفظ اس شکر کو لامحدود بنا دیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حمد کی اور شکر ادا کیا کہ:

''اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا دَائِمًا مَّعَ دَوَامِکَ'' ''اے اللہ! تیرے لئے حمد ہے اور دائمی ہے جب تک کہ تو دائم ہے'' اور تیرے دوام کی کوئی حد نہیں تو میری حمد کی بھی کوئی حد نہیں۔ اور فرمایا کہ: ''وَلَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا خَالِدًا مَّعَ خُلُوْدِکَ'' ③ (الحدیث) ''اور تیرے لئے حمد ہے جب تک کہ تو رہنے والا ہے اور تو ہمیشہ رہنے والا ہے'' ''تو میری حمد بھی ہمیشہ رہے گی تیرے ساتھ۔ اور فرمایا کہ: ''وَلَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا لَا مُنْتَھٰی لَہٗ دُوْنَ مَشِیْئَتِکَ''۔ ''اور تیرے لئے حمد ہے ایسی حمد جو تیری مشیت کے ساتھ ساتھ چلے''۔ اور تیری مشیت کی کوئی

① پارہ: ۲۲، سورۃ سبا، الآیۃ: ۱۳۔ ② تفسیر روح المعانی، سورۃ سبا، الآیۃ: ۱۳، ج: ۱۶، ص: ۲۷۳۔

③ المعجم الاوسط للطبرانی، باب المیم، من اسمہ محمد، ج: ۱۲، ص: ۲۷۳۔

انتہا نہیں تو میری حمد کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ تو آدمی جب پوری حمد اور پورا شکر ادا نہ کر سکے، تو اعتراف عجز کے بعد یہ بھی کہہ دے کہ یہ حمد دوامی ہے، تو اللہ ان لفظوں کو ہی دوامی بنا دیتے ہیں اور وہ شکر بھی دوامی بن جاتا ہے۔

اظہار تشکر...... اس لئے کہ اگر ہم آپ لوگوں کا اس میزبانداری پر شکریہ ادا کریں اس لیاقت پر اور اس جلسہ کو کامیاب بنانے پر، تو ایک تو یہ عرض کریں گے کہ ہم عاجز ہیں آپ کا شکر ادا کرنے سے۔ یہ تو ہے سنت داؤدی علیہ السلام اور ایک یہ عرض کریں گے کہ جب تک آپ باقی ہیں، آپ کی نسلیں باقی ہیں ہمارا شکریہ آپ کے ساتھ ہے، تو یہ دوامی شکر ہوگیا۔ اپنی طرف سے عجز کا اظہار بھی ہے اور دوامی شکریہ بھی ہے۔ بہر ان شاء اللہ دوامی طور پر ساتھ بھی رہے گا۔

پرسنل لاء کا مفہوم...... بہر حال اس عظیم الشان شہر میں جس کے اندر ظاہری اور باطنی خصوصیت ہیں، جس کے باشندوں کے اندر اخلاقی بلندیاں ہیں، اس عظیم الشان پنڈال میں یہ عظیم الشان جلسہ منعقد کیا جا رہا ہے۔ جس کا موضوع ہے مسلم پرسنل لاء، یہ جلسہ ہے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء کا میں ابھی اپنے بزرگوں سے پوچھ رہا تھا کہ پرسنل کے حقیقی معنی کیا ہے؟ اس لئے کہ لفظ انگریزی کا ہے، ہم تو پوری طرح انگریزی جانتے نہیں۔

تو میں نے تحقیق کی کہ پرسنل کے معنی کیا ہیں۔ ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ مخصوص قانون جو کسی قوم کے ساتھ مخصوص ہو، اسے پرسنل لاء کہتے ہیں۔ مگر کہا یہ گیا کہ پرسنل کے معنی ذاتی کے ہیں۔ یعنی مسلمانوں کا ذاتی قانون، مسلمانوں کا شخصی قانون۔ ان کے احوال شخصیہ کے بارے میں مذہبی ہدایت پر مبنی قانون اس میں ذاتی قانون آجاتا ہے، ذاتی افعال و احوال کے متعلق بھی باتیں آجاتی ہیں۔ خاندانی اور عائلی واقعات بھی آجاتے ہیں۔ نکاح ہو، طلاق ہو، ہبہ ہو، میراث ہو، یہ سب چیزیں اس میں آجاتی ہیں تو مسلم پرسنل لاء کے معنی یہ نکلے کہ مسلمانوں کے شخصی قوانین، ذاتی قوانین، خاندانی اور عائلی قوانین یہ ہیں جن کا تحفظ آپ کو مقصود ہے۔ یہ مسلمانوں کا قانون کہا جاتا ہے۔

دنیائے انسانیت کا قانون...... لیکن میں عرض کروں گا کہ مسلمانوں کا بحیثیت قوم کے کوئی قانون ہی نہیں۔ قانون درحقیقت اسلام کا ہے، مسلم قوم کا کوئی قانون ہی نہیں، جو مان لے۔ اس کا نام مسلم ہے۔ جو نہ مانے اس کا نام غیر مسلم ہے۔ لیکن قانون خود مسلمانوں کا شخصی نہیں۔ نہ انہوں نے کوئی قانون وضع کیا ہے نہ ان کے ساتھ مخصوص ہے۔ قانون اسلام کا ہے اور اسلام کا قانون پوری دنیائے انسانیت کے لئے بھیجا گیا ہے۔ کسی مخصوص قوم کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ یہ آپ کا قانون نہیں بلکہ دنیا کے سارے انسانوں کا قانون ہے۔ ان لفظوں سے کہ ''مسلمانوں کا قانون'' ایک تعصب اور ایک حد بندی ٹپکتی ہے۔ تو غیر مسلم کہے گا کہ مجھے اس سے کیا تعلق یہ تو مسلمان کا قانون ہے۔ اس سے تعصب چلے گا، وہ غور کرنے کی طرف بھی توجہ نہیں کرے گا۔ چوں کہ مسلمانوں کا قانون ہے میرا قانون نہیں۔ مجھے اس پر غور و فکر کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن جب ہم یہ کہیں گے کہ مسلم قوم کا بحیثیت قوم کے کوئی قانون نہیں، وہ تو خدا کا قانون ہے جیسے ہمارے لئے آیا ہے تمہارے لئے بھی آیا ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''کَانَ النَّبِیُّ یُبْعَثُ اِلٰی قَوْمِہٖ خَاصَّۃً وَّبُعِثْتُ اِلَی

النَّاسِ كَافَّةً" ① ہر پیغمبر اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ کسی پیغمبر کا دائرۂ عمل خاندان ہوتا تھا جیسے بنی اسرائیل کے انبیاء کہ وہ بنی اسرائیل کے خاندان کے لئے آتے تھے۔ غیر اسرائیل سے انہیں تعلق نہیں تھا۔

حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں: "میں تو اسرائیلی بھیڑوں کو جمع کرنے کے لئے آیا ہوں، باقی دنیا سے مجھے کوئی تعلق نہیں تھا اور قوموں سے میری غرض ہے میں تو اسرائیلیوں کی اصلاح کے لئے آیا ہوں"۔ تو بعض انبیاء تو خاندان کی اصلاح کے لئے بھیجے گئے اور بعض انبیاء وطنوں کی اصلاح کے لئے جیسا کہ حضرت یونس علیہ السلام، کہ چار شہروں کی اصلاح ان کے سپرد فرمائی تھی۔ تو "كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمِهِ خَاصَّةً"

ہر پیغمبر اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: "وبعثت الى الناس كافة" "میں دنیا کی تمام اقوام کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ سارے انسانوں کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا ہوں"۔ اسی واسطے قرآن مجید میں جگہ جگہ جہاں عبادت عامہ کی ہدایت فرمائی یا ایمان لانے کی ہدایت فرمائی، تو اس جگہ انسانوں کا لفظ استعمال فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ﴾ ② "اے دنیا کے انسانو! اپنے رب کی عبادت کرو"۔ ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾ ③ "اے دنیا کے انسانو! جو آج موجود ہیں یا آئندہ جو تمہاری نسلیں آئیں گی ان سب کے لئے میں پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔ تو آپ علیہ السلام کسی خاص نسل خاص قوم کی طرف مبعوث نہیں ہوئے، کسی خاص وطن کی طرف مبعوث نہیں ہوئے بلکہ دنیا کے سارے انسانوں کے لئے آئے ہیں۔

مبنائے تعصب ...... اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کی قوموں میں جو تعصبات ہیں اس کا مبنی یہی ہے کہ ان کا دین و مذہب ہی اس قوم کے لئے مخصوص ہو کر آیا ہے۔ تو وہی خاندان اپنے دین کو لئے بیٹھا رہا ہے۔ دوسرے خاندان والوں نے کہا کہ ہمیں اس سے کیا تعلق، ان کے وطن کا ایک قانون ہے۔ یہ اس پر عمل کریں، لیکن جب یہ اعلان کیا گیا کہ میں کسی خاص وطن یا خاص قوم کی طرف نہیں آیا، میں تو دنیا کے سارے انسانوں کے لئے آیا ہوں، تو اب دنیا کی قوموں کو دعوت مل گئی فکر کی کہ جب ہمارے لئے بھی یہی قانون ہے تو ہم بھی اس میں فکر کریں اور اطاعت کریں۔ اب کوئی مانے یا نہ مانے یہ اس کی محرومی ہوگی۔ پیغام اللہ کی طرف سے عام ہے دنیا کی تمام اقوام کو خواہ کوئی کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو۔

قانونِ فطرت ...... بہر حال میں عرض کر رہا ہوں کہ مسلم پرسنل لاء کا اگر یہ مطلب ہے کہ شخصی قوانین، تو مسلمان کا من حیث القوم نہ کوئی شخصی قانون ہے اور نہ کوئی ذاتی قانون ہے۔ وہ خدا کا قانون ہے۔ ہم اس قانون کو دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کریں گے۔ مسلم پرسنل لاء کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ ہم اپنے قانون کو بچانے جائیں، نہیں

---

① السنن للنسائی، كتاب الغسل والتيمم، باب التيمم بالصعيد، ج: ۲، ص: ۲۰۳۔ حدیث صحیح ہے دیکھئے: صحيح وضعيف سنن النسائی ج: ۲ ص: ۹ رقم: ۴۲۷۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۱۔
③ پارہ: ۹، سورۃ الاعراف، الآیۃ: ۱۵۸۔

ہم اس کے تحفظ کے ساتھ ساتھ دنیا کی قوموں کو بھی دعوت دیں گے کہ تم بھی اس پر عمل کرو خواہ وہ شخصی چیز ہو، خواہ خاندانی چیز ہو۔ اس لئے کہ وہ قوانین فطرت کے مطابق ہیں۔ وہ انسان کے طبعی جذبات کے مطابق ہیں زبردستی کے قانون نہیں کہ عقل نہ مانتی ہو اور دل نہ مانتا ہو اور زبردستی اس کے اوپر ڈالا جائے، یہ بات نہیں بلکہ آدمی جب غور کرے گا، فطرت کے مطابق پائے گا۔ اس لئے ایک انسان کی زندگی اسی میں ہے۔ اس ماننے والے انسان کا نام ہے مسلمان اور مسلمان کی زندگی مہد سے لے کر لحد تک پیدائش سے لے کر موت تک اور اس کے درمیان میں جتنے اس کے افعال اور احوال ہیں، سب پر اسلام کا قانون لاگو ہے اور جتنی ہدایت ہیں وہ سب خدا کی طرف سے ہیں۔ وہ کوئی موضوع قانون نہیں کہ ہم نے بنالیا ہو۔

ذات انسان پر نفاذ قانون...... افعال کو چھوڑ کر انسان کی ذات پر اس وقت سے اسلامی قانون لاگو ہو جاتا ہے کہ اسے عقل بھی نہیں شعور بھی نہیں، تمیز بھی نہیں۔ آج پیدا ہونے والا بچہ جو بالکل ہی مضغہ گوشت (گوشت کا لوتھڑا) ہے نہ اسے عقل ہے نہ تمیز مگر اسلام کا قانون اس پر لاگو ہوا کہ پیدا ہوتے ہی نہلا دھلا کر اس کے دائیں کان میں اذان دو اور بائیں کان میں تکبیر کہو۔ سب سے پہلے اللہ کا نام اس کے کان میں پہنچاؤ اور کہو کہ اللہ اکبر، اللہ ہی بڑا ہے اور کسی میں بڑائی نہیں ہے اس کے دل میں بٹھا دیا جاتا ہے کہ عظمت خداوندی یہ تیرا جوہر ہے۔

"اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں" "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" "محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں"۔ جب آدمی ان بنیادی عقیدوں پر آ گیا اور یہ بات ایک بچے کے دل میں بیٹھ گئی۔ اب آگے عمل ہے، فرمایا کہ "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ" سب سے بڑا عمل یہ ہے کہ عبادت خداوندی ادا کرو۔ جب یہ بھی اس کے دل میں جما دیا آپ نے، آگے عام زندگی کے بارے میں ہے "حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ" عام فلاح و بہبود کی طرف آؤ۔

ذات انسان پر نفاذ قانون کی حکمت...... اب رہا یہ کہ وہ بچہ سمجھتا ہے یا نہیں۔ آپ کو فائدہ کیا ہے کہ دائیں کان میں اذان کہیں اور بائیں کان میں تکبیر کہیں، یہ تو ایسا ہے جیسے آپ نے کسی دیوار کے سامنے وعظ کہہ دیا، وہ دیوار کیا سمجھے گی۔ لیکن یہ چیز غلط ہے، بے شک اس بچہ کو عقل نہیں شعور نہیں، لیکن اس بچہ کا قلب ایک سفید تختی کی مانند ہے، جو اس پر چھاپو گے وہی چھپ جائے گا اور جب ہوش سنبھالے گا تو وہی کلمات کہتا ہوا ابھرے گا۔ جو آپ نے اس کے دل پر چھاپ دیئے ہیں۔ تو اگرچہ عقل و شعور نہیں مگر استعداد و قبولیت کی ہے، جو کلمہ اس کے کان میں ڈالیں گے وہ چھپ جائے گا اس کے دل کی سفید تختی پر، جیسے یہ ریکارڈنگ مشین ہے، ہم جو تقریر کر رہے ہیں وہ اس میں چھپتی جارہی ہے۔ اسے نہ عقل ہے نہ شعور ہے۔ ایک جامد محض چیز ہے لیکن ساری تقریر اس میں جم جائے گی۔ جب آپ اس کی کل اینٹھیں گے وہ ساری اگل دے گی جو اس کے اندر بھری ہوئی ہے۔

تو کیا ایک انسان کے بچے کا دل اس مشین سے بھی گیا گزرا ہے۔ انسان نے اپنی عقل سے اس کی تخلیق کی

ہے تو وہ عقل خودکتنی بڑی ہوگی اور اس بچے میں عقل تو ہے مگر نشوونما پائی ہوئی نہیں ہے۔ لیکن جو ہر موجود ہے جو آپ اس کے کان میں ڈال دیں گے وہ اس کے دل میں چھپ جائے گا۔

دورِ تربیت ...... اس سے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ بچے کی تربیت کا زمانہ یہ نہیں ہے جو ہم سمجھتے ہیں کہ پانچ برس کا ہو تو مکتب میں بٹھا دو، اب تربیت شروع ہوتی ہے۔ نہیں، فرماتے ہیں کہ پیدا ہوتے ہی تربیت شروع ہو جاتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہ مخاطب نہیں بن سکتا ہے۔ مگر ماں باپ کا کام ہے کہ ڈالیں اس کے اندر ایسی چیزیں کہ جو حق اور سچی ہوں۔

تو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ دودھ پیتے بچے کے سامنے کوئی برا کلمہ نہ کہیں، جو کلمہ کہیں گے وہی اس کے قلب میں چھپ جائے گا، وہی نشوونما پا کر ابھرے گا اور وہی کہے گا۔ اس لئے جو بات بھی اس کے سامنے کریں وہ حق اور سچی کریں، عمدہ کریں تاکہ اس کے دل میں وہی بات چھپ جائے، اسی طرح سے اس کی آنکھیں ایک آئینے کی مانند ہیں اس کے دل میں گو شعور وادراک نہیں لیکن آنکھیں تو کھلی ہوئی ہیں۔ تو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ماں باپ بچے کے آگے کوئی بے حیائی کی حرکت نہ کریں۔ اگر بے حیائی کے کام کرتے ہیں تو وہی اس کی آنکھ کے راستے سے جا کر اس کے دل میں چھپ جائیں گے اور جب وہ ہوش پائے گا تو وہ بے حیائی اور بے غیرتی کی باتیں کرتا ہوا ابھرے گا۔ تو کان میں اچھی بات ڈالو اور آنکھ کے سامنے اچھے نقش پیش کرو۔ خیالات اس کے دل میں اچھے جماؤ تاکہ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ اچھا بنے۔ اقوال بھی اس کے اچھے ہوں، افعال بھی اس کے اچھے ہوں۔ تو تربیت کا زمانہ یہ نہیں کہ پانچ چھ برس کے بعد آتا ہے بلکہ پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔

نہایت مختصر زندگی کا نہایت جامع قانون ...... فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں مخاطب ہیں ماں باپ کیوں کہ اس بچے کے اندر مخاطب بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ اسلامی قانون ایک انسان کے صرف افعال پر لاگو نہیں ہوتا، بلکہ ذات پر بھی لاگو ہے، اس لئے کہ یہ بچہ افعال ادا کرنے کے تو قابل نہیں مگر ذات تو اس کی موجود ہے۔

اسلام کا قانون اس کی ذات پر آ گیا تو وہ قانون زندگی سے شروع ہو جاتا ہے۔ آپ نے اذان کہہ دی، تکبیر کہہ دی، اب نماز باقی رہ گئی۔ علماء لکھتے ہیں کہ نماز جنازہ وہ نماز ہے اس نے اذان اور تکبیر کی۔ آج تو آپ نے تکبیر اور اذان کہی اور جاتے ہوئے اسے آپ نے نماز پڑھ کر رخصت کیا۔ تو ایک مسلمان کی زندگی اذان اور نماز کے درمیان میں ہے۔ گویا ابتداء میں بھی اسے اللہ کے نام نے گھیر رکھا ہے اور انتہاء بھی خدا کی عبادت پر جا کر ہوگی تو ابتداء کرو اس کی اذان اور تکبیر سے اور انتہاء کرو اس کی نماز کے اوپر، تو ساری زندگی اس کی دو چیزوں کے درمیان آ جائے گی، عظمت خداوندی، توحید خداوندی، توحید الٰہی، اقرار رسالت اور نماز کا جذبہ اور ختم ہوگا وہ نماز کے اوپر تو ظاہر بات ہے کہ جنازہ کی نماز تو آپ ہی پڑھیں گے میت کو خبر نہیں کہ کیا ہو رہا ہے وہ تو بیچارہ کفن پہنے لیٹا ہوا ہے مگر ذات تو اس کی موجود ہے۔ نفس تو موجود ہے۔ تو اسلام کا قانون اس کی ذات پر لاگو ہوا افعال تو بعد کی چیزیں

ہیں۔ تو جو قانون ذات پر لاگو ہو وہ افعال پر کیوں لاگو نہ ہوگا۔ وہ اقوال کی اصلاح کیوں نہ کرے گا۔ وہ اعمال کی اصلاح کیوں نہ کرے گا تو انسان کی ذات اور افعال سب گھرے ہوئے ہیں اسلامی قانون کے تحت۔

تعلیم فطرت...... ظاہر بات ہے کہ یہ قانون اگر غیر مسلم بلکہ سارے انسان تسلیم کریں تو کیا یہ کوئی برائی کی چیز ہے کہ ابتداء ہی میں خالق کی عظمت دل میں بیٹھ جائے۔ یہ تو ہر قوم کے غور کرنے کی چیز ہے کہ کتنی پاکیزہ تعلیم ہے کہ پیدا ہوتے ہی توحید الٰہی اور رسالت کی شہادت اس کے دل میں ڈال دو۔ "حَيَّ عَلَى الصَّلٰوة" کہہ کر اسے عبادت خداوندی پر آمادہ کرو۔ معاذ اللہ یہ کوئی بری چیز ہے؟

غور کیا جائے تو یہ فطرت کے مطابق تعلیم ہے اور یہ تعلیم قوم مسلم کے ساتھ مخصوص نہیں یہ ساری دنیا کے انسانوں کے لئے ہے۔ کوئی غور نہ کرے یہ اس کی محرومی کی بات ہے لیکن اسلام نے تو غور کا دروازہ کھول دیا ہے۔ مگر جب آپ یوں کہیں گے کہ یہ ہمارا قانون ہے اور وہ ہمارا قانون ہے، میری قوم کا قانون الگ ہے اور جب آپ یہ کہیں گے کہ نہ ہمارا قانون نہ تمہارا قانون۔ یہ تو خدا کا قانون ہے جس کے مکلف ہم سب قرار دیئے گئے ہیں، اب موقع آئے گا ان کے غور و فکر کا کہ جب ہمیں بھی پیغام دیا گیا ہے تو ہم بھی اس پر غور کریں۔

اسلامی پرسنل لاء...... اس لئے میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ ماننے کے لحاظ سے یہ مسلم پرسنل لاء ہے اور حقیقت کے لحاظ سے یہ اسلامی پرسنل لاء ہے، یہ خدا کا قانون ہے جو سب کے لئے عام ہے۔ بچپن سے لے کر موت تک اور موت سے لے کر قبر تک اور قبر سے لے کر میدان حشر تک، اور میدان حشر سے لے کر جنت تک اور جنتوں میں داخل ہونے کے بعد ابدالآباد تک یہی قانون چلتا رہے گا اور اسی میں ترقی ہوتی رہے گی۔ حشر میں اور ہوگی، جنتوں میں جا کے کچھ اور ہوگی۔ مگر بنیادی طور پر یہی قانون رہے گا اور انسان کی ترقی اسی سے ہوتی رہے گی۔

پرسنل لاء کا تحفظ...... بہر حال مسلم پرسنل لاء کا اصل مقصد یہ ہے کہ عائلی قوانین جو ان کی ذات پر لاگو ہیں ان کا تحفظ ہو، حقیقت یہ ہے کہ ہماری کسی سے بھی لڑائی نہیں ہے اور نہ ہم کسی قوم سے لڑتے ہیں۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ اس قانون کو تم بھی اختیار کرو اور اگر نہیں اختیار کرتے تو کم سے کم ہم کو تو عمل کرنے دو، تم اس میں کیوں رکاوٹیں ڈالتے ہو؟

ان رکاوٹوں کا دور کرنا یہ ہمارا سب سے بڑا مقصد ہے کہ ہمیں عمل کرنے دو، اگر تم محروم رہنا چاہتے ہو اور نہیں عمل کرتے تو عمل کرنے والوں پر پابندیاں کیوں عائد کرتے ہو؟ کیوں اس میں رکاوٹ ڈالتے ہو تو مقصد اصلی ان قوانین کا تحفظ ہے۔

اب اگر اس تحفظ کے سلسلے میں آپ لفظوں سے دباؤ ڈال سکیں تو لفظوں سے دباؤ ڈالیں، کوئی اور تجویز ہو اثرات ڈالنے کی آپ اسے اختیار کریں، مگر مقصود اصلی حفاظت ہے اس قانون خداوندی کی تو اس کو ہم محسوس کریں اور اس کا احساس ہمیں ہونا چاہئے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حفاظت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ قانون کوئی بت یا تصویر ہے، وہ رکھا ہوا ہو اور آپ شور

مچائیں کہ صاحب! وہ ہے قانون پرسنل لاء کا، اس کی حفاظت آپ کریں۔

طریق تحفظ...... قانون کی حفاظت یہ ہے کہ آپ اس کو استعمال کرنا شروع کر دیں، پس وہ محفوظ ہو جائے گا اور تم بھی محفوظ ہو جاؤ گے۔ لیکن شور مچاؤ کہ وہ رکھا ہوا ہے قانون، تو قانون کوئی بت ہے جس کی حفاظت کر رہے ہیں یا کوئی وہ تصویر ہے؟ سب سے بڑی حفاظت یہ ہے کہ آپ اسے اپنے اندر رچالیں، اس پر عمل درآمد شروع کر دیں تو قانون مجسم بن جائیں گے۔

ذرائع حفاظت کی سعادت...... پرسنل لاء کوئی مٹنے والی چیز نہیں ہے، کوئی کتنا ہی مٹائے وہ خود مٹ سکتا ہے اس لئے کہ پرسنل لاء کے قانون کی جڑیں قرآن اور حدیث ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ خود اسلام ہے اور اسلام دوامی زندگی لے کر آیا ہے مٹنے کے لئے نہیں آیا، اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود حق تعالیٰ نے لی ہے۔

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ.﴾ ① ''ہم نے یہ ذکر (قرآن) اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں''۔ تو حفاظت ہوگی اللہ کی، اس میں کوئی خلل نہیں ڈال سکتا ہے۔ ہمارے لئے سعادت یہ ہے کہ ہم ذریعہ اور سبب بن جائیں اس کی حفاظت کا۔ حافظ حقیقی تو حق تعالیٰ ہیں لیکن اگر ہم وسیلہ بن گئے تو ہمیں سعادت حاصل ہو جائے گی ورنہ اگر ہم عمل نہ کریں اور نہ حفاظت کریں پھر بھی مٹنے والا نہیں ہے۔

﴿وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ.﴾ ② ''تم اگر سب مل کر اس دین کی حفاظت سے پھر گئے تو تمہیں نکال دیا جائے گا اس دین سے اور دوسری قومیں لا کھڑی کر دی جائیں گی''۔

وہ اس دین کی حفاظت کریں گی، اس لئے سعادت تو ہماری ہے اگر ہم سبب اور ذریعہ بنیں اس کی حفاظت کا۔ ہم خود حافظ نہیں کہ اس کی حفاظت کریں۔ حفاظت کرنے والا حفاظت کر رہا ہے۔

اس قانون کے خلاف کتنے کتنے مصائب، کتنے بڑے بڑے دشمن کھڑے ہوئے، لیکن آج ان دشمنوں کا نام ونشان نہیں اور قانون خداوندی پھر اسی شان سے موجود ہے، قرآن بھی محفوظ، حدیث بھی محفوظ، فقہ بھی محفوظ ساری چیزیں اپنی جگہ ہیں، انکار کرنے والے گزر گئے، آج کوئی نقش پا بھی ان کا پتہ بتلانے والا نہیں یہ قانون تو اپنی جگہ رہے گا حفاظت خداوندی سے، ہم اگر ذریعہ بن جاویں اس کی حفاظت کا ہمیں سعادت حاصل ہو جاوے گی۔ انگلی کٹا کر شہیدوں میں داخل ہو جاویں گے ورنہ یہ تو محفوظ رہنے والی چیز ہے۔

ہم جو شور مچا رہے ہیں وہ درحقیقت اپنی حفاظت کے لئے، پرسنل لاء کی حفاظت کے لیے نہیں، وہ تو محفوظ ہے ہم جتنا اسکا دامن پکڑلیں گے اتنا ہی محفوظ ہو جائیں گے کیوں کہ محفوظ کا دامن پکڑ کر آدمی خود محفوظ ہو جاتا ہے آپ سے پرسنل لاء کی حفاظت نہ ہوگی، بلکہ پرسنل لاء سے آپ کی حفاظت ہوگی تو ہم اپنی حفاظت کے لیے اسے دانتوں سے مضبوط پکڑیں اور ہم نہیں چاہتے کہ اس میں کوئی خلل انداز ہو۔ ابھی تو ہم مد مقابل سے لڑنے کو تیار

---

① پارہ: ۱۴، سورۃ الحجر، الآیۃ: ۹۔ ② پارہ: سورۃ محمد، الآیۃ: ۳۸۔

گیا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے اندر کوئی خلل ڈالے۔ حکم خداوندی یہی ہے۔

تو واضح ہو گیا کہ پرسنل لاء کا قانون اسلامی قانون ہے کسی مخصوص قوم کا قانون نہیں، ماننے والے کا نام مسلم ہے تو وہ مسلم قانون کہلائے گا نہ ماننے والے کا نام غیر مسلم ہے۔ تو غیر مسلم کا قانون نہیں رہا ورنہ وہ حقیقت میں انسانی قانون ہے۔ انسان کی بہتری اور اس کی حفاظت اور ان کی خوبی اور دنیا و آخرت کے بھلائی کے لئے یہ قانون بھیجا گیا۔

دین اور رسمی قوانین کا فرق...... اس قانون کا حاصل فقط یہی نہیں کہ آپ چند رسمیں ادا کریں۔ بلکہ قانون کی حفاظت اور تحفظ کا حاصل یہ ہے کہ اس پر عملدر آمد کر کے آپ ظاہراً افعال بھی ادا کریں، مگر ہر فعل میں قربت اور تعلق پیش نظر رہے، یہی فرق ہے دین میں اور رسمی قانون میں۔

رسمی قوانین جو سلطنتیں طے کرتی ہیں وہ صرف افعال پر لاگو ہوتے ہیں۔ لیکن خدائی قانون دلوں کے اوپر لاگو ہوتا ہے۔ اگر کسی کو چوری کرتے ہوئے پکڑ لیں تو قانوناً اس کو سزا دیں گے۔ لیکن اس کے دل میں سے کوئی چوری کا جذبہ نکال دے۔ یہ کوئی دنیاوی قانون نہیں کر سکتا، جیل خانے میں جا کر بھی چور کا جذبہ یہی رہے گا کہ اب اگر چھ مہینے کے بعد چھوٹ جاؤں گا تو پھر اس سے بڑی چوری کروں گا۔ پھر چھ ماہ جیل میں رہوں گا۔ مگر اس کے بعد میں ایک اور زبردست ڈاکہ ڈالوں گا۔

تو بھائیو! دنیا کا قانون تو جذبات پر بھی لاگو نہیں ہوتا۔ ذات پر تو کیا ہو وہ تو اور بھی اوپر کی چیز ہے۔ صرف افعال پر لاگو ہوتا ہے۔ منظرِ عام پر وہ قانون چلتا ہے۔ لیکن دینی قانون اور انبیاء کا قانون وہ ہے کہ وہ فقط چوری ہی سے نہیں روکتا بلکہ چوری کی نفرت بھی دل کے اندر بٹھا دیتا ہے۔ وہ ڈاکہ زنی ہی سے نہیں روکتا بلکہ ڈاکہ کی غلاظت اس کی سامنے ایسی آتی ہے جیسے پاخانہ کی غلاظت۔ تو جرائم کی نفرت بٹھا دینا، جرائم سے بیزار بنا دینا یہ قانون خداوندی کا کام ہے۔

مسلم پرسنل لاء کا منشاء...... مسلمانوں کا شخصی قانون ہو یا عائلی قانون ہو اس کا منشاء فی الحقیقت یہی ہے کہ ظاہر میں یہ عمل کرو اور باطن میں خدا کی طرف رجوع کرو۔ اس لئے کہ قانون دونوں چیزوں پر لاگو ہوتا ہے۔ تمہارے دلوں پر بھی، تمہاری زبانوں پر بھی، تمہارے ہاتھوں اور چہروں پر بھی۔ نہ فقط دل کی اصلاح، نہ فقط ہاتھ پیر کی اصلاح، نہ فقط زبان کی اصلاح بلکہ انسان کے مجموعے کی اصلاح پیش نظر ہے کہ اس کا ہاتھ پیر بھی درست ہو، اس کا قلب بھی درست ہو۔ ظاہر و باطن سے وہ اس پر عمل درآمد کرے، تو یہ شور مچانا محض اس لئے نہیں کہ چند رسمیں ہیں جنہیں ہم پورا کرنا چاہتے ہیں یا چند رسمیں باقی ہیں جن کی حفاظت کرنا ہمارا مقصود ہے نہیں۔ بلکہ یہ اللہ کا دین ہے جس کے پیش نظر انسان کی فلاح و بہبود ہے ہم اس کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں اور دنیا کی قوموں کو بتلانا چاہتے ہیں کہ تم بھی اس قانون کو اپناؤ۔ ہم اس کی حفاظت کر کے اپنی حفاظت کرنا چاہتے ہیں اور دنیا کی قوموں کو بتلانا چاہتے ہیں کہ تم بھی اس قانون کو اپناؤ۔ موازنہ اور مقابلہ کر کے دیکھو، ذاتی زندگی ہو یا افعال کی زندگی ہو یہ زندگی

بہتر ہے یا وہ بہتر ہے جو تم تجویز کر رہے ہو۔ یہ بھی ہمارے مقاصد میں داخل ہے۔

مسلم پرسنل لاء کے لئے سربراہان مذاہب کا اتحاد...... تو پرسنل لاء کے خلاف ایک شور اٹھا، اس سے لوگ پریشان ہوئے اور آل انڈیا مسلم بورڈ قائم کر دیا۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ یہ شور مضر نہیں ثابت ہوا گو وہ فی نفسہ کوئی اچھی چیز نہیں سمجھا جاتا۔ جنہوں نے پرسنل لاء کی مخالفت کی واقعی انہوں نے سخت غلطی کی۔ گویا ایک شر اٹھا۔ مگر اس شر میں سے ہمارے لئے خیر نکل آئی۔

پہلی خیر تو یہ نکلی کہ سارے مسلمان متحد ہو گئے کہ ہمیں اس کی حفاظت کرنی ہے۔ آج آپ کے سامنے یہ سربراہان مذاہب بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہر فرقے اور ہر طبقے کے علماء موجود ہیں، ہر تنظیم کے سربراہ موجود ہیں۔ سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے ہیں، اس شر میں سے ہی تو یہ خیر نکلی ہے۔ اگر پرسنل لاء کے مخالف نہ کھڑے ہوتے تو ان کے دل میں یہ جذبہ کہاں سے پیدا ہوتا کہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں تو اتحاد جیسی نعمت اس شر نے ہمیں بخشی، تو یہ شر ہمارے لئے مضر ثابت نہیں ہوا۔ ہم تو انہیں محسن سمجھتے ہیں جو ایک درجے میں پرسنل لاء کی مخالفت کر رہے ہیں کہ ان کی مخالفت سے ہم میں جذبۂ اتحاد پیدا ہو گیا ؎

خدا شرے بر انگیزد کہ خیرے دراں باشد

بعض وقعہ شر اٹھتا ہے مگر اس شر میں سے خیر نکل آتی ہے۔ ہمارے لئے بھی اس میں سے خیر نکل آئی کہ ہم کو نعمتِ اتحاد ملی۔

یہ بات نہیں کہ رسمی طور پر ہم اتحاد کو اچھی بات سمجھ رہے ہیں بلکہ یہ ایک نعمت خداوندی ہے۔ حق تعالیٰ نے بھی اسے نعمت فرمایا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگ لڑتے تھے، آپس میں عداوتیں بڑھی ہوئی تھیں۔ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے، لڑائیاں ٹھنی ہوئی تھیں، ذرا ذرا سی بات پر جنگیں اٹھتی تھیں۔ پانی پلانے پر جھگڑا، پہلے پانی کون پلائے، اس پر قبیلے لڑ پڑتے تھے اور یہ لڑائی پچاس پچاس، سو سو برس جاری رہتی تھی، اور مرنے والے وصیت کر جاتے تھے کہ لڑائی بند نہ ہونے پائے، اسے جاری رکھنا ہمارے خاندان کی ناک نہ کٹ جائے۔ باتیں چھوٹی چھوٹی ہوتی تھیں مگر لڑائیاں بہت بڑی بڑی۔ عناد و دشمنی عام، آپس میں رقابتیں مزاج بن گیا تھا، اسلام نے آکر انہیں متحد کر دیا۔ تو اس اتحاد کو حق تعالیٰ نے ایک آیت میں نعمت فرمایا ہے کہ:

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً﴾ "اس وقت کو یاد کرو جب تم آپس میں دشمن تھے، ایک دوسرے کے نام سے بیزار تھے"۔ ﴿فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ﴾ اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ ﴿فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾ ① سو تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی ہو گئے۔ یہ اس کی دی ہوئی نعمت تھی کہ تم خود آپس میں جمع نہیں ہو سکتے تھے۔

① پارہ: ۴، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۱۰۳۔

نعمت تالیف قلوب..... تو اس اتحاد اور تالیف قلوب کو حق تعالیٰ نے انعام خداوندی فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ دلوں کا ملا دینا یہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے ساری تنظیمیں آپ اکٹھی کریں مگر دلوں کا ملا دینا یہ اللہ ہی کا کام ہے۔

خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کہ آپ کی تائید سے بڑھ کر اور کس کی تائید قوی ہو سکتی ہے۔ لیکن حق تعالیٰ نے فرمایا کہ:﴿لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ﴾ [1] ''اے پیغمبر! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اگر زمین بھر کر بھی سونا خرچ کر دیتے تو دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے۔ دلوں کا جوڑنا اللہ کا کام ہے''۔

یہ جو ہمارے بزرگ جو بیٹھے ہوئے مختلف مسالک، مختلف فرقوں کے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض کندھے سے کندھا ملائے ہوئے نہیں بیٹھے بلکہ دل بھی ان کے جڑے ہوئے ہیں۔ دلی جذبہ بھی یہی ہے کہ واقعی ہم حفاظت کریں اپنے دین کی۔ تو تالیف قلوب یہ تو اللہ ہی کا کام تھا اور واقع جب ہوا، جب شر اٹھا اور پرسنل لاء کے مخالف کھڑے ہوئے، تو ہم کو اللہ نے اس شر سے ایک بڑی نعمت عطا کر دی اور اسلام کا شیوہ ہمیشہ رہا ہے کہ جب بھی وہ ابھرا ہے مخالفتوں میں ابھرا ہے۔ اگر مخالفین نہ ہوں اور ان سے ٹکراؤ نہ ہو تو اس کی برکتیں نہیں کھل سکتیں، اس کے اندر جو خیر کے پہلو ہیں وہ نمایاں نہیں ہو سکتے تھے۔

مسلم پرسنل لاء کی مخالفت کے فوائد..... غور کیا جائے تو معلوم ہوا کہ ترقی نام ہی ٹکراؤ کا ہے۔ اگر دنیا میں ٹکراؤ نہ ہو تو ترقی نہیں ہو سکتی۔ مثلاً پانی ہے، ہزاروں برس سے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اس میں کوئی ترقی نہیں کہ پہلے سمندر کی موجیں اٹھتی تھیں پہاڑوں کی شکل میں اور اب گلدستوں کی صورت میں آنے لگی ہوں، پھول بوٹے بن گئے ہوں۔ ویسی ہی موجیں ہیں جیسی دس ہزار برس پہلے اٹھتی تھیں، ویسے ہی ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ کوئی ترقی نہیں۔ آگ ہے اس میں کوئی ترقی نہیں، جیسے پہلے لپٹ اٹھتی تھی ویسے ہی آج بھی لپٹ اٹھ رہی ہے۔ وہ پھول بوٹے نہیں بناتی، زمین ہے اگر تنہا چھوڑ دو تو اس میں کوئی ترقی نہیں، جیسے پہلے پامال تھی ویسے ہی آج بھی پامال ہے۔ آپ جیسے اسے روندتے ہیں روندی جاتی ہے۔ لیکن پانی کو اگر آپ ملا دیں مٹی سے اور ٹکرا دیں تو گارا بنے گا اور گارا بننے کے بعد کہیں برتن بنیں گے، کہیں اینٹیں بنیں گی، کہیں سامان بنے گا۔ بس ترقی شروع ہو گی۔

تو آگ پانی کے ٹکراؤ سے ترقی ہوتی ہے، الگ الگ رہنے میں کوئی ترقی نہیں ہے۔ آگ کو آپ ہوا سے ٹکرا دیں تو جو (فضا) کے عجائبات پیدا ہوں گے کہیں گرج ہو گی، کہیں بادل ہوں گے، کہیں بجلیاں چمکیں گی۔ اگر ہوا اور آگ دونوں الگ الگ رہیں تو نہ بجلی نظر آئے گی نہ کڑک نظر آئے نہ بارش برسے گی۔ تو بہر حال ٹکراؤ ہی میں ترقی ہے۔

ایک بہت بڑا عالم ہے وہ ہزارہا مسائل جانتا ہے لیکن پھر اس کے اندر ترقی نہیں۔ لیکن اگر اس کو کسی جاہل

[1] پارہ: ۱۰، سورۃ الانفال، الآیۃ: ۶۳.

سے ٹکرا دیا جائے اور وہ اعتراضات کرے، تو اعتراضات کے جواب میں نئی نئی چیزیں نکلیں گی اور نیا علم سامنے آئے گا۔ اس طرح سے ایک عالم کے علم کی ترقی شروع ہو جائے گی۔

تو جہالت بھی ایک نعمت ہے بغیر اس کے ٹکراؤ کے علم کے اندر ترقی پیدا نہیں ہوتی۔ ایک حکیم کا مقولہ ہے کہ: "اَلْقَلْبُ مَیِّتٌ وَّحَیَاتُهٗ بِالْعِلْمِ وَالْعِلْمُ مَیِّتٌ وَحَیَاتُهٗ بِالْمُنَاظَرَةِ" "دل مردہ ہے اس کی زندگی ہے علم اور علم مردہ ہے اس کی زندگی بحث اور نظر اور ٹکراؤ سے ہے"۔

اور علم کی ٹکر جہالت ہی سے ہوگی۔ علم تو علم سے ٹکراتا نہیں۔ تو جتنا جاہل ٹکرائے گا عالم سے اتنا ہی اس کے علم میں وسعت شروع ہو جائے گی۔

ایک بہت زبردست پہلوان ہے، ہزاروں داؤ پیچ جانتا ہے جو اس کی جھولی میں محفوظ پڑے ہوئے ہیں، اگر کشتی لڑنے پر آ جائے تو داؤ پیچ میں ترقی ہوگی وہ اپنے بچانے کے لئے نئے نئے داؤ پیچ ایجاد کرے گا۔ نئی نئی صورتیں پیدا کرے گا، تو جب تک دو پہلوانوں کی ترقی نہ ہو تو فن کی ترقی نہیں ہوتی۔ ترقی درحقیقت نام ہی تصادم کا ہے۔ اگر تصادم نہ ہو تو ترقی ناممکن ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اسی تصادم کو بھی فضل خداوندی ظاہر فرمایا ہے اور فرمایا کہ: ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ ① "اگر اللہ ایک قوم کو دوسری قوم سے نہ ٹکرائے تو زمین فاسد ہو کر رہ جائے اور قومیں بیٹھ جائیں"۔

ان کی ترقی رک جائے، لیکن اللہ ٹکراتا ہے ٹکرانے کے بعد پھر نئے نئے عجائبات تمدن کے پیدا ہوتے ہیں۔ جب کوئی جنگ ہوتی ہے تو جنگ کے بعد نئے نئے نظریات پیدا ہوتے ہیں۔ تمدنی ترقی ہوتی ہے۔ اگر کوئی قوم قوی ہے۔ تو اس ٹکرانے سے اس کی نخوت (بھرم بازی) ٹوٹتی ہے۔

اور جو ضعیف ہے اس کی غفلت ٹوٹتی ہے۔ تو دونوں فرقوں کی بھلائی ٹکرانے کے اندر ہوتی ہے۔ ٹکریں نہ ہوں تو کوئی ترقی ممکن نہیں۔ تو پرسنل لاء کو ٹکرایا، لوگوں نے مخالفت کی، اعتراضات کئے۔ اس سے ہر فرقے کے علماء کھڑے ہوئے۔ ہر تنظیم کے سربراہ کھڑے ہو گئے، انہوں نے ان اعتراضات کے جواب دیئے۔ اس سے مسلم پرسنل لاء کا مسئلہ پھیل گیا اور اتنی شقوق کھل گئیں کہ اس سے پہلے ہم بھی نہیں جانتے تھے کہ اس کے اندر اتنی شقوق ہیں۔ آج سینکڑوں رسالے شائع ہو گئے سینکڑوں مضامین چھپ گئے۔ سارے پہلو کھول کر رکھ دیئے۔ پتہ نہیں تھا کہ اس پرسنل لاء میں اتنا علم بھرا ہوا ہے۔ ہر ایک نے اپنے ذوق اور ظرف کے مطابق علم نکالا۔ اتنے پہلو وا شگاف کئے کہ اگر مخالف اعتراض نہ کرتے تو کبھی یہ پہلو ہمارے سامنے نہ آتے بس، اتنا جانتے تھے کہ قانون اللہ کا ہے۔ بھائی عمل کرلو اس پر۔ مگر ٹکر سے آپس میں ترقی ہوئی، عجیب لطائف اور نکات پیدا کئے علماء نے۔ اگر یہ ٹکر نہ ہوتی تو پرسنل لاء کا مسئلہ واضح نہ ہوتا۔ حق تعالیٰ جب چاہتے ہیں کہ اسلام کے کسی مسئلہ کو کھول کر واضح کریں تو جہلاء کو ٹکرا

① پارہ: ۲، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۵۱.

دیتے ہیں کہ تم اعتراضات کرو اور مخالفت کرو، جتنی مخالفت ہوگی علماء اس کے جواب میں کھڑے ہو جائیں گے اور جو گوشے چھپے ہوئے تھے وہ کھل کر سامنے آ جائیں گے۔

اسی لئے کفار کو ٹکر دی گئی مسلمانوں سے، فساق کو ٹکر دی گئی متقیوں سے، منافقوں کو ٹکر دی گئی مخلصوں سے تاکہ مخلص کا اخلاص کھل جائے، منافق کا نفاق کھل جائے اور جو چیز اصل ہے وہ کھل کر برسرِ عام آ جائے۔

تو واقعہ یہ ہے کہ پرسنل لاء کی مخالفت ہمارے لئے بڑی نعمت ثابت ہوئی۔ اگر یہ نہ ہوتی تو اتنا بڑا اتحاد جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ نہ ہوتا۔ اس اتحاد سے جو حفاظت ہو رہی ہے پرسنل لاء کی وہ نہ ہوتی۔ اس حفاظت سے رعب کی جو کیفیت مخالفین کے دلوں میں پیدا ہوگئی وہ نہ ہوتی۔ ہزاروں مسلمان جو پرسنل لاء کو سمجھتے ہوئے نہ مانتے تھے وہ اچھی طرح مان گئے۔ تو ایک نعمت کیا ہزاروں نعمتیں مل گئیں۔ اس اعتبار سے تو ہم شکر گزار ہیں مخالفت کرنے والوں کے کہ اگر وہ مخالفت نہ کرتے تو ہمیں یہ نعمتیں نہ ملتیں۔ اور وہ زیادہ مخالفت کر کے دیکھیں، مسئلہ اور زیادہ واضح ہوگا۔

اور ممکن ہے کل کو اس کھلے ہوئے مسئلے کی لپیٹ میں وہ بھی آ جائیں اور وہ بھی کہیں بھائی! وہی بات ٹھیک تھی جس سے لڑ رہے تھے، اسے دیکھو اور جب دیکھیں گے تو اختیار کرنے پر مجبور ہو جاویں گے۔ تو یہ مخالفت ذریعہ بن جائے گی ان کی موافقت کا، یہی مخالفت ذریعہ بنے گی پیروی کرنے کا۔ تو ان کے لئے بھی راستہ ہموار ہو رہا ہے۔

مبنی برحقیقت قانون ...... اور ہمارے لئے تو اللہ نے علمی اور نظری راستہ پیدا کر ہی دیا، بہت سوں میں اب استعداد پیدا ہو رہی ہے غور و فکر کی اور استعداد کے بعد جب وہ غور و فکر کریں گے تو فطری قانون پر آ کر رہیں گے۔ یہ مصنوعی قوانین سب ختم ہو جائیں گے۔

باپ کا بیٹا ہونا یہ کوئی فرضی بات تھوڑا ہی ہے کہ جسے چاہیں آپ کہہ دیں کہ یہ بیٹا ہے بس وہ بیٹا بن گیا۔ جسے چاہیں آپ کہہ دیں کہ یہ باپ ہے وہ باپ بن گیا۔ باپ بیٹا ہوتا ہے جزئیت کے تعلق سے کہ وہ باپ کا جزو ہے، اس کے نطفے سے ہے اس لئے وہ اس کا بیٹا ہے۔ محض منہ کے بولنے سے جز نہیں بن جائے گا۔ کسی شخص کا محض نام لینے سے بیٹا بنا دینا درحقیقت فرضی اور مصنوعی بات ہوگی۔ حالاں کہ اس کا تعلق خلقت سے ہے۔ خدا ہی باپ بناتا ہے خدا ہی بیٹا بناتا ہے، وہی ایک کے اندر سے دوسرے کو نکالتا ہے، اس کے اجزاء منتقل ہوتے ہیں دوسرے کے اندر جس سے وہ بیٹا بن جاتا ہے۔ یہی بن جاتی ہیں۔ ﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ ① ”وہ مردہ سے زندہ کو نکال دیتا ہے، ایک قطرہ پانی سے جو مردہ محض ہے“۔

زندہ انسان پیدا کرتا ہے اور اس زندہ انسان میں سے پھر وہ قطرہ آگے کو چلتا ہے تو زندہ میں سے مردہ کو نکال دینا اور مردہ میں سے زندہ کو پیدا کرنا، یہ تو اللہ کا کام ہے کسی انسان کا کام نہیں ہے۔ تو ایک انسان کا جزء بن جائے گا دوسرا انسان۔ وہ جزء زبان کی حرکت سے تھوڑا ہی بنے گا۔ وہ تو خلقتاً بنا ہوا ہے۔

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۱۹۔

جو بیٹا ہے وہ بیٹا ہے، جو باپ ہے وہ باپ ہے، تو ظاہر بات ہے کہ جب اس حقیقت پر وہ غور کریں گے وہ خود نادم ہوں گے اگر عقل رکھتے ہوں گے کہ بھائی! محض منہ سے بیٹا کہہ دینے سے بیٹا کیسے بن گیا اور بیٹا بھی حقیقی کہ وراثت میں بھی شریک اور حقوق میں بھی۔ یہ سب فرضی کارخانہ ہے کہ ہم نے بیٹھ کر خیال کر لیا بس ہو گیا تو باپ بیٹا ہونا خیالات سے تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ یہ تو خلقت ہے تخلیق خداوندی ہے، جتنی چیزیں قانون کی بنائی جاتی ہیں۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ معتوبی ہوتی ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا قانون جو آتا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ اگر چہ دوسری قومیں اپنے اقتدار کی وجہ سے، اپنے تحفظات کی وجہ سے قانون ایسے بناتی ہیں کہ وہ محفوظ ہو جائیں۔ دوسرا چاہے پامال ہو جائے لیکن اللہ کے تو سب بندے ہیں، وہ تو سب کا خیر خواہ ہے۔ اس لئے وہ قانون بھیجتا ہے سارے انسانوں کی ہدایت کے لئے، اس لئے سب ہی بنی آدم کو اس پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔

پرسنل لاء کی خدمت...... بہر حال اب اس لحاظ سے میں عرض کروں گا کہ اہل بنگلور نے جو مدارات کی ہے آنے والوں کی اور جو مہمانداری کی اور اخلاقی بلندیوں کا ثبوت دیا وہ فی الحقیقت ہمارے گوشت پوست کی خدمت نہیں۔ بلکہ وہ خدمت کی ہے پرسنل لاء کی۔ وہ خدمت کی ہے اتحاد طبقات کی، وہ خدمت کی ہے تمام فرقوں کے متحد ہونے کی۔ تو یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ ہم الفاظ میں شکریہ ادا نہیں کر سکتے لیکن پھر بھی انسان کے اوپر فرض ہے کہ شکریہ ہی ادا کرے اللہ کا بھی اور بندوں کا بھی۔ "مَنْ لَّا یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ." ① "جو بندوں کا شکر گزار نہیں وہ اللہ کا بھی شکر گزار نہیں"۔

اس لئے کہ اس نے جو کام کیا ہے وہ کیا ہے اللہ ہی کی توفیق دینے سے تو اولاً اللہ کا شکر ہوتا ہے پھر وسائل کا شکر ہوتا ہے۔ تو بجائے اس کے کہ ہم آپ کا شکر ادا کرتے یہ آپ کی عالی حوصلگی ہے کہ آپ ہمارا شکر ادا کر رہے ہیں۔ ؎

دے بھی رہے ہیں شرما بھی رہے ہیں

فی الحقیقت یہ شکریہ آپ کے لئے ہے اس وقت تک جب تک آپ کی نسلیں باقی ہیں، آپ کے لئے دعاء ہے، اس وقت تک جب تک دنیا میں آپ کا نام و نشان باقی ہے۔ تو اللہ آپ کو بھی دوامی کرے اور خدا کرے کہ ہمارا شکر بھی دوامی ہو۔

دوامِ شکر...... انسان تو ہے ہی دوامی، انسان ازلی نہیں بلکہ ابدی ہے۔ ازلی تو اس لئے نہیں کہ اللہ نے پیدا کیا تو ہو گیا۔ اس سے پہلے انسان کا نام و نشان نہیں تھا۔ قرآن کریم نے فرمایا: ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا﴾ ② "انسان پر ایک بڑا زمانہ گزر چکا ہے کہ لاشئ محض تھا اور اس کا چرچا بھی نہ تھا زبانوں پر"۔ کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ زید کون ہے اور بکر کون ہے ﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ﴾ ③ "ہم

---

① السنن للترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی الشکر لمن احسن الیک، ج: ٧، ص: ٢٠٩۔

② پارہ: ٢٩، سورۃ الدھر، الآیۃ: ١۔ ③ پارہ: ٢٩، سورۃ الدھر، الآیۃ: ٢۔

نے پیدا کیا انسان کو ایک بوند کے لچھے سے، پٹختے رہے اس کو“۔

تو ہمیں پیدا ہونے کے بعد ہی معلوم ہوا کہ ہم معدوم تھے۔ اس سے پہلے ہمیں اپنے عدم کا بھی علم نہ تھا۔ زمانہ دراز گزر چکا ہے کہ انسان نہیں تھا۔ اللہ نے پیدا کیا، لیکن جب پیدا کر دیا تو اب وہ مٹنے والا نہیں اب وہ ابدی ہے۔

موت کے معنی فنا کے نہیں ہیں کہ آدمی موت آنے کے بعد فنا ہوگیا، یا ختم ہوگیا ایسا نہیں ہے بلکہ موت کے معنی منتقل ہو جانے کے ہیں۔ اس دار سے دوسرے دار میں، اس جہان سے دوسرے جہان منتقل ہونا۔ تو انتقال ایک دار سے دوسرے دار کی طرف، ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف یہ تو ہوتا رہے گا، مگر مٹ جائے انسان، یہ نہیں ہوسکتا، نو مہینے آپ ماں کے پیٹ میں رہے ایک عالم میں تھے۔ اس سارے عالم کی عمر نو مہینے کی تھی وہاں سے انتقال ہوا تو دنیا میں آ گئے۔ اب دنیا میں آپ کی عمر ساٹھ، ستر اسی سو برس کی ہے یہاں رہے، یہاں سے انتقال ہوا تو عالم برزخ میں پہنچ گئے، جسے آپ قبر کہتے ہیں۔ وہ اللہ ہی جانتا ہے کہ آپ اس میں کتنی مدت رہیں گے۔ قیامت تک تو رہنا ہی ہے۔ پھر قیامت آ گئی تو آپ عالم برزخ سے عالم حشر کے اندر منتقل ہوں گے اور عالم حشر میں ایک دن قیام کرنا ہے اور وہ ایک دن ہوگا پچاس ہزار برس کا، لہٰذا پچاس ہزار برس اس عالم کی عمر ہے۔ اس عالم میں آپ پچاس ہزار برس گزرنے کے بعد منتقل ہوں جنتوں کی طرف۔

تو انسان مٹنے والا نہیں ہے۔ باپ کی پیٹھ سے ماں کے پیٹ سے چلا تو چلتا رہے گا ابد الآباد (ہمیشہ) تک۔ اس لئے آپ بھی باقی، ہم بھی باقی، آپ کے اخلاق بھی باقی، ہمارا شریعت بھی باقی۔ دونوں چیزیں دوامی ہیں جو چلتی رہیں گی اور جنت تک ساتھ جائیں گی۔

وحدتِ خیال و وحدتِ قلوب...... بہرحال آپ نے فی الحقیقت یہ خدمت مہمانوں کی نہیں بلکہ ایک مسئلہ عظیم کی خدمت کی ہے۔ آپ نے مسلم پرسنل لاء کی خدمت کی ہے، اس کو عام کیا، اس کو پھیلایا اور آپ نے چاہا کہ ساری پبلک اس سے واقف ہو جائے۔ اس کے لئے یہ عظیم الشان جلسہ منعقد کیا۔ یہ جلسہ درحقیقت وعظ و تقریر کا نہیں ہے۔ وعظ و تقریر میں ہوتی ہے تربیت۔ یہ جلسہ ہے اعلان کا کہ آپ کو ان خطرات سے آگاہ کیا جائے جو قانون کے اوپر آنے والے ہیں۔ ان کی بچاؤ کی صورتیں آپ کے سامنے رکھی جائیں۔ ان صورتوں پر آپ متفق اور متحد ہو کر چلیں۔ یہ جلسہ اس اعلان کے لئے ہے، وعظ و تقریر کے لئے تو ہزاروں جلسے ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں عبادات، معاملات وغیرہ سب چیزوں کی نصیحت بھی ہوتی ہے۔ لیکن یہ محض وعظ و نصیحت کا اجلاس نہیں یہ تو جلسہ اذنِ عام اور اعلانِ عام کا ہے تا کہ خطرات سے آگاہ کر دیا جائے۔ تو بہت سے خطرات سے آگاہ کیا جارہا ہے کہ فلاں مسئلے کو اگر بدل دیا گیا تو یہ خطرات ہوں گے، پرسنل لاء کے مسئلے میں مداخلت کی گئی تو یہ خطرات رونما ہوں گے۔

ان خطرات پر تجویزیں آرہی ہیں جو آپ کے سامنے پیش کی گئیں تو یہ جلسہ اذن عام اور اعلان عام کا ہے تا کہ آپ کا اتحاد باقی رہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ اتحاد زبان سے نہیں ہوتا۔ آپ نے کہا کہ میں آپ کا دوست

ہوں، میں نے کہہ دیا کہ میں بھی آپ کا دوست ہوں۔ یہ دوستی قائم نہیں رہ سکتی کیوں کہ یہ تو لفظوں کی دوستی ہے، دوستی واقعی جب ہے کہ واقعی دل میں دوستی آ جائے، جگر کے اندر پیوست ہو جائے وہ دوستی باقی رہ سکتی ہے، اور وہ دوستی کب ہوگی؟ جب وحدت خیال پیدا ہو۔ اگر خیالات بدلے ہوئے ہیں، آپ کا رخ ایک طرف میرا رخ ایک طرف، کبھی اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا اور جب خیالات میں آگئی وحدت تو خود بخود اتحاد پیدا ہوگا۔ تو پرسنل لاء اور قانون الٰہی اور قرآن کے ایک ایک جز کی حفاظت ایسی چیز ہے کہ اس کے اوپر سارے متفق ہیں۔ اس کے معنی میں چاہے اختلاف کریں، رائے الگ ہیں۔ لیکن نفس قانون قرآن وحدیث اس پر سارے متحد ہیں۔

تو اس وقت آنچ آپ کے میرے خیالات پر نہیں آ رہی ہے اس وقت تو آنچ آ رہی ہے کتاب وسنت پر ان کے مسائل پر لوگ تغیر وتبدل چاہتے ہیں۔ تو کون سا فرقہ رہ جائے گا جو اسے گوارہ کر لے قرآن وحدیث میں کوئی شخص تغیر کرے، اس واسطے سارے کے سارے متحد ہو گئے لہٰذا وحدت خیال بھی ہے اور وحدت قلوب بھی۔

اشتراک مقصد اور اخلاص باہمی ...... اور باہمی اخلاص بھی ہے ایک دوسرے سے، بغیر اخلاص کے اس طرح جمع نہیں ہو سکتے اور اخلاص اس لئے ہے کہ مقصد ہے مشترک، الگ الگ مقصد نہیں ہے۔ بلکہ ایک ہی مقصد ہے کہ یہ قرآن وسنت ناقابل تغیر ہے اس میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہو سکتا ہے۔ تغیر وتبدل تو کیا کرتے اس کا حق تو خود صاحب شریعت کو بھی نہیں دیا گیا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ارشاد فرمایا گیا کہ آپ بھی اعلان کر دیں: ﴿قُلْ مَا يَكُونُ لِيْ أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِيْ﴾ (1) "میرے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ میں اس کے کسی شوشے کو بدل دوں"۔

میں تو ناقل اور امین اور داعی بن کر آیا ہوں، اللہ کی طرف سے، جو حق تعالیٰ فرمائیں گے بلا کم وکاست تمہارے آگے رکھ دوں گا۔ اس کے اندر میری طرف سے کوئی تغیر وتبدل ممکن نہیں۔ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی جس تغیر وتبدل کے مجاز نہیں، میں اور آپ اس کے مجاز کیسے ہو جاویں گے؟ اور جب میں اور آپ نہیں تو دوسری قومیں کیسے ہو جاویں گی؟ یہ تغیر وتبدل کرنے کھڑی ہوں گے، تو لامحالہ مقابلہ بھی ہوگا اور مقابلہ ہوگا تو ہماری مدد بھی ہوگی۔

بندہ کی ذمہ داری اور نصرت خداوندی ...... مدد حاصل کرنے اور لڑنے کا ایک خاص اصول ہے۔ اگر آپ ضعیف اور کمزور ہیں، مد مقابل ہے بہت قوی اور آپ مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں اس سے۔ تو اصول یہ ہے کہ کسی قوی کو اس کے مقابلہ پر ڈال دیجئے۔ وہ لڑتے رہیں گے آپ بیٹھ کر تماشہ دیکھتے رہیں گے تو آج قانون پر آنچ آ رہی ہے، آپ لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے تو اقوام کو اللہ سے بھڑا دو اور کہہ دو کہ یہ قرآن وحدیث میں تغیر کرنا چاہتے ہیں، قرآن والا خود ان کو سمجھ لے گا۔ لڑائی ان کی شروع ہوگی۔ ہم آرام سے بیٹھ کر دیکھیں گے، خدا کو کون مغلوب کر سکتا ہے؟ اس کے قانون کو کون نیچا دکھا سکتا ہے؟ اس کی صورت یہی ہے کہ ہم آ کر لیں قرآن وحدیث کی۔ اپنی

---

(1) پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۱۵۔

طرف سے کوئی بات نہ کہیں۔ نہ ہماری عقل کوئی چیز ہے، نہ ہمارا خیال کوئی چیز ہے۔ ہم تو قانون کے حق میں امانت دار ہیں اس قانون کو پہنچائیں گے۔ قانون قانون والے کا ہے۔ اگر کوئی لڑے گا تو وہ قانون سے اور قانون ساز سے لڑے گا۔ ہم تو قانون ساز نہیں ہیں۔ ہم تو بیٹھ کر تماشہ دیکھیں گے۔

جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا گیا۔ مقابلہ ہوا مشرکین مکہ سے ظاہر بات ہے کہ مسلمان تعداد میں بھی تھوڑے، سامان بھی ان کے پاس نہیں اور مقابلہ اس قوم سے کہ سارے وسائل زندگی اس کے ہاتھ میں ہیں، اقتدار حجاز کا اس کے ہاتھ میں حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيثِ﴾ ①
"اے پیغمبر! مجھے چھوڑ دو اور میرے مقابلہ پر انہیں چھوڑ دو"۔

ہم نمٹ لیں گے تم بیٹھ کر دیکھو تو ہمارا بھی کام یہ ہے۔ بھائی تم ہماری جائیداد ہماری ذات پر حملہ نہیں کر رہے ہو۔ یہ تو براہ راست قانون پر حملہ ہے اور قانون الٰہی ہمارا بنایا ہوا نہیں ہے۔ خدا کا بنایا ہوا ہے تو تم لڑلو۔ اگر تمہارے اندر طاقت ہے اللہ میاں سے۔ ہمارا کام تو یہ ہے کہ ہم پیش کردیں کہ یہ خدا کا قانون ہے اس میں تغیر وتبدل ممکن نہیں ہے پھر بھی کرو گے تو مجرم ٹھہرو گے خدا کے، ہمارا کوئی جرم نہیں کہ ہم خواہ مخواہ تم سے لڑیں، تم نمٹ لو۔

بہر حال اصول بھی یہی ہے کہ جب آپ کے اندر طاقت نہیں تو کم از کم اتنی طاقت ہے کہ اپنے دین کو مضبوطی سے سنبھال لیں اور دوسروں میں اعلان کردیں اور یہ بھی کہہ دیں کہ یہ ناممکن التغیر ہے، بس اتنا آپ کرتے رہیں۔ اب آگے جھگڑنے کے بعد کون مغلوب ہوتا ہے کون نہیں۔ اس کو قانون والا اپنے آپ جان لے گا۔

شاہ حبش کی شکست...... آپ کے سامنے تو واقعہ ہے کہ مکہ مکرمہ پر جب دھاوا بولا ہے ابرہہ نے یہ یمن کا بادشاہ تھا اور اس نیت سے آیا تھا کہ بیت اللہ شریف کو منہدم کرے۔ (معاذ اللہ) تاکہ لوگوں کا رجوع اس کی طرف سے ختم ہو کر اس مکان کی طرف ہو جائے جو اس نے یمن میں بنایا تھا، تو وہ بڑے بڑے ہاتھیوں کا لشکر لے کر آیا اور مکہ کے اردگرد اس نے گھیرا ڈال لیا۔ ارادہ یہ تھا کہ معاذ اللہ بیت اللہ مسمار کردے اور ڈھادے۔ تو اس نے عبد المطلب کو اطلاع دی کہ اگر تمہیں کچھ کہنا ہو تو آکر کہو۔ مکہ کے باشندوں کے تم سردار ہو۔ عبد المطلب آئے، ان کی بڑی تعظیم کی، بڑی توقیر سے پیش آیا اور کہا کہ اگر کوئی بات ہو تو آپ کہیں۔ انہوں نے کہا میرے چند اونٹ ہیں، میری چند املاک ہیں، ان کی آپ حفاظت کریں۔ ان پر آپ ہاتھ نہ ڈالیں اور میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

اسے حیرانی ہوئی کہ یہ اپنے چند اونٹوں کو لے کر بیٹھ گئے اور بیت اللہ جیسی چیز کے بارے میں انہوں نے کچھ نہیں کہا کہ صاحب! اسے مسمار مت کرو، اس پر حملہ مت کرو، تو اس نے عبد المطلب سے کہا کہ آپ اپنے چند اونٹوں کے بارے میں آئے ہیں اور اپنی ایک شخصی ملک کو سامنے رکھا ہے۔ حالانکہ میرا مقصد یہ ہے کہ اس مرکز کو ڈھادوں جس سے آپ کی بنیاد قائم ہے۔ اس کے بارے میں آپ نے کچھ بھی نہیں کہا۔

① پارہ: ۲۹، سورۃ القلم، الآیۃ: ۴۴۔

تو عبدالمطلب نے کہا کہ بیت اللہ میری ملک تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو خدا کا گھر ہے۔ خدا آپ سے خود نمٹ لے گا، میں تو اپنی ملک کے بارے میں کہنے آیا ہوں، خدا کی ملک کے بارے میں کہنے نہیں آیا۔ وہ جانے آپ جانیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے اس کے ہاتھیوں کے پرخچے چند چڑیوں کے ذریعے اڑا دیے۔ بیت اللہ اسی طرح قائم رہا۔ اس کے ہاتھیوں کے اور اس کے لشکر کے پرخچے اڑ گئے۔ ان میں سے ایک شخص بھی باقی نہ رہا۔

پرسنل لاء میں مداخلت کی وجوہ...... ہم اور آپ اس چیز کے ذمہ دار ہیں کہ پہلے تو اس قانون پر ہم اور آپ عمل کریں اور اپنے اندر اس کو رچالیں، اس کے بعد اس کا اعلان کریں کہ یہ خدائی قانون ہے۔ اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا۔ پھر بھی کوئی زیادتی کرے تو اس کو خدا کے مقابلے پر ڈال دیں کہ ہم تو اسی پر عمل کریں گے اور اسی کا اعلان کریں گے، جو تمہارا جی چاہے کرلو، تو حقیقت یہ ہے کہ کوتاہی ہماری ہے۔ عامل ہم نہیں۔ پرسنل لاء کے نام سے ہم واقف نہیں۔ شخصی اور عائلی قوانین کیا ہیں ان پر عمل درآمد نہیں، اگر عمل درآمد ہو تو دوسرے خود مغلوب ہو جاویں گے۔ لیکن خود آپ عمل نہ کریں تو دوسروں کو جرأت ہوتی ہے کہ دخل اندازی کریں۔ وہ جانتے ہیں کہ مسلمان کو پتہ نہیں کہ پرسنل لاء کیا ہے۔ لہٰذا جس طرح سے چاہو اس کے روپ کو بدل دو۔

ہماری بدعملی نے یہ راستہ دکھایا ہے، اگر آج سب مل کر اس پر جمع ہو جائیں کہ پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک جو اسلامی معاشرہ ہے، ہم اسے قائم کر کے رہیں گے۔ پھر کروڑہا کروڑ انسان جن کو سات کروڑ کہا جاتا ہے۔ لیکن اندازہ یہ ہے کہ دس بارہ کروڑ سے کم نہیں۔ یہ سارے مل کر اگر عمل درآمد کریں تو عمل کے اندر خود وہ طاقت ہے کہ دوسروں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ زبان سے بھی کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ ہمارا اور آپ کا کام یہ ہے کہ ایک تو عمل درآمد ہو اس کے اوپر اور ایک اس کا اعلان ہو اور اس کی پوری اطلاع دے دی جائے کہ اس قانون میں تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا ہے اور نہ ہم اس کو ایک منٹ کے لئے گوارہ کرسکتے ہیں۔ ہماری جانیں جاسکتی ہیں مگر اس قانون پر آنچ نہیں آسکتی۔

فریضہ مسلم اور ادائیگی شکر...... یہ اعلان کردینا آپ کا فرض ہے، اس پر جم جانا آپ کا فرض ہے، اس لئے یہ جلسے منعقد کئے جارہے ہیں۔ پرسنل لاء کے مسائل کے بارے میں مجھے کوئی تحقیق عرض کرنی نہیں تھی۔ بلکہ مقصد آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا اور ایک یہ کہ پرسنل لاء کے اوپر آپ کو جم جانا چاہئے۔ علماً بھی عملاً بھی اور اعلاناً بھی اور اذن عام بھی آپ کریں، مطلع کردیں کہ یہ قانون خداوندی ہے اور ہم اس کے امین ہیں۔ ہم ایک منٹ کے لئے بھی اس میں تغیر و تبدل گوارہ نہیں کرسکتے۔ یہ چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔ کوئی تقریر یا وعظ نہیں کرنا تھا۔

ایک خادم بورڈ کی حیثیت سے یہ بھی میرا فرض تھا کہ آپ حضرات کی قدر افزائی کا شکریہ ادا کروں۔ اپنی طرف سے بھی اور ان سب بزرگوں کی طرف سے بھی۔ اصل میں تو یہی سارے بزرگ ہیں، انہوں نے مجھے لا کر آگے بٹھلا دیا ہے کہ تو یہ کام کر۔ صدر تو اصل میں وہی ہیں جو صدر بنا سکتے ہیں کیوں کہ وہ کرسی پر جسے چاہیں بٹھا

دیں۔ میں تو ایک علامتی نشان ہوں کام کرنے والے تو یہی سارے بزرگ ہیں جو کام کر رہے ہیں اور انہوں نے ہی کیا ہے۔ اس لئے اداءِ شکر کے اندر میں ان کی طرف سے نیابت کر رہا ہوں۔ حق تعالیٰ آپ حضرات کو جزائے خیر دے۔ آپ کے احوال میں برکت عطا فرمائے!۔ (آمین)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَ تُبْ عَلَیْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ.

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ.

وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

اسلام اور آزادی

اگر ایک قوم آزاد ہونا چاہتی ہے تو پہلے اسے اپنے من میں آزاد ہو جانا پڑے گا۔ پھر جس نوع کی آزادی اندر آئے گی اسی نوع کی باہر نمایاں ہوگی۔ اس لئے اسلام نے باہر آزادی کی فضاء پیدا کرنے کے لئے پہلے اندرون انسان میں آزادی اور جرأت کی فضا پیدا کی، تاکہ اسی جرأت و بے باکی سے اس کی بیرونی آزادی بھی فضا پر محیط ہو جائے۔ اس طرح اسلام صرف رسمی آزادی کا داعی اور علمبردار نہیں۔ بلکہ باطنی اور بنیادی آزادی وحریت کا منادی (دعویدار) ہے جس نے رسمی اور معنوی، صوری اور حقیقی دونوں قسم کی آزادیوں کا انسانوں کو سبق دیا ہے۔

از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

اَمَّا بَعْدُ!

آزادی کا مفہوم..... بزرگان محترم! اسلام آزادی کا سب سے بڑا حامی وعلمبردار ہی نہیں، بلکہ وہی اور صرف وہی حقیقی جامع اور مکمل آزادی کا پیغام لے کر دنیا میں آیا ہے۔ اگر دنیا اسلام سے روشناس نہ ہوتی تو آزادی کا مفہوم ذہنوں میں اور اس کا کوئی عملی نقشہ آنکھوں میں نہ سما سکتا۔ کیوں کہ عقل کی تنگ وتاریک حد تک آزادی کے معنی کوٹھی، بنگلہ، کیک پیسٹری، توس مکھن، کھیل تماشا، گانا بجانا، آلات لہو ولعب، نفسانی عیش ونشاط، ملکوں میں آمد ورفت، ہوائی یا بری و بحری سیر وسیاحت، پارٹی فیلنگ اور اس سے حریفوں کی شکست، استعمار اور جوع الارض مخصوص مفادات کو سامنے رکھ کر وضع قانون اور قانونی داؤ پیچ کے پردوں میں اقوام وطبقات کو بے بس اور بے حق ٹھہرا دینے کے نہیں ہیں۔ ورنہ غلامی اور غلام سازی کے لفظ کے لئے کوئی معنی باقی نہ رہیں گے۔ بلکہ آزادی کے معنی حق وصداقت، عدل و انصاف اور ایثار ورواداری کے سچے جذبات کے تحت بے بسوں کی بے بسی رفع کرنے، ضعیفوں کو ابھارنے، بے کسوں کو سہارا دینے، ظالموں سے دبے ہوؤں کو اٹھا دینے اور حدود سے گزر کر ابھرے ہوؤں کو اتار دینے اور بالفاظ دیگر اونچ نیچ کا فرق اٹھا کر سب کو حقوق کے لحاظ سے مساوی سطح پر لے آنے کے ہیں۔ تاکہ ضعیف مظلوم نہ بننے پائے اور

قوی کو ظلم وزیادتی کا موقع نہ ملے۔ پس آزادی کا حاصل بلا روک ٹوک پوری قوت وقدرت کے ساتھ ادائے حقوق نکل آتا ہے، جس سے ظالم کے ہاتھ کٹ جائیں اور مظلوم کی بے دست وپائی ختم ہو جائے۔

آزادی کا اسلامی نصب العین..... آزادی کے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر اسلام کا نصب العین دیکھئے تو وہ یہ ہے کہ: ﴿اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ○ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ○ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ﴾ ①

”فرعون زمین میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف (پارٹیاں) بنا رکھا تھا کہ ان میں سے ایک جماعت کا زور گھٹا رکھا تھا۔ ان کی بیٹوں کو ذبح کراتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ واقعی وہ بڑا مفسد تھا اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جن لوگوں کا زمین میں زور گھٹایا جا رہا تھا، ہم ان پر احسان کریں اور ان کو پیشوا بنادیں اور ان کو مالک بنادیں اور ان کو زمین میں حکومت دیں۔ فرعون اور ہامان اور ان کی اہالی وموالی کو (زوال قوت وشوکت کے) وہ واقعات دکھلا دیں جن سے وہ بچاؤ کر رہے تھے، اس کا حاصل وہی نکلا کہ ضعیفوں کو ابھارا جائے اور ظلم پسند زور آوروں کو گرایا جائے۔ ضعیفوں کے جو حقوق طاقت وروں نے زور وقوت کے بل بوتے پر سلب کر رکھے تھے وہ ان کے دانتوں کے نیچے سے نکلوائے جائیں اور ضعیفوں کو واپس کیے جائیں۔ تاکہ کمزور آزادی کا سانس لے سکے اور وقت کے فرعون وہامان اپنی اصلی حد پر آجائیں، ورنہ ختم ہو جائیں۔

اگر آزادی کے یہی معنی ہیں اور شوکت وقوت کا یہی مقصد ہے اور بلاشبہ یہی ہے نہ کہ فراعنۂ وقت کے وہ نفسانی مقاصد جن کے عنوانات کی فہرست ابھی سطور بالا میں گزری، تو پھر اسلام کے سوا کون ہے جو اس مقصد کو دیانت واخلاق کے ساتھ دنیا میں لے کر آیا ہو؟

اس سے انکار نہیں کہ دنیا کی کسی ملت نے بھی غلامی کا پروگرام اپنے افراد کو نہیں دیا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ آزادی کے نعرہ کے بعد، حقیقی آزادی کے مکمل پروگرام پیش کرنے کی بھی کسی ملت نے زحمت نہیں اٹھائی۔

پس ملتوں کے دعوے کچھ بھی ہوں لیکن ان کے پاس آزادی کا وہ جامع پروگرام ہی موجود نہیں، جس سے آزادی کا ذکر کردہ مقصد حاصل ہو جائے۔ اسلام نے اگر ایسی آزادی کا دعویٰ کیا ہے تو اس کے عین مطابق عملی اور اخلاقی پروگرام بھی سامنے رکھا ہے۔ اس لئے دعوائے آزادی میں اسی کو سچا دعی کہا جائے گا جو دعوے کے ساتھ عملی ثبوت بھی پیش کرے۔

آزادیٔ ضمیر..... اگر غور کیا جائے تو حقیقی آزادی وہی ہوسکتی ہے جس میں بے جا دباؤ سے کلیۃً چھٹکارا میسر ہو اور یہ اس

① پارہ: ۲۰، سورۃ القصص، الآیۃ: ۴، ۵، ۶۔

کے بغیر ممکن نہیں کہ پہلے انسان کا دل و دماغ اور ضمیر آزاد ہو، ضمیر کی آواز اور رائے آزاد ہو۔ عقل و فہم اور شعور، اور اک آزاد ہو تا کہ جو کچھ وہ سمجھے خود اپنی بصیرت سے سمجھے دوسرے کے دباؤ اور جبر و قہر سے نہ سمجھے اور پھر جو کچھ اس سمجھے ہوئے کے مطابق عمل در آمد کرے وہ اسی کا عمل در آمد کہلائے۔ انسان کی ساری آزادیوں کے سلسلے اسی باطن انسان سے چلتے ہیں۔ یہ آزاد ہے تو اس کی پوری دنیا آزاد ہے، ورنہ وہ آزاد ہو کر بھی غلام ہے اور اس کی پوری دنیا غلام ہے۔

اسلام نے سب سے زیادہ زور انسان کے باطن کی آزادی پر صرف کیا ہے اور اس کے عقل و فہم کو اس حد تک آزادی بخشی ہے کہ خود اسلام کے منوانے میں بھی اس کے باطن پر کسی خارجی اثر کا دباؤ ڈالنا گوارا نہیں کیا، مادی طاقتیں تو بجائے خود ہیں۔

معجزہ جو خدا کا فعل ہے اور جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اسے بھی دلیل نبوت تو ٹھہرایا ہے۔ لیکن دلیل صداقت کو مسائل نہیں بنایا۔ کیوں کہ مسائل کی حقانیت استدلال اور حجت و برہان سے واضح ہوتی ہے۔ خوارق سے ظاہر نہیں ہوسکتی، بغیر حجت و دلیل محض خوارق کے زور سے کسی چیز کو منوانا طاقت کے زور سے منوانا ہے جیسے اکراہ و اجبار کہا جاتا ہے۔ جس سے مسئلہ کی حقیقت واضح نہیں ہوسکتی کہ اس کے ردّ و قبول کا فیصلہ کیا جائے۔ اگر ایک شخص یہ دعویٰ کرے کہ نماز اور زکوۃ حق ہے، حج اور روزہ ضروری ہے۔ نکاح و طلاق کا فلاں طریقہ صحیح ہے، بیع و شراء کا فلاں ڈھنگ درست ہے اور فلاں ناجائز۔ امن و جنگ کے یہ اوقات و مواقع مناسب ہیں اور وہ مناسب نہیں اور دلیل یہ بیان کرے کہ میں آنکھ کے اشارے سے بلڈنگیں منہدم کر سکتا ہوں یا میں مردے زندہ کر سکتا ہوں یا میں پرندوں کی بولیاں سمجھتا ہوں۔ تو ظاہر ہے کہ ان خوارق سے اس کی معنوی قوت ضروری کھل جائے گی، مگر مسائل کی معقولیت اور غیر معقولیت کا اس سے فیصلہ نہ ہوگا۔ کیا ضروری ہے کہ دیواروں کے انہدام، احیاء موتی اور منطق الطیر کے سمجھ لینے سے مسئلہ میں معقولیت بھی آجائے۔ ظاہر ہے کہ محض دیوار گرا دینے سے کسی مسئلہ کو منوانا عقل پر دباؤ ڈالنا ہے کہ وہ بلا دلیل مسئلہ کو تسلیم کرلے۔ کیوں کہ مسئلہ کی معقولیت کا تعلق دلیل سے ہے نہ کہ خوارق کے ظہور سے۔ خوارق سے پیغمبر کا منجانب اللہ ہونا تو ضرور واضح ہو جائے گا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ پیغمبر کے لائے ہوئے مسائل کی معقولیت بھی ان خوارق سے ذہن میں آجائے بلکہ ان کا معقول اور موافق فطرت ہونا دلائل سے واضح ہوگا۔ معجزات سے نمایاں نہ ہوگا۔

آزادیٔ عقل و فہم...... پس اگر خوارق ہی سے مسائل کی معقولیت کو بھی زبردستی منوایا جاتا۔ اور عقلی بصیرت کو استدلال کی راہ سے گزر کر مسئلہ کی معقولیت تک پہنچنے کی اجازت نہ دی جاتی۔ تو بلاشبہ یہ عقل پر ایک بے جا دباؤ ہوتا، جس سے عقل کی آزادی میں فرق آجاتا۔ در اں حال یہ کہ اسلام نے عقل کو آزادانہ سوچ بچار کرنے کا موقع دیا ہے۔ اس نے خوارق کو نبی کی نبوت کی دلیل تو کہا گیا۔ لیکن مسائل کی معقولیت سمجھنے کے لئے انہیں دلیل نہیں ٹھہرایا گیا، بلکہ اس کے لئے کسی کے مبعوث من اللہ اور فرستادۂ خدا ہونے کے لئے معجزہ اور خرق عادت ہی بہترین دلیل

بن سکتا تھا۔ حجت و برہان اور فراست و وجدان کا راستہ کھولا گیا کہ مسائل کی صداقت تو لنے کے لئے یہی حقیقی ترازو اور قرطاس مستقیم ہے، چنانچہ قرآن نے ایک ماننے والے کا پاکیزہ وصف یہ نہیں بیان کیا کہ وہ محض کسی قوت یا محض معجزہ اور خوارق کے دباؤ سے مسائل کو تسلیم کرتا ہے۔ خواہ اسے غیر معقول بھی جانتا ہو، بلکہ یہ بیان کیا گیا کہ: ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا﴾ ۔ ① ''اور یہ (مومن بندے) ایسے ہیں کہ جس وقت ان کو اللہ کے احکام کے ذریعے سے نصیحت کی جاتی ہے تو ان پر بہرے، اندھے ہو کر نہیں گرتے (بلکہ عقل وفہم کے ساتھ) متوجہ ہوتے ہیں تاکہ ماننے کے ساتھ ان کا سمجھ لینا بھی ساتھ ساتھ رہے''۔

پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ کہہ دینے کا ارشاد ہوا کہ: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ ② ''آپ فرما دیجئے کہ یہ میرا طریق ہے، میں خدا کی طرف سے اس طور پر بلاتا ہوں کہ میں دلیل پر قائم ہوں۔ میں بھی اور میرے ساتھی بھی اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں (کہ کسی آبائی رواج پر پچھلوں کی ریت کو بے دلیل مانے اور منوائے جاؤں)''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جہاں اپنی صداقت اور مبعوث من اللہ ہونے کی دلیل میں بردوسلام کا معجزہ پیش کیا وہاں خدا کی توحید منوانے کے لئے بجائے خرق عادت کے نمرود سے استدلالی بحث ومناظرہ فرمایا جو حجت وبرہان کی لائن تھی۔ کسی معجزہ سے اسے چپ کرانے کی سعی نہیں فرمائی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جہاں عصاء اور ید بیضا کے چمکتے ہوئے خوارق عادت نشان پیش کئے تاکہ ان کا پیغمبر ہونا واضح ہو جائے، وہاں مسائل سمجھانے کے لئے کسی معجزے کو استعمال نہیں کیا۔ بلکہ فرعون سے مکالمہ حجت وبرہان سے کیا جس کی تفصیل قرآن حکیم میں محفوظ ہیں۔ ٹھیک اسی عنوان پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں ہزارہا معجزات دکھلائے ہیں۔ وہاں مسائل کے باب میں صرف ایک معجزہ پیش کیا اور وہ قرآن تھا جو حجت وبرہان اور عقلی وحسی طرق استدلال سے بھرپور ہے۔ بس آپ کو بوجہ خاتم النبیین ہونے کے طریق استدلال معجزانہ ہی انداز کا دیا گیا۔ جس سے واضح ہے کہ مسائل کا قابل فہم اور قابل سماعت ہونا فطری اور بدیہی دلائل سے واضح ہوتا ہے خوارق سے نہیں۔ خوارق اور معجزات کے زور سے مسائل کو منوانا، ایک ایسا دباؤ ہوتا، جس سے عقل وخرد کی آزادی سلب ہو جاتی اور انسان کو عقل اور فکر کا دینا نہ دینا برابر ہو جاتا۔

پس اسلام نے آزادی کا سبق باہر ہی باہر سے نہیں پڑھایا، بلکہ انسان کے اندرون کو سب سے پہلے آزادی کی دولت بخشی ہے۔ اس کے ضمیر کو آزاد کیا، اس کی عقل کو آزاد کیا اس کے فہم کو آزاد کیا اور بالفاظ مختصر انسان کی حقیقت میں آزادی کا تخم بو دیا اور اسے مجسم آزادی بنا دیا۔ بہر حال ضمیر کی آزادی اسلام کا پہلا قدم ہے۔ جس کے اوپر سے اس نے تمام خارجی اثرات حتیٰ کہ خدائی افعال (معجزات) تک کے دباؤ کو بھی باقی نہیں رکھا۔

① پارہ: ۱۹، سورۃ الفرقان، الآیۃ: ۷۳۔ ② پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۸۔

آزادیٔ رائے...... آزادیٔ ضمیر کے بعد ما فی الضمیر یعنی رائے کی آزادی کا مقام آتا ہے۔ اگر دیانتاً ضمیر ایک بات کو حق مان رہا ہے تو اسے برملا اظہار کا حق دینا بھی اسلام ہی کی بلند حوصلہ فطرت کا کام تھا۔ ضمیر کی آواز دل کی مخلصانہ رائے ایک اپیل ہے جو بند رہنے کے لئے دل میں نہیں ابھاری جاتی بلکہ کھلنے اور کھل کر سامنے آنے کے لئے اٹھائی جاتی ہے۔ کسی بڑی سے بڑی چیز کو حق نہیں دیا گیا کہ وہ ضمیر کی آواز اور سچے دل سے ابھری ہوئی رائے کے اظہار پر کوئی پابندی عائد کر دے۔ اس کی تصدیق وتکذیب یا تصویب وتردید کا حجت کے ساتھ ہر ایک کو اختیار ہے۔ لیکن اسے ابھرنے نہ دینے کا کسی کو حق نہیں، اگر رائے کو آزاد نہ کیا جاتا تو ضمیر کی آزادی کے کوئی معنی نہ تھے۔ حد ہے کہ عام انسانی رائے پر پیغمبر علیہ السلام کی رائے کو بھی رائے کی حیثیت سے اثر انداز ہونے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو ارشاد فرمایا کہ وہ حضرت مغیث رضی اللہ عنہ سے نکاح کا تعلق منقطع نہ کریں، بریرہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ امر ہے یا مشورہ؟ فرمایا نہیں مشورہ و رائے ہے۔ عرض کیا: تو میں آزاد ہوں۔ ① یہ رائے مانوں نہ مانوں اور بالآخر نہیں مانی۔ ایک طرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے ہے جو خاتم الانبیاء ہونے کے علاوہ اعقل الناس بھی ہیں۔ دوسری طرف ایک عورت کی رائے ہے جس کی جنس ناقص العقل شمار کی گئی ہے۔ لیکن اسلام کی بخشی ہوئی آزادی رائے کا مقام اس حد تک بلند ہے کہ ایک عورت کی رائے پر پیغمبر علیہ السلام کی رائے کسی ادنیٰ دباؤ ڈالنے کی مجاز نہیں ٹھیرائی گئی۔

بہر حال اسلام کی آزاد فطرت نے انسان کی آزادی کے لئے سب سے پہلے اس کے باطن کو آزادی بخشی ہے، اس کی عقل اس کے ضمیر اور اس کی رائے کو آزاد رکھا ہے اور اس پر کسی ایسے دباؤ کو گوارا نہیں کیا، جو اس کے فطری ابھار اور تقاضوں کو پامال کر دے۔

ظاہر ہے کہ جو اسلام انسانی باطن پر نبوت اور معجزات یعنی فعل نبوی اور فعل خداوندی کے دباؤ کو بھی برداشت نہیں کرتا۔ تاوقتیکہ انسانی ضمیر خود ضمیر ہی کے رجحان اور اپنے ہی اندرونی دباؤ سے اسے واجب القبول نہ سمجھ لے۔ تو وہی اسلام اسی انسانی ضمیر اور بشری باطن پر اینٹ پتھر کے دباؤ، سونے چاندی اور زر وجواہر کی ڈھیریوں کے دباؤ تیر وتفنگ اور بم وگیس کے دباؤ کسی کی رسمی قربانی یا ہنگامی اقتدار کے دباؤ کو کب گوارا اور برداشت کر سکتا ہے اور تو اور وہ تو خود اپنے کو بھی نہ تلوار کے زور سے کسی کے اندر اتارنا چاہتا ہے اور نہ کسی کو کسی قسم کے رسمی دباؤ سے اپنے اندر گھس آنے اور تڑپنے کی اجازت دینا چاہتا ہے۔ اس نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ: ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ ② ”دین میں زبردستی نہیں، ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے“۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی گئی کہ: ﴿اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ ③ ”سو کیا

---

① السنن لابن ماجة، كتاب الطلاق، باب خيار الامة اذا اعتقت، ج: ٢، ص: ٢٦٠، حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے صحیح وضعیف سنن ابن ماجہ ج: ۵ ص: ۷۵ رقم: ۲۰۷۵۔ ② پارہ: ۳ سورة البقرة، الآية: ۲۵۶۔ ③ پارہ: ۱۱، سورة يونس، الآية: ۹۹۔

آپ لوگوں پر زبردستی کر سکتے ہیں کہ وہ ایمان لے ہی آویں"۔

پس جو اسلام دین تک کے بارے میں دلوں اور ضمیروں کو آزادی بخش رہا ہے، وہ رائے اور طبیعت کے اصلی تقاضوں کو کب پابند اور غلام رکھنا پسند کرے گا؟ پس سب سے پہلے اسلام نے اندرونِ انسان ہی میں آزادی کا دیا روشن کیا اور انسانی ضمیر، انسانی رائے اور انسان کے دل کی آواز کو دل میں ابھرنے اور ابھر کر باہر نکلنے میں آزادی دی۔

ظاہری آزادی، باطنی آزادی کے تابع ہے...... ظاہر ہے کہ بیرونی آزادی اندرونی آزادی کے تابع ہوتی ہے۔ اگر ضمیر آزاد ہے تو اس کا بیرونی ماحول بھی آزاد ہو کر رہتا ہے۔ بشرطیکہ ضمیر میں واقعی حریت و آزادی اتری ہوئی ہو اور وہ ضمیر کی آواز بنی ہوئی ہو، لفظی ترجمانی نہ ہو، جس میں کوئی حقیقت نہ ہو۔

پس آزادی ہو یا غلامی پہلے اندرون نفس میں آتی ہے پھر اس کا بیرون آزاد یا غلام بنتا ہے قرآن حکیم نے سائنٹیفک (ٹھوس) حقیقت واشگاف فرما دی کہ ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ ① "واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں فرماتے، جب تک وہ لوگ خود اپنے نفوس (کے اندرونی احوال) کو نہیں بدل دیتے"۔

پس باہر آزادی جب ہی نمایاں ہوتی ہے، جب اندر آ چکتی ہے، باہر انقلاب جب ہی رونما ہوتا ہے جب اندر آلیتا ہے، باہر غلامی اس وقت آتی ہے، جب نفوس کے اندر سرایت کر چکتی ہے۔

اگر ایک قوم آزاد ہونا چاہتی ہے تو پہلے اسے اپنے من میں آزاد ہو جانا پڑے گا۔ پھر جس نوع کی آزادی اندر آئے گی اسی نوع کی باہر نمایاں ہوگی اس لیے اسلام نے باہر آزادی کی فضا پیدا کرنے کے لئے پہلے اندرون انسان میں آزادی اور جرأت کی فضا پیدا کی۔ تا کہ اسی جرأت و بے باکی سے اس کی بیرونی آزادی بھی فضاء پر محیط ہو جائے اور اس طرح اسلام صرف رسمی آزادی کا داعی اور علمبردار نہیں بلکہ باطنی اور بنیادی آزادی و حریت کا منادی ہے جس نے رسمی اور معنوی، صوری اور حقیقی دونوں قسم کی آزادیوں کا انسانوں کو سبق دیا ہے۔

باطنی آزادی...... پس باطن میں تو اسلام آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کا باطن اور ضمیر ہر ماسوئی سے آزاد ہو کر حق کا پابند ہو جائے۔ ہر غیر اللہ کی حکمرانی اور قہرمانی سے آزاد ہو کر حق کی حکمرانی کے نیچے آ جائے۔ اگر یہ اختیارِ حق اور ردِ باطل ضمیر کا جوہر بن چکا ہے جو حقیقی آزادی کا ماحصل ہے، تو ایسے ضمیر سے اسی قسم کی آزادی باہر بھی پھیلے گی۔ پرستارانِ حق کا غلبہ ہو جائے گا اور پرستارانِ باطل کی شکست، صدیقوں اور صالحوں کی روش پھیل جائے گی اور فرعونوں اور ہامانوں کے طور طریقے مسدود ہو جائیں گے۔

ذلیل قسم کی غلامی...... لیکن اگر حق سے آزاد ہو کر نفس کی پیروی اور غیر اللہ کے دباؤ کے آثار سے دل اور ضمیر شکست کھا چکا ہے، یعنی ضمیر خود اپنے سے مطمئن نہیں۔ بلکہ بیرونی اثرات سے متاثر اور اپنی موت سے خود ہی خجل ہے۔ گویا حق سے آزاد اور باطل کا غلام ہے (جو اسلامی آزادی کی ضد ہے) تو اس نوع کی آزادی باہر نمایاں

① پارہ: ۱۳، سورۃ الرعد، الآیۃ: ۱۱۔

ہوگی۔فرعون وہامان برسرِ اقتدار ہوں گے، صلحاء وصدیقین بے یار ومددگار بن جائیں گے اور یہ آزادی یقیناً عالم کی آبادی نہ ہوگی بلکہ بربادی ہوگی۔ جس کو احادیث صحیحہ میں علامات قیامت (جن کا دوسرا نام فتن ہے اور جو اقوامِ عالم اور عالَم کے لئے سمِ قاتل کا حکم رکھتے ہیں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جبریل علیہ السلام نے علامت قیامت دریافت کیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"اَنْ تَلِدَ الْاَمَةُ رَبَّتَهَا وَاَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِى الْبُنْيَانِ" ①" (قیامت اور عالم کی تباہی اس وقت قریب ہوگی جب) باندی اپنی مالکہ کو جننے لگے یعنی لڑکیاں تک ماں پر حکومت کرنے لگیں جو لڑکوں سے کہیں زیادہ ماں کی مطیع ہوتی ہیں (یہ تباہی ہے معیشت منزلی کی) اور سیاست مدن یعنی ملکی معاملات کی بربادی کی صورت یہ ہے کہ) تم دیکھو کہ ننگ پیرے ننگ سرے (ذلیل قسم کے لوگ) بکریاں چرانے والے چرواہے یعنی کمینے قسم کے لوگ اونچی اونچی بلڈنگوں میں شیخیاں مارنے لگیں"۔

یعنی کمینے برسرِ اقتدار آجائیں اور حکمت پسند شرعاً جوتیاں چٹخاتے نظر آئیں۔تو یہ اقتدار بظاہر آزادی ہوگا، مگر بنگاہِ غور ذلیل قسم کی غلامی ہوگا، جو غلامی حق کی بجائے غلامی نفس کی دلدل میں پھنسا کر انجام کار عام تباہی کی طرف ملتوں کو دھکیل دے گا۔ بہرحال اسلام کی نگاہ میں آزادی باطن کے معنی ضمیر کی آزادی، عقل وخرد اور فہم وفکر کی آزادی ہے۔ جس سے انسان بذاتِ خود اپنے ضمیر کی آواز اٹھانے میں جری اور بیباک ہوجائے اور آزادی ظاہر کے معنی ضمیر کی اس آواز کے مطابق عملی اقدام میں ایسی جرأت وقوت پیدا ہوجاتا ہے۔ جو امرِ حق کے نافذ کرنے میں کسی پس وپیش کی شکار نہ ہو اور انسان کو نہ لَوْمَةَ لَائِمٍ کی پرواہ رہے نہ نُصْحِ نَاصِحٍ کی۔

صرف اسلام ہی آزادی کا علمبردار ہے...... اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام آزادی لے کر ہی نہیں آیا۔ بلکہ آزادی کا مفہوم سمجھانے کے لئے بھی آیا ہے۔ اسلام ظواہر ہی کو آزاد کرانے نہیں آیا بلکہ بواطن اور ضمائر کو بھی آزادی بخشنے کے لئے آیا ہے۔ اسلام نے آزادی کے معنی سمجھاتے ہوئے پہلے غلامی کے معنی سمجھائے ہیں کہ وہ نفس وشیطان کی پیروی کا ایک مختصر عنوان ہے۔ خواہ کوئی فرد اس پیروی کا شکار ہو یا جماعت، پھر اس منفی پہلو سے آزادی کے معنی سمجھائے کہ حق کی غلامی کا دوسرا نام ہے۔

پس اس نظریہ پر جو حق کا غلام ہوا وہی آزاد ہوا اور جو اس سے آزاد ہوا وہی غلام ہوا۔ اس سے واضح ہوا کہ آزادی کے معنی اسلام میں شتر بے مہار ہونے کے نہیں بلکہ حجت وبرہان سے پابندِ حق بن جانے کے ہیں۔

آزادی کا معیار...... آج کے دور میں کوئی بھی قوم یا ملک اگر آزاد ہو تو اس کی آزادی اور غلامی کا فیصلہ اسی اصول سے کیا جائے گا کہ اگر وہ آزادی کے بعد اپنے ضمیر کی سیدھی سچی آواز کے تحت مخلوق خدا سے اونچ نیچ اٹھانے میں بے باک ہے۔ اسے ضعیف کو قوی کرنے اور اس کے حقوق واپس دلانے اور زور آور ظالم کے پنجۂ استبداد کو توڑ کر

① الصحيح لمسلم، كتاب الايمان، باب الايمان والاسلام والاحسان، ج: ١، ص: ٨٦.

اس سے غصب کردہ حقوق نکال لینے میں کوئی جھجک اور کوئی رکاوٹ سدراہ نہیں ہوتی تو وہ آزاد ہے ورنہ غلام ہے۔ اگر اتفاق سے کسی غیر کا نہیں تو اپنے ذلیل نفس اور اس کی ہوا و ہوس کا غلام ہے اور ظاہر ہے یہی اندرونی غلامی چند ہی دن میں بیرونی غلامی کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس لئے وہ ظاہری آزادی بھی دیر پا ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں اگر آزادی شدہ ملک کا ضمیر آزاد ہے اور اس کے عدل و مساوات کا سچا جذبہ اور اس پاکیزہ جذبہ کے بے لاگ اقدامات کسی بیرونی دباؤ کو نہیں مانتے اور کسی ملامت سے متاثر نہیں ہوتے، تا آنکہ اس راہ عدل و مساوات میں قومیت، رنگ، نسل، وطن، ہوس زر، ہوائے اقتدار اور غلط قسم کا ماحول کوئی بھی اس کے جذبہ و عمل میں خلل انداز نہیں ہوتا تو وہ ملک آزاد اور وہ قوم آزادی سے بہرہ مند ہے اور بلاشبہ ضمیر کی یہ آزادی باہر کی اس آزادی کو زیادہ سے زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ سے زیادہ دیر پا بناتی رہے گی۔

پس حقیقی آزادی وہی ہوگی جس میں ظاہر و باطن یکساں طریق پر آزاد ہوں، اس کے برعکس مقابلہ نہ ہو کہ ظاہر بظاہر آزاد ہو اور دلوں میں غلامی کا چور نقب زنی کر رہا ہو یعنی زبانی حقیقی آزادی کے ادعا میں رطب اللسان ہوں مگر دلوں میں اس کے برعکس جذبات کا طوفان بپا ہو۔ ﴿يُرْضُونَكُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ﴾ ①

اسلامی آزادی کے آثار...... اسلام بھی جامع آزادی لے کر دنیا میں آیا اور جونہی اس نے آزادی کا یہ غلغلہ بلند کیا اور اس کی آواز پر پاک ضمیر انسانوں نے اپنے ضمیر کی آواز سے لبیک کہا وہیں پسماندہ ابھر پڑے، پست بلند ہو گئے اور بلند نیچے کی طرف آ گئے، غلام اور آقا میں فرق نہ رہا، یتیم بے کسی کا لبادہ اتار کر ناز و نعم کے خلعت جاں بخش میں آ گیا۔ مظلوموں کی فریادیں عرش سے ٹکرانے لگیں، صنف نازک پابندیوں سے حرہ (آزاد) ہو گئیں۔ بے کس اور لاوارث دوسروں کے مورث بن گئے، جنہیں سونے کے لئے فرش خاک بھی مشکل سے میسر آتا تھا وہ کتان کے رومالوں سے ناک صاف کرنے لگے اور جو خود بل کر اپنی خدمت کرنا بھی عار جانتے تھے، وہ خادم خلق اللہ بن گئے۔ غرض اسلام نے آزادی سے جو انقلاب برپا کیا وہ اونچ نیچ اور من و تو کے امتیاز کا انقلاب نہ تھا، بلکہ اونچ نیچ مٹانے اور من و تو کے قصے ختم کرنے کا انقلاب تھا۔ قانونی مساوات۔ تعلیم یکسانی، مالی توازن، جاہی ہم رنگی، امیر غریب کے سنگم، اونچے اور نیچے کے ملاپ، آقا و غلام کی ہم آہنگی، شاہ و گدا کی یک منظری کا انقلاب تھا، جو اس کے بغیر ناممکن تھا کہ یہ امیر و غریب، شاہ و گدا اور اونچ نیچ افراد بجائے ایک دوسرے کو دیکھنے کے سب مل کر کسی ایسی ذات کو دیکھنے لگیں جو ان سب سے بالاتر ہے اور اس طرح ان کا رخ ایک دوسرے کی طرف ہونے کی بجائے صرف ایک مرکز کی طرف ہو جائے جو واحد قوم ہو۔

پس اسلام نے آزادی اور آزادروشی کی یہ حقیقت جس میں مساوات کیساتھ ایک دوسرے کی خدمت بلکہ فدویت کا جذبہ کارفرما تھا، جو خود انسان کے نفس کی عظمت اصطلاحی خودداری سے نہیں ابھاری۔ بلکہ ہر ہر نفس کی مخفی

---

① پارہ: ۱۰، سورۃ التوبہ، الآیۃ: ۸۔

عظمت کو مٹا کر حق کی عظمت دل میں سمو کر پیدا کی۔ اس لئے اسلامی آزادی کے معنی غلامی نفس یا غلامی غیر اللہ کے نہیں بلکہ غلامی حق کے ہیں۔ پس آزادی کا لفظ تو اسلام اور غیر اسلام میں مشترک ہے، لیکن اس کے معنی اسلام اور غیر اسلام میں ایک دوسرے سے بالکل جدا اور باہم بعید تر ہیں۔

''اسلام اور آزادی'' کا عنوان جب سامنے آئے تو اس تفصیل کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے تاکہ دوسروں کی لفظی آزادی سے اسلام کی حقیقی آزادی متمیز ہو سکے۔

عروج وزوال

مسلمان دنیا کو کچھ دینے کے لئے آیا ہے، لینے یا مانگنے کے لئے نہیں آیا اور ظاہر ہے کہ وہ وہی کچھ دے سکتا ہے، جو دوسروں کے پاس نہ ہو، اس کے پاس ہو۔ کھلی بات ہے کہ وہ دنیا کی دولت وثروت یا جاہ و مال کے ذخیرے نہیں ہو سکتے کہ یہ سب اوروں کے پاس بھی ہیں ہی، بلکہ ان سے کچھ زیادہ ان کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لئے دینے کی چیز ایک ہی رہ جاتی ہے اور وہ مستند دین ہے کہ اس فطرت الٰہی پر خود چل کر اقوام کو چلائیں۔

از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ

"اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

عروج وزوال کا معیار...... ہر قوم کی زندگی کا ایک معیار اور نصب العین ہوتا ہے جس سے اس کی ترقی وتنزل اور نا معتدی پہچانی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے حال اور مستقبل پر غور کرنے کے لئے بھی یہی راستہ زیادہ سہل اور مختصر ہے کہ اس کے بنیادی نصب العین کو سامنے رکھ لیا جائے۔ گردوپیش کے حالات، ہنگامی حوادث یا شخصی آراء معیار کا درجہ نہیں رکھتیں کہ ان سے کسی قوم کے عروج وزوال کو پہچانا جائے۔ پس مسلم قوم کا نصب العین اس کی سیاسی تعلیمات اور ابتدائی قرون کے تعامل ہی سے سامنے آسکتا ہے جو اس کے عروج کا دور ہے۔ جس حد تک امت اس کے مطابق ہو اسے قوم کی بقاء باور کیا جائے گا اور اس میں اس کی ترقی مضمر ہوگی اور جس حد تک وہ اس سے ہٹی ہوئی ہو، اسی کو اس کے لئے سبب تنزل قرار دے کر اس سے ہٹانے اور راستہ بدلنے کی سعی کی جائے گی اس میں اس کا تنزل مضمر ہوگا۔

جناب کا یہ احساس بالکل صحیح ہے کہ مسلم قوم دنیا کی محتاج رہ کر، ان کے سامنے سائل اور بھکاری بن کر زندہ نہیں رہ سکتی، چہ جائیکہ بڑھے اور پھلے پھولے۔ لیکن استغناء کے معنی یک سوئی انقطاعیت، گوشہ گیری اور علیحدگی پسندی کی نہیں بالخصوص اس بین الاقوامی دور میں کہ یہ بھی موت کے مترادف ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان دوسری اقوام سے مستغنی بھی ہوں، سائل اور بھکاری بھی نہ ہوں اور ساتھ ہی اقوام کے جھگڑوں میں کندھے سے کندھا ملا کر ان میں گھسے ہوئے بھی ہوں تو اس گھسنے کے کیا معنی ہیں؟ جواب یہ ہے کہ وہ سائل بن کر نہیں محسن بن کر

اور اپنا پیشہ بن کر گھسیں، جسے دوسرے لفظوں میں یوں ادا کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان دنیا کو کچھ دینے کے لئے آیا ہے لینے یا مانگنے کے لئے نہیں آیا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ وہی کچھ دے سکتا ہے جو دوسروں کے پاس نہ ہو، اس کے پاس ہو، کھلی بات ہے کہ وہ دنیا کی دولت وثروت یا جاہ ومال کے ذخیرے نہیں ہوسکتے کہ یہ سب کچھ اوروں کے پاس بھی ہیں، بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی ان کے ہاتھ میں ہیں۔

معلم وامامِ اقوام...... اس لئے دینے کی چیز ایک ہی رہ جاتی ہے اور وہ متعدد دین ہے کہ اس فطرت الٰہی پر خود چل کر اقوام کو چلائیں اور ان کے معلم اور امام بنیں۔ اس سے امت مسلمہ کے نصب العین اور وجہ تشکیل کا خلاصہ مختصر لفظوں میں صلاح نفس کے ساتھ اصلاح عالم کی دعوت عام، اعلاء کلمۃ اللہ اور احیاء سنن انبیاء کے سوا دوسرا نہیں نکلتا۔ امت اسی راستہ سے آگے بڑھی اور اسی لائن سے دنیا کے خطے اس کے تابع فرمان ہوئے۔ اس لئے اس کی ترقی وتنزل اور عروج وپستی کے پہچاننے کا بھی یہی معیار ہوسکتا ہے کہ ہر شعبۂ زندگی میں خواہ دیانت و سیاست ہو یا تمدن ومعاشرت، بین الاقوامی تعلقات ہوں یا جنگ وصلح، امن ہو یا بدامنی، سرمایہ داری ہو یا ناداری، وہ اسے اختیار کئے ہوئے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں کئے ہوئے ہیں تو اس صورت میں نہ اس کا استغناء باقی رہ سکتا ہے، نہ احسان وایثار، جو ان کے وجود کی اصل بنیاد تھا اور اس طرح ان کی قومیت ہی باقی نہیں رہ سکتی۔

اب اگر مسلم قوم کا نظریہ محض کسی خطۂ زمین پر آرام وآسائش یا زیادہ سے زیادہ کچھ تھوڑا بہت پڑھ لکھ لینے کے ساتھ گذر بسر کر لینا ہے تو اس ملک کی مختلف اقوام کے ہجوم میں اس کا نتیجہ اس کے حق میں رشک، احساس کمتری، حرص وآز اور پھر اس سے قلبی بے چینی، اندرونی تشویشات، ماتم سرائی، اضطراب وگھبراہٹ اور پراگندہ خاطری کی صورت میں نمایاں ہوگا، جیسا کہ ہو رہا ہے اور وہ کبھی چین اور امن کی زندگی بسر نہیں کر سکیں گے۔ اسی لئے اسلامی زندگی میں اس گذر بسر کے تصور کی کوئی خاص قدر وقیمت نہیں۔ جبکہ اس کے ساتھ وہ معیار جذبہ نہ ہو جس پر اس قوم کی بنیاد ہے اور جس کی خاطر دنیا میں اسے مبعوث کیا گیا تھا۔

قلبی تمکین...... ہاں اگر وہ ہے تو پھر ان مذکورہ خطرات کی بجائے قوم میں قلبی تمکین، اطمینان خاطر ودل جمعی اور استغناء اور تفوق (برتری) لازمی ہے اور اسی کے ہوتے ہوئے قوم کی امتیازی شان یا وجاہت، حیثیت عرفی اور اقوام کے قلوب میں اس کی ہیبت قائم رہ سکتی ہے۔ جیسا کہ تاریخ اسے بار بار دہرا چکی ہے۔

اندریں صورت اگر اس ملک میں دائیں بائیں بازو کے ساتھ ایک تیسری قوت مسلمان بھی ہیں تو انہیں اور ان کے تمام افکار ونظریات زندگی کو پہلے اسی معیار پر جانچنے کی ضرورت ہوگی۔ جس معیار کی رو سے وہ مسلمان کہلائے۔ اس لئے سوالات کی یہ نوعیت باقی نہیں رہتی کہ ہندوستان کے کس خطے میں مسلمانوں کی اخلاقی یا سماجی حالت کیسی ہے یا دوسری اقوام سے ان کے تعلقات کیسے ہیں اور ان کی سیاسی پالیسی کیا ہے؟ یا وہ نادار اور بے روزگار ہیں یا سرمایہ دار اور برسر کار؟

بلکہ سوال کی صحیح نوعیت یہ بنتی ہے کہ ان کے حالات کچھ بھی ہوں، وہ اس قوم کے بنیادی معیار کے مطابق ہیں یا نہیں؟ اور اگر وہ ایسا نہیں کر رہے تو ان کے دلوں میں ان کا بنیادی نصب العین کس طرح پیدا کیا جائے اور انہیں مختلف مصنوعی نصب العینوں سے ہٹا کر کس طرح اصلی اور حقیقی نصب العین کی طرف لایا جائے۔ غیر مسلموں کی نظر ہمارے حالات پر نہیں بلکہ کردار اور اخلاق اور قومی خصوصیات پر ہے جنہیں وہ تاریخ سے جانتے ہیں۔

عظیم تعمیری خدمت...... میں سمجھتا ہوں کہ بہت حد تک موجودہ حالات اور کردار اور اخلاق کی گراوٹ، نیز منصب سے روگردانی ہی نے انہیں اسلام کی اور مسلمانوں کی طرف سے شکوک وشبہات میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اگر کردار واخلاق معیار کے مطابق ہوتا اور اپنے منصبی فریضہ سے وہ غافل نہ ہوتے تو شکوک کی گنجائش نہ تھی۔ ہر شبہ کا جواب مسلمانوں کا کردار بن جاتا، جیسا کہ پہلے بنتا رہا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے اتحاد وتنظیم کے بغیر ان کا مستقبل تاریک ہے، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ یہ اتحاد بھی تجربہ اور قرآنی شہادت کی رو سے محض رسمی تنظیموں سے نہ کبھی حاصل ہوا ہے نہ ہوگا۔ اس کی صورت بھی ایمان وعمل صالح اور بالخصوص دعوت الی اللہ ہی سے ہویدا (ظاہر) ہوتی ہے۔ جس حد تک ہماری مخلصانہ توجہ اغیار کی طرف ہوگی اور ہم اسلامی حلقوں کی توسیع کی طرف متوجہ رہیں گے، اس حد تک طبعی طور پر باہمی خلفشار سے بچے رہیں گے۔ اگر جناب ان سوالات پر بھی خود بھی غور فرما کر یا ملک کے اہل فضل وکمال سے ان کے جوابات طلب فرما کر ان کے حل کی طرف متوجہ ہو جائیں گے تو یہ یقیناً قوم کے امتیاز وتفوق اور اس کے کردار کی بلندی کی ایک عظیم تعمیری اور بنیادی خدمت ہوگی۔

سوالات گرامی دیکھ کر جہاں ان سے استفادہ کی توفیق ہوئی، وہیں یہ چند سوالات بھی ذہن میں ابھر آئے۔ گو طالب علمانہ ہیں مگر پھر بھی پیش کر دینے کی جرأت کر رہا ہوں۔ مسلمانوں کی ہمہ جہتی تربیت میں خواہ وہ سیاسی اور اقتصادی ہو یا مذہبی، اگر یہ معیار پیش نظر رہے تو امید ہے کہ ان کی حالت بدل جائے گی اور ان میں حوصلہ مندی پیدا ہو جائے گی۔

والسلام

محمد طیب غفرلہ

مہتمم دار العلوم دیو بند

۳/ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ

تیونس و مراکش کی جدّو جہد آزادی

آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ خواہ یہ انسان سفید فام ہو یا رنگین قوموں کا فرد، خواہ چمکتے ہوئے سورج کا بیٹا ہو، یا اندھیری رات کا فرزند۔ جس طرح ایک انگریز، ایک فرانسیسی، ایک امریکن، ایک روسی آزاد ہونے کا حق رکھتا ہے، اسی طرح کینیا کا ایک حبشی اور شمالی افریقہ کا ایک تیونسی اور مراکشی بھی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کا مالک اور حق خود ارادیت میں مختار ہو۔ (از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ)

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا.

احوالِ واقعی...... بزرگانِ محترم! ہم یہاں انسانی تاریخ کے ایک اہم مرحلے پر ایک بڑے مقصد کے لئے جمع ہوئے ہیں، میں خداوند برتر و توانا کا اور اس کے بعد آپ حضرات کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس موقعہ پر صدارت کی عزت سے سرفراز فرمایا اور یہ موقع دیا کہ میں آپ کے سامنے دو قوموں کی آزادی کے معاملہ میں وکالت کا فرض انجام دوں۔

حقِ خود ارادیت...... زیادہ دن نہیں گذرے کہ ہمارے میدان، ہمارے کھلیان، ہمارے گاؤں کے چوپال اور بڑے بڑے شہروں کے ہال اس نعرہ سے گونج رہے تھے کہ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔ آج جبکہ ہمارا ملک آزاد ہے اور اس کی آزادی کے ۶ سال گذر چکے ہیں تو ہم ایک قدم آگے بڑھ کر اس عقیدے کا اعلان کرتے ہیں کہ آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ خواہ یہ انسان سفید فام ہو یا رنگین قوموں کا فرد، خواہ چمکتے ہوئے سورج کا بیٹا ہو یا اندھیری رات کا فرزند۔ جس طرح ایک انگریز، ایک فرانسیسی، ایک امریکن، ایک روسی آزاد ہونے کا حق رکھتا ہے۔ اسی طرح کینیا کا ایک حبشی اور شمالی افریقہ کا ایک تیونسی اور مراکشی بھی یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنی آزادی کا مالک اور حق خود ارادیت میں مختار ہو۔

آزادی کی حمایت...... حضرات! ہم یہاں ملک کی مشہور اور مؤقر جماعت جمعیت علماء ہند کی ہدایت پر تیونس اور مراکش کی آزادی کی حمایت کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ یہ وہی شہر ہے جہاں ملک کے قومی اور مذہبی رہنماؤں

نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' کا نعرہ لگایا تھا۔ آخر کار غلامی کی قوتوں نے ہندوستان چھوڑ دیا اور انگریزوں کو ہندوستان سے بوریا بستر باندھنا پڑا۔ آج ہم اس شہر میں فرانس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ تیونس اور الجزائر کو چھوڑ دے اور یہ امید رکھتے ہیں کہ یہ نعرہ بھی اسی طرح کامیاب ہوگا جس طرح ''ہندوستان چھوڑ دو'' کا نعرہ کامیاب ہوا۔

تیونس کی صورت حال ..... محترم حضرات! مجھے اجازت دیجئے کہ میں تیونس اور مراکش کے بارے میں چند باتیں آپ کے سامنے پیش کردوں، تیونس ۴۸ ہزار مربع میل کا اسلامی علاقہ ہے جو شمالی افریقہ میں بحر روم کے کنارے اٹلی اور فرانس کے سواحل کے سامنے واقع ہے۔

یہاں آخری مردم شماری کے مطابق ۲۶ لاکھ انسان آباد ہیں۔ اب یہ آبادی اندازاً ۳۰ لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ یہاں ایک لاکھ آٹھ ہزار فرانسیسی موجود ہیں جو ملک کی دولت پر قابض ہیں۔ یہاں برائے نام ایک سلطان موجود رہتے ہیں مگر اصل راج فرانسیسی شہنشاہیت کا ہے۔ پچاس سال کا عرصہ ہوگیا کہ غیر ملکی طاقتیں تیونس کے معاملہ میں بے جا اور ظالمانہ طور پر دست اندازی کررہی ہیں۔ تیونس کی جنگ آزادی نئی دستور پارٹی کی رہنمائی میں لڑی جارہی ہے مجھے اس تحریک کے اسیر رہنما جناب حبیب بورقیبہ سے گذشتہ سال اسی شہر بمبئی میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ جب کہ انہوں نے خلافت ہاؤس کے ایک نمائندہ اجتماع میں اپنے مطالبات آزادی کی شرح فرمائی اور مجھے ان کی تائید میں تقریر کرنے کا موقعہ دیا گیا۔ اس مختصر تقریر میں انہیں یقین دلایا گیا کہ ہندوستان کا آزادی پسند طبقہ اور بالخصوص مذہبی حلقہ آپ کے مطالبات کی تائید میں ہے۔ آج ایک سال کے بعد اسی وعدے کو دہرانے کا پھر موقع مل رہا ہے، آپ کے شہر میں تیونس امدادی کمیٹی موجود ہے۔ جس کا اعلان آپ تین چار روز پہلے اخباروں میں دیکھ چکے ہیں جو ان نعروں اور وعدوں کا عملی ثبوت ہے۔

مراکش کا مسئلہ..... تیونس سے زیادہ مراکش کا مسئلہ بین الاقوامی ہنگامۂ آزادی کا سبب بنا ہوا ہے۔ مراکش شمالی افریقہ میں مغرب اقصیٰ کا ملک ہے۔ یہ ملک عرض البلد شمالی کے (۴۸) اور (۳۶) درجے کے درمیان اور طول البلد غربی کے (۳) اور (۱۴) درجے کے درمیان واقع ہے۔ اس کے شمال میں بحر روم اور آبنائے جبل الطارق، مغرب میں اٹلانٹک سمندر، جنوب میں صحرائے اعظم اور شمال مشرق میں کوہستان واقع ہے، اس کا رقبہ ۵ لاکھ ۸۱ ہزار کلومیٹر مربع میل ہے۔

مراکش کو فرنگی اقوام نے جو بدقسمتی سے اس وقت جمہوریت کے نام پر دنیا کی ٹھیکیدار بنی ہوئی ہیں۔ تین حصوں میں تقسیم کرکے اس کی سالمیت، طاقت اور صلاحیت کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا ہے۔ ایک حصہ فرانسیسی مراکش ہے جو فرانس کی غلامی میں ہے۔ اس حصہ کا دار السلطنت فیض ہے اور اس کی آبادی ۸۴ لاکھ ۴۹ ہزار ہے۔ دوسرا حصہ اسپینی مراکش ہے جو اسپین کی غلامی میں ہے، جس کا پایۂ حکومت رباط ہے اور اس کی آبادی ۱۱ لاکھ ہے۔

تیسرا حصہ سفید فام بین الاقوامی غلامی کے ماتحت ہے جس پر انگریز، فرانسیسی، اسپینی، اطالوی، امریکی، ڈچ

اور حکیم شہنشاہیت پسند طاقتیں حکومت کرتی ہیں۔ اس کا دار الخلافہ طنجہ ہے اور اس کی آبادی دس ہزار ہے، ایک عام اندازے کے مطابق مراکش کی آزادی کا مسئلہ کم و زیادہ ایک کروڑ انسانوں کی آزادی کا مسئلہ ہے۔

دو نئی سلطنتیں...... پس آج شمالی افریقہ کے نقشہ پر اسلامی دنیا کی سرحدوں کے اندر دو نئی سلطنتیں ابھر رہی ہیں۔ ہمارے عقیدے کے مطابق اب دونوں قوموں کی آزادی ایشیا کی طاقت میں ایک نیا اضافہ کرے گی اور ان دونوں ملکوں کی آزادی سے دنیا کے امن کو ایک نئی ضمانت مل سکے گی۔

اس نقشے کے پیش نظر ہم آج یہاں یہ ظاہر کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں کہ آزادی کا وہ نعرہ جو ساری دنیا میں گونج رہا ہے، تیونس اور مراکش کو اس سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔

ہم دنیا کی رائے عامہ کے ساتھ مل کر یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ فرانسیسی شہنشاہیت کو تیونس، الجزائر اور مراکش سے دستبردار ہونا چاہئے۔ بالکل اسی طرح جس طرح برطانیہ ہندوستان اور پاکستان سے، امریکہ فلپائن سے، اٹلی طرابلس اور حبش سے اور ہالینڈ انڈونیشیا سے دست بردار ہو چکے ہیں۔

مطالبات اور تائید..... ہمارا یہ مطالبہ اس لئے ہے کہ:

1 ...... تیونس کی نئی دستوری پارٹی اور مراکش کی استقلال پارٹی دونوں ملکوں کے عوام کی طرف سے آزادی کا مطالبہ کر چکی ہیں اور یہ مطالبہ حق بجانب ہے۔

2 ...... اقوام متحدہ کے چارٹر کے ماتحت تیونس اور مراکش کی آزادی، آزاد دنیا کی طاقت میں اضافہ کرنے کے لئے ضروری ہے اور اقوام متحدہ کی اسمبلی میں دو نئے ملکوں کے داخلہ سے خود اقوام متحدہ کی ساکھ بڑھے گی اور شکوک و شبہات کم ہو جائیں گے جن سے دنیا کے امن کو خطرہ درپیش ہے۔

3 ...... عرب ایشیائی گروپ کی پندرہ طاقتیں تیونس اور مراکش کی آزادی کے لئے اقوام متحدہ کی راجدھانی (دارالحکومت) میں سرگرم کار ہیں اور ان طاقتوں نے یکم ستمبر ۱۹۵۳ء کو سلامتی کونسل میں دونوں ملکوں کی آزادی کا مقدمہ پیش کر دیا ہے۔ ان ملکوں کے ساتھ آزاد ہندوستان بھی شامل ہے، نہ صرف شامل بلکہ پیش پیش ہے۔ اس لئے یہ ہماری قومی پالیسی کا بھی تقاضا ہے کہ ہم ان دونوں ملکوں کے جہاد آزادی میں پوری پوری حمایت کریں۔

4 ...... ستمبر کے اجلاس میں عرب لیگ کی سیاسی کمیٹی نے یہ تجویز منظور کی ہے کہ اقوام متحدہ میں عرب ملکوں کے نمائندوں کو یہ ہدایت کی جائے کہ وہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے شروع ہونے والے اجلاس میں تیونس اور مراکش کی آزادی کا مسئلہ پرزور طریقہ پر پیش کریں اور اپنے دوست ممالک سے اس مسئلہ میں کمک حاصل کریں۔

فرانس کا دیوالیہ پن...... سیاسی واقعات کے اس صاف و صریح نقشے کو سامنے رکھ کر ہمیں ایک تجویز کی صورت میں تیونس اور مراکش کی آزادی کا مطالبہ کرنا چاہئے۔

جمہوریت اور آزادی کے اس دور میں جبکہ ابھی ماضی قریب میں پچاس کروڑ انسان (جو دنیا کی آبادی کا

پانچواں حصہ ہیں) اپنی آزادی کے مالک بن چکے ہیں۔ فرانس کا ایک کروڑ انسانوں کا غلام بنائے جانے پر اصرار کرنا اس کے سیاسی دیوالیہ ہونے کا ثبوت ہے، جسے آج کل کے دور میں آزاد قوموں کی منظوری نہیں ہو سکتی۔ اندریں حالات ہندوستانی عوام اور ان کی حکومت جنہوں نے انڈونیشیا کی آزادی کے لئے اور آج مصر اور فلسطین کی آزادی کی حمایت میں ہمنوائی کا فرض انجام دے رہے ہیں۔ تیونس اور مراکش کے مطالبۂ آزادی کی تائید و حمایت سے بھی کسی طرح چشم پوشی اور سکوت نہیں کر سکتے۔

آج دنیا میں امن، انصاف، حق خود ارادیت، مساوات اور انسانیت کے الفاظ سب سے زیادہ یورپ کی آبادیوں کے زبان زد ہیں۔ اگر ان کے یہاں ان الفاظ کے کچھ معنی ہیں اور حقیقتاً یہ الفاظ مہمل اور بے معنی بنا کر استعمال نہیں کئے جا رہے ہیں، تو فرانس، اٹلی، بلجیم، اسپین، انگلستان، امریکہ اور تمام ان یورپین طاقتوں سے جو تیونس اور مراکش پر اپنا پنجۂ استبداد (قبضہ) جمائے ہوئے مطمئن بیٹھے ہیں۔ ہم یہ اپیل کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ انسانیت پروری کے دعویدارو! اے امن وانصاف کے ٹھیکیدارو! اور اے خود ارادیت اور انسانی حقوق کے علمبردارو! تمہیں تیونس اور مراکش کی آبادیوں کو غلام بنائے رکھنے پر آخر کیوں اصرار ہے؟

اگر تمہیں حقیقی امن وانصاف اور انسانیت کی لاج نہیں تو کم از کم اپنے ان لفظی دعوؤں ہی کی پاسداری کرو اور ایک کروڑ انسانوں کے ایک ایسے جائز مطالبہ کی راہ میں حائل نہ ہو جن کی کمک پر پوری جمہوریت پسند دنیا کھڑی ہوئی ہے۔

مطالبۂ آزادی کی مذہبی پوزیشن...... حضرات! مجھے چوں کہ ہندوستان میں بلکہ ایشیا کے سب سے بڑی مذہبی اور علمی مرکز دارالعلوم دیوبند سے ذمہ دارانہ تعلق ہے اور اسی کے ایک ذمہ دار اور خادم کی حیثیت سے میں نے اسلامی اخوت کا حوالہ دے کر تیونسی لیڈر جناب حبیب بورقیبہ کو یقین دلایا تھا کہ اس مطالبہ میں ہندوستان کے مسلمان آپ کے ساتھ ہیں۔ اس لئے بے موقعہ ہوگا اگر میں اس اہم ترین مطالبۂ آزادی کی مذہبی پوزیشن واضح کئے بغیر اس افتتاحیہ کو ختم کر دوں۔ جبکہ کسی بھی ایسے اجتماعی یا سیاسی مسئلہ میں جس میں مسلمان بالاستقلال یا دوسری اقوام کے ساتھ مل کر کھڑے ہوں، اسلام نے ہمیں تشنہ نہیں چھوڑا بلکہ صاف، واضح اور روشن ہدایات دی ہیں۔ جہاں تک کسی قوم کی آزادی اور ظالم قوموں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا تعلق ہے، اسلام اس کا سب سے بڑا حامی ہے۔ فرعون سے بنی اسرائیل کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبۂ آزادی اس بارے میں ہدایت کا روشن مینارہ ہے۔ اسرائیلیوں کو مصر کی فرعونی حکومت نے غلام بنا رکھا تھا۔ انہیں اچھوت بنا دیا گیا تھا، اقتصادی حالت ان کی زبوں (بدتر) تھی۔ اوپر سے انہیں پارٹیوں میں منقسم کر دیا گیا تھا تا کہ ان کی سالمیت اور اجتماعی صلاحیت ختم ہو جائے۔ اس کا زینہ اولادوں پر کنٹرول تھا اور پیدا ہوتے ہی ان کو تہ تیغ کر دیا جاتا تھا تا کہ آئندہ بھی ان میں کوئی اولوالعزم سپوت پروان نہ چڑھنے پائے، جو اپنی قوم کی زبوں حالی سے متاثر ہو کر ابھر جائے اور اس غلام قوم میں کوئی صحیح لیڈر شپ قائم نہ ہو جائے۔ جو ان مظالم کے خلاف آواز اٹھائے، لیکن غاصب قوم کی اپنی سفاکیوں اور چالاکیوں کے اندھیریوں

میں بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مقدس ہستی اسرائیلیوں میں پیدا ہوئی اور ابھری جسے فرعون جیسے قاتل بنی اسرائیل کے دربار میں شاہانہ طریق پر بلوایا گیا۔ اور آخر انہوں نے قوم کی اس بے کسی اور بے بسی کو دیکھ کر فرعونی دربار میں اسرائیلیوں کی آزادی کا مطالبہ پیش کر دیا۔ فرعون نے اپنے کچھ سابقہ احسانات پرورش جتا کر اور نعمتوں کے تذکرے سے مطالبۂ آزادی کو ٹلانا اور رلانا چاہا۔ جس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ:

''ہاں میری سب سے بڑی نعمت جس کا تو مجھ پر احسان جتا رہا ہے شاید یہی ہوگی کہ تو نے میری قوم کے لاکھوں افراد کو غلام بنا رکھا ہے'' پھر اس نے دھمکیوں سے مطالبۂ آزادی کو دبانا چاہا جو ظالم قوموں کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے اور کہا: ''اے موسیٰ! میں تجھے جیل بھیج دوں گا''۔ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ: ''اگر چہ میں روشن دلیلیں بھی اپنے مطالبات کے جواب میں پیش کر دوں یعنی جیل اور قید و بند کی دھمکیوں سے ایک مدلل دعویٰ کا جواب تھوڑا ہی ہو سکتا ہے؟''

ان غلط حیلہ جوئیوں سے کوئی اثر نہ لیتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے واضح لفظوں میں فرعون کے سامنے یہ مطالبۂ آزادی رکھ دیا ہے کہ میں بحکم خداوندی کہتا ہوں کہ بنی اسرائیل کو آزاد کر کے میرے ساتھ کر دے اور ان کو غلامی کا عذاب دینے سے دست کش ہو جا۔ درصورت خلاف ورزی فرمایا کہ: ورنہ پھر اس کی ذمہ داری تجھ پر ہوگی اور حق وصداقت کے مطالبات جھٹلانے کا وبال جھٹلانے والے ہی کو بھگتنا ہوگا۔

اس واقعہ میں خدا کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو مطالبۂ آزادی دے کر بھیجنے سے واضح ہے کہ مظلوم قوموں کا مطالبۂ آزادی ایک مذہبی حق ہے جس کو خدا کی طرف سے تائید ہی حاصل نہیں، بلکہ اس کا حکم اور امر شامل ہے جو اس کے ضروری اور واجب ہونے کی دلیل ہے۔ نیز یہ کہ ایسے مطالبات کو لے کر اٹھنے والا درحقیقت ایک مذہبی تقاضہ کو پورا کرتا ہے۔ پھر جہاں تک کسی دبے ہوئے وطن اور سرزمین کو ظالموں کے ناجائز قبضہ سے نکالنے اور حق دار کو قبضہ دلانے کا تعلق ہے۔ اسی واقعہ میں اس کی بھی صاف وصریح ہدایت ملتی ہے۔

استخلاصِ وطن کی جدو جہد سے انکار پر عتابِ الٰہی ...... سرزمین فلسطین پر عمالقہ نے ناجائز قبضہ کر رکھا تھا اور بنی اسرائیل کو جن کی وہ سرزمین تھی، اس سے محروم کر دیا تھا۔ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اسرائیلیوں کو حکم بھیجا کہ فلسطین کی سرزمین تمہارا حق ہے، اس میں داخل ہو کر اس پر قبضہ کرو اور عمالقہ کی غاصب اور جابر قوم کا قبضہ وہاں سے اٹھا دو۔ بنی اسرائیل نے عمالقہ کے تن و توش اور ظاہری قوت سے مرعوب ہو کر تعمیل حکم میں پس وپیش کیا اور غاصب قوم کے مقابلہ میں اپنے کو کمزور سمجھ کر اپنے وطن میں داخل ہونے سے انکار کر دیا کہ جب تک یہ جابر قوم ہمارے وطن کو خود نہ چھوڑ دے گی ہم اس میں داخل نہ ہوں گے۔ ﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا﴾ ①

① پارہ: ٦، سورة المائدة، الآية: ٢٢.

قوم کو سمجھایا گیا کہ خدا سے ڈرو، اس پر بھروسہ کرو، وعدہ ہے کہ جب تم اس سرزمین میں داخل ہو جاؤ گے تو غلبہ تم ہی کو دے دیا جائے گا۔ مگر اس پر بھی بنی اسرائیل جی چرا گئے اور استخلاص وطن کے لئے جدوجہد کرنے سے انکار کر دیا تو اس پر انہیں خدا کی طرف سے سزا دی گئی۔ ایک تو یہ غلبہ و قبضہ چالیس برس مؤخر ہو گیا۔

اور دوسرے ۴۰ سال کی اس لمبی مدت میں بنی اسرائیل وادیٔ تیہ میں بھٹکتے پھرے، گویا سزا کے طور پر گھر سے بے گھر بھی رہے اور معتوب الٰہی بھی ہو گئے۔ اس سے واضح ہے کہ ظالم قوموں سے اپنی سرزمین کا چھڑانا ایک ایسا مذہبی فریضہ ہے کہ اس میں پس و پیش یا انکار کرنے سے اقوام معتوب خداوندی ٹھہر جاتی ہیں اور انہیں مزید تباہیوں اور ہلاکتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اس مقصد کے ضروری اور واجب ہونے کی دلیل ہے۔

آزادی، مذہبی اور انسانی حق ..... پس! آج تیونس اور مراکش کے باشندے اگر فرانس سے اپنی آزادی کا مطالبہ کرتے ہوئے ان سے اپنی سرزمین چھڑانا چاہتے ہیں اور اپنے ملک پر خود اپنا قبضہ چاہتے ہیں تو یہ ان کا شرعی اور مذہبی حق ہے جس کو انہیں بہر صورت حاصل ہی کرنا چاہئے۔ اور اگر ہم یا دنیائے اسلام کے تمام باشندے خواہ وہ عرب لیگ کے ممبر ہوں یا عرب ممالک کے سرکاری نمائندے اس مطالبۂ آزادی کی حمایت میں فرنچ حکومت اور یورپین اقوام کے غاصبانہ اقتدار کے مقابلہ میں کھڑے ہوں تو ان کا یہ فعل نہ صرف بین الاقوامی قانون، آزاد ممالک اور جمہوریت پسند اقوام کی متفقہ خواہشات کے مطابق ہے، بلکہ مذہبی اصول اور اسلامی قانون کے منشاء کے بھی عین مطابق بلکہ اس کے امر و حکم کے تحت ایک شرعی فریضہ ہے۔

بہر حال تیونس اور مراکش کے مطالبہ آزادی کی یہ حمایت خود ان ملکوں کی ذمہ دار عوامی جماعتوں، اقوام متحدہ کے چارٹر، عرب ایشیائی گروپ کی پندرہ طاقتوں، عرب لیگ کمیٹی کی تجویز، ہندوستان کی جمہوریت پسند پالیسی اور بالآخر مذہب کی صاف و صریح ہدایت کے تحت نہ صرف واجبی بلکہ واجب اور انسانیت کے حقوق کی صحیح حفاظت ہے۔

جہادِ آزادی میں شرکت ..... ہم جمعیت علماء ہند کے شکر گزار ہیں کہ اس نے عین وقت پر اس ملک کے لوگوں کو، مساوات کا شور برپا کرنے والوں کو کہا، اگر تم واقعی ان الفاظ سے دنیا کو دھوکا نہیں دے رہے ہو ان کا قومی اور مذہبی فریضہ یاد دلایا۔ ہم ان تمام جماعتوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں جو اس عظیم مقصد کے لئے کام کر رہی ہیں اور آئندہ کام کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ ہمیں اس کام کو قانونی پوزیشن کی حد تک اقوام متحدہ کے چارٹر کی روشنی اور اپنی قومی پالیسی کی رہنمائی میں جاری رکھنا چاہئے اور بمبئی کے اس نمائندہ اجلاس میں ایک مکمل اور جامع تجویز سلامتی کونسل میں بھیج کر شمالی افریقہ کے اس جہادِ آزادی میں اپنی شرکت کا واضح یقین دلا دینا چاہئے۔ نیز مجھے امید ہے کہ ذمہ داران اجلاس اس موقع پر اپنی سیاسی اور مذہبی بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے اس بارہ میں ہندی اقوام کے نقطۂ نظر سے تیونس اور مراکش کے تمام باشندوں کو بھی باخبر کر دینے کا خوشگوار فریضہ ادا کریں گے۔ (وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ)

آئینہ خدمت جمعیت علماء ہند

پیچیدہ حالات میں متضاد عناصر کی راہنمائی تو بجائے خود ہے، لب کشائی بھی آسان کام نہیں۔ البتہ اس تضاد اور کشمکش کے میدان میں وہی جماعت آگے آسکتی ہے، جو ان متصادم نظریات میں اپنے نصب العین کی حیثیت سے فریق کی حیثیت نہ رکھتی ہو۔ اس کی وسعت قلب ونظر اور پروگرام کی فراخیوں میں سارے نظریات گم ہوکر رہ جائیں اور وہ بمنزلہ ایک ثالث اور حَکَم کے ہو جو سب کے جھگڑے چکا سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی جماعت قدرتاً مذہبی جماعت ہوسکتی ہے جو مذہب کی لائن پر خود بھی گامزن ہو اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لئے جارہی ہو اور خلق خدا کو ایک ایسی بلندی پر دیکھنا چاہتی ہو کہ یہ نیچے کی ساری کش مکش ان چلنے والوں کی نگاہوں میں ہیچ اور حقیر بن کر رہ جائے۔ مذہب اور بالخصوص ''دین فطرت'' (اسلام) ہی ایک ایسی عالمگیر قوت ہے کہ آراء وقیاسات کی ساری حد بندیاں اس میں پہنچ کر گم ہوجاتی ہیں۔ (از: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ)

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا.

شکریۂ اکابر...... بزرگان ملت واعیان امت! اس مقدس جلسہ کی صدارت کا یقیناً میں اہل نہ تھا۔ پھر بزرگان اور اکابر شیوخ کی موجودگی نے تو میری ذات ہی کو درجۂ صفر میں پہنچا دیا ہے، اس صورت میں کسی نام نہاد اہلیت کا سوال بھی باقی نہیں رہتا۔ اس لئے جرأت نہیں ہوتی کہ اس مقام پر کھڑا ہوں چہ جائیکہ کچھ عرض ومعروض کروں۔ ساتھ ہی اس مقام کی ذمہ داریاں اور وہ بھی بحالات موجودہ جن وسیع معلومات اور جس ہمہ گیر فکر وتجربہ کی متقاضی ہیں وہ اپنے اندر مفقود ہیں۔ اس لئے رہی سہی ہمت بھی جواب دے دیتی ہے۔ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ جن بزرگوں نے بنام صدارت یہ عزت افزائی فرمائی ہے وہی اس کی سرپرستی بھی فرما رہے ہیں۔ اس مقام پر کھڑے ہونے کی جرأت کی اور اکابر واعیان کے شکریہ کے بعد ذیل کی چند معروضات پیش کرنے کی ہمت ہوئی۔

نظریاتی فتن کا دور...... حضرات محترم! آج کے حالات جن سے ہم گذر رہے ہیں نہایت پیچیدہ اور نازک ہیں، سطح پرسکون ہے مگر سطح کے نیچے آب زیر کا مضمون ہے۔ اوپر سے سبزہ زار ہے مگر اندر خارزار، اگر کوئی سطحی سبزہ

زار میں گھس جاتا ہے تو بیچ کے چھپتے ہوئے خار اسے زخمی کئے بغیر نہیں چھوڑتے۔ خصوصیت سے مسلمانوں کا معاشرہ چند در چند فتن میں گھرا ہوا ہے شریعت نے دین کے بارے ہمیں خبر دی تھی کہ دور فتن میں دین کا سنبھالنا ہاتھ میں چنگاری سنبھالنے کے مترادف ہوگا۔ لیکن آج دنیا کا تھامنا دین تھامنے سے بھی زیادہ مشکل ہوگیا ہے۔ کشمکشوں اور مصادمتوں کا دور دورہ ہے۔ قوم میں باہم جماعتی کش مکش علیحدہ ہے قومی رجحانات اور ہیں اور سرکاری کچھ اور، پھر ان دونوں لائنوں سے الگ ہو کر دونوں کے مدمقابل ہیں، افراد و جماعت ہی میں کش مکش نہیں بلکہ نظریات بھی باہم دست و گریباں ہیں۔ ان کشمکشوں میں مسلمان ۔

"دوگونہ رنج و عذاب است جان مجنون را"

کا مصداق ہے اور اس کی ہدف ہونے کی صورت یہ ہوگئی ہے کہ: ۔

ہر بلائے کز آسماں آید بر زمین نارسیدہ می پرسد

خانۂ انوری کجا باشد؟

یعنی مسلم آزار اغیار کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اگر مسلم آزاروں کی فہرست تیار کی جانے لگے تو اغیار کے ساتھ مسلمان بھی اس میں نظر آئیں گے۔

متضاد عناصر کی ہمہ گیر راہنمائی...... ظاہر ہے کہ پیچیدہ حالات میں متضاد عناصر کی رہنمائی تو بجائے خود ہے، لب کشائی بھی آسان کام نہیں، البتہ اس تضاد اور کش مکش کے میدان میں وہ جماعت آگے آسکتی ہے جو ان متصادم نظریات میں اپنے نصب العین کی حیثیت سے فریق کی حیثیت نہ رکھتی ہو، اس کی وسعت قلب و نظر اور پروگرام کی فراخیوں میں سارے نظریات گم ہو کر رہ جائیں اور وہ بمنزلہ ایک ثالث اور حکم کے ہو، سب کے قضیے چکا سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی جماعت قدرتاً مذہبی جماعت ہو سکتی ہے، جو مذہب کی لائن پر خود بھی گامزن ہو اور دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لئے جا رہی ہو اور خلق خدا کو ایک ایسی بلندی پر دیکھنا چاہتی ہو کہ یہ نیچے کی ساری کش مکش ان چلنے والوں کی نگاہوں میں ہیچ اور حقیر بن کر رہ جائے، مذہب اور بالخصوص "دین فطرت" (اسلام) ہی ایک ایسی عالمگیر قوت ہے کہ آراء و قیاسات کی ساری حد بندیاں اس میں پہنچ کر گم ہو جاتی ہیں۔

اس ہندوستان کی سرزمین میں اگر حضرت سلطان الہند خواجہ اجمیری، نور ہند خواجہ کلیری، قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ہر قرن کے علمائے ربانی و مشائخ حقانی قدس اللہ اسرارہم، نے ہر پارٹی ہر فرقہ اور ہر فریق کو آخر اپنی وسعتوں میں گم کر کے رکھ دیا تھا۔ تو ظاہر ہے کہ وہ پارٹی سسٹم کا ثمرہ نہ تھا بلکہ پارٹی فیلنگ (سوچ) سے بالاتری کا کرشمہ تھا آج بھی اگر مسلم اقوام کی صحیح رہنمائی ہو سکتی ہے تو خواہ وہ کسی لائن پر ہو، انہیں اعیان امت کے اس ہمہ گیر رنگ اور انہی کے سچے جانشینوں کے اسوہ پر کارآمد اور موثر ہو سکتی ہے۔

جمعیت کی سیاست سے علیحدگی کی ضرورت...... جمعیت علماء اپنی اصل فطرت سے ایک خالص مذہبی

جماعت ہے۔گو اس نے ۱۹۴۷ء سے قبل سیاسی خدمات کا ایک شاندار ریکارڈ قائم کیا۔قربانیوں کا لگاتار سلسلہ صفحۂ تاریخ پرثبت کیا اور آزادی کے میدان جنگ میں نہ صرف یہی کہ کسی سے پیچھے نہیں رہی بلکہ سب سے آگے ہو کر کام کیا۔لیکن پھر بھی اس کی بنیاد مذہب تھی اور مذہب ہی کے معیار سے اس نے یہ کچھ کیا۔وقتی ضرورت ختم ہو جانے پر بالآخر اس نے پھر اسی اصل کی طرف رجوع کیا جو اس کی اصل سرشت تھی یعنی مذہب اور مذہبی رجحانات۔

جمعیت علماء نے ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد سیاست سے علیحدگی کا جو نظریہ قائم کیا وہ یقیناً قومی تعمیر کے لحاظ سے موزوں ہی نہیں بلکہ ضروری تھا۔نہ اس لئے کہ سیاست کوئی شجر ممنوعہ تھی یا وہ اسکے حق میں عدم جواز کے تحت میں آگئی تھی، بلکہ عام سیاسی مصالح کے علاوہ اس لئے کہ انقلاب کے بعد کسی قوم کو بنانے والے طبقہ کے لئے سیاسی الجھنوں سے یکسو ہونا ہی طبعاً ضروری ہوتا ہے اور وہ سیاسی اتار چڑھاؤ میں گھر کر تعمیری کاموں کے لئے وقت نہیں دے سکتا۔

قومی تعمیر کی دفعات......قومی تعمیر کے سلسلے میں لمبے چوڑے پروگرام کو جو اپنی جزوی تفصیلات کے لحاظ سے بہت وسیع ہے،سمیٹ کر ذیل کے عنوانات کے تحت میں لا سکتے ہیں:

نظام تعلیم،نظام تبلیغ،اصلاح معاشرہ اور مذہبی وتمدنی حقوق کا سیاسی تحفظ۔قومی تعمیر کی ان دفعات میں سب سے پہلی چیز تعلیم ہے جس سے کسی قوم کا دل ودماغ بنایا جاتا ہے۔تمام کامیابیاں اور ہر نوع کی عزت وسربلندی کا ابتدائی زینہ علم ہے،حق تعالیٰ نے انبیاء ومرسلین کا سلسلہ اسی علم کی نشر واشاعت کے لیے قائم فرمایا۔اسلام میں سب سے پہلی آیت ہی "اقــــرا" نازل ہوئی جس کا حاصل پڑھنے پر ابھارنا ہے۔اسلام سے قبل کا قریبی دور گو ساری ہی بشری خرابیوں پر مشتمل تھا مگر اسے "دورِ جاہلیت" کا نام دے کر یہ جتلایا گیا کہ ہمہ نوع شرور وآفات کا سرچشمہ جہل اور ہمہ نوع کمال وخوبی کا سرمنشا علم ہے،اس لئے دینی تقاضوں کے اعتبار سے سب سے پہلا اور اہم ترین مسئلہ تعلیم کا مسئلہ ہے۔

سیکولر حکومت کے سائے میں مسلمان بچوں کے تعلیمی مستقبل کا تحفظ......وقت کے لحاظ سے یہ بھی مسئلہ مسلمانوں بلکہ ہر مذہبی فرقہ کے لئے زیادہ سے زیادہ توجہ طلب ہے،کیوں کہ جبری تعلیم کے قوانین کے تحت جو نصاب حکومت نے تیار کیا ہے اس سے سیکولرازم کا ثبوت نہیں ملتا۔اس کا عام رخ بلکہ اس کے بہت سے اجزاء اسلام کے عقائد واعمال پر براہ راست ایک مستقل زد ہیں۔جس سے ایک مسلمان بچہ کا عقیدہ وعمل کے لحاظ سے مسلمان باقی رہنا دشوار ہے۔اس لئے بمقتضائے وقت بھی اس کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کی کفالت قومی طور پر کی جائے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد بھی اکابر امت اور نبض شناسانِ قوم کی یہی اعلیٰ ترین سیاست تھی کہ وہ جابجا دینی مدارس قائم کرتے چلے گئے اور مسلمانوں کو مذہبی حیثیت سے سنبھال لیا۔یہ مدارس آج بھی بحمد اللہ کامیابی کے ساتھ جاری اور اپنے کام میں مشغول ہیں اور ان میں سے کتنے ہی مدارس مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔

جیسے دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، مدرسہ شاہی مرادآباد وغیرہ، ان مدارس کا مقصد جامع علماء تیار کرنا ہے، جو قوم کی ہدایت و رہنمائی کے فرائض انجام دیں۔ لیکن موجودہ دور اور اس کے حالات کے لحاظ سے ان مدارس کے علاوہ ایسے مکاتب کی بھی اشد ضرورت پیش آگئی ہے جو مختلف پراگندہ بلکہ گندہ لٹریچروں کے زہریلے اثرات سے مسلمان بچوں کو محفوظ رکھ سکیں۔ اگر مدارس دینیہ علماء تیار کریں تو یہ مکاتب دینیہ پڑھے لکھے دین دار تیار کر سکیں جو گو عالم نہ ہوں مگر دین کی سمجھ رکھتے ہوں۔

نصاب تعلیم اور ذریعہ تعلیم...... جمعیت نے ان ہی مقاصد کی روشنی میں کافی عرق ریزی سے ایک جامع نصاب تیار کرلیا ہے جو بتدریج ملک میں اپنی جگہ کرتا جا رہا ہے۔ اگر ہندوستان کے مختلف صوبے جمعیت کے ساتھ اس بارے میں تعاون کریں اور اس کے پروگرام کے مطابق یہ نصاب رائج کرنے پر تل جائیں تو بہت حد تک اس زہر کو نکالا جا سکتا ہے۔ جو ان غیر معتدل نصابوں یا مروجہ پبلک تعلیم (اندھی تعلیم) کے ذریعہ دل و دماغ میں پیوست کیا جا رہا ہے۔

اس ابتدائی اور بنیادی تعلیم کے لئے ذریعہ تعلیم اردو کے سوا دوسرا نہیں ہونا چاہئے، جیسا کہ اسکا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اردو ایک ملکی اور شیریں زبان ہونے کے علاوہ یہاں کی مادری زبان بھی ہے اور ساتھ ہی بہت سے علوم وفنون کی خزینہ دار بھی بن چکی ہے، اس کا تحفظ علوم وفنون کا تحفظ ہے جو بہر حال مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔

قدیم مدارس دینیہ نے بھی اس ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ انہوں نے تعلیم عربی کی رکھی اور تفہیم اردو کی، اس سے اردو زبان صرف ہندوستان میں ہی نہیں پھلی پھولی، بلکہ دنیائے اسلام کے ہزارہا افراد ان مدارس کی بدولت اردو دان ہو گئے اور آج افغانستان، ایران چینی ترکستان، روسی ترکستان، حجاز، افریقہ، عراق، جاوا، ساٹرا وغیرہ دور دراز ممالک بھی اردو زبان سے بے گانے اور بے تعلق نہیں۔ اور اس لئے جتنے ادارے آج اردو کے تحفظ پر زور دے رہے ہیں ہمیں ان سب کے ساتھ تعاون کرنے کی ضرورت ہے۔ چناں چہ پچھلے دنوں انجمن ترقی اردو نے تحفظ اردو کے سلسلے میں جو کامیاب مہم شروع کی، جمعیت علماء اور مدارس دینیہ نے اس کا خیر مقدم کیا اور بعد مقدور اس میں تعاون سے کام لیا جس کے اچھے آثار نمایاں ہو چکے ہیں۔

ذوق عربیت کی اہمیت...... مجھے اس سلسلہ میں ادھر بھی توجہ دلانا ہے کہ جیسے اردو ہماری وطنی اور علمی زبان ہونے کی حیثیت سے اس ملک میں اہمیت رکھتی ہے۔ ایسے ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ عربی زبان کو بھی اہمیت حاصل ہے۔

یہ قرآن وحدیث کی زبان ہے جو ہمارے دین و مذہب کا سرچشمہ ہے۔ ہندوستانی مسلمان جس حد تک مذہب میں فنائیت کا مقام رکھتے ہیں، اسی حد تک وہ اس مذہبی زبان سے نابلد اور بے پرواہ بھی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں قرآن اور اس کے محاورات سے مناسبت پیدا نہیں ہوتی، جو بہت حد تک ان کے دینی ذوق کے لئے حجاب اور کتاب وسنت سے بے تعلقی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اگر اقوام وملل اور دنیا کے ممالک میں ربط باہمی کا ذریعہ زبان کے سوا دوسرا نہیں تو کتاب وسنت کے لگاؤ اور ربط پیدا کرنے کا ذریعہ بھی عربی زبان کے سوائے دوسرا نہیں۔

ضرورت ہے کہ اردو نصاب اور اردو لٹریچر کے ساتھ اب مختصر عربی نصاب بھی مسلمان بچوں میں رائج کیا جائے جو انہیں عربیت سے بے گانہ نہ رکھے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے اس ضرورت کو مولانا محفوظ الرحمن صاحب نامی سابق پارلیمنٹری سیکرٹری نے پورا کر دیا ان کے عربی نصاب کا پانچ کتب پر مشتمل سیٹ عربی کی ایک قابل قدر پونجی ہے جس سے بچوں میں بہت آسانی کے ساتھ قلیل مدت میں قرآنی محاورات سے لگاؤ پیدا ہو کر عربیت کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اسے بھی اس اردو نصاب کے ساتھ جو جمعیت علماء نے مرتب کیا ہے مکاتب کا جزو بنا دیا جائے اور آگے بڑھایا جائے تو یہ اہم ضرورت پوری ہو سکتی ہے، جو کتاب وسنت ہی کی حد تک نافع ثابت نہیں ہوگی بلکہ دنیائے اسلام کے باہمی رابطہ کے لئے بھی موثر اور کارآمد ثابت ہوگی۔

تربیت عوام...... لیکن تعلیم پھر بھی تربیت خواص کا ذریعہ ہے اس سے تذکیر عوام کی ضرورت پوری نہیں ہوتی اس کا ذریعہ تبلیغ ہے۔ بشرطیکہ وہ جماعتی خصوصیات کی نہ ہو کہ اس سے تحزب اور گروہ بندی پیدا ہوتی ہے اور مسائل پیچھے رہ جاتے ہیں۔ خالص اسلامی مسائل کی نشر واشاعت اور الاہم فالاہم کے قاعدے سے جس قسم کی ضرورتیں پیش آئیں انہی کے مناسب حال شریعت کے مسائل سے دماغوں کو روشنی بخشی جائے۔

جمعیت علماء اس فرض سے بھی غافل نہیں رہی اس کی رپورٹوں میں تبلیغی خدمات کا بھی ایک ذخیرہ موجود ہے۔ فی الحال ایسے مبلغ تیار کئے جانے کی ضرورت ہے جو جھگڑالو نہ ہوں، ضدی نہ ہوں، سنجیدگی اور بصیرت کے ساتھ مسائل کو سلجھا کر دماغوں میں سلجھاؤ پیدا کریں۔ آج جبکہ پرچار اور تبلیغ کے نام پر بہت سے پراگندہ خیالات اور غیر اسلامی چیزیں آرہی ہیں، اشد ضرورت ہے کہ صحیح مسائل کو پیش کر کے دلوں کو تشتت و پراگندگی سے بچانے کی کوشش کی جائے۔

اصلاح معاشرت...... آج کا سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ عامۂ مسلمانوں کی معاشرت غیر اسلامی ہوتی جارہی ہے۔ ان کا رہن سہن چال چلن رفتار گفتار وغیرہ غیر اقوام کے نمونہ کا ہوتا جا رہا ہے۔ روحانی آداب کے بجائے جذبات نفسانی دل ودماغ پر چھاتے جا رہے ہیں۔ شادی غمی کے اجتماعات اور خانگی زندگی میں غیر اسلامی رسوم اور منکرات بطور جزو زندگی کے داخل ہو گئے ہیں۔ ان کی اصلاح کے بغیر مسلم قوم کا صحیح کیریکٹر اور مقام مخصص (خاص) نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کی اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔

اور وہ محض وعظ و چند یا لٹریچر سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے ساتھ ہر ہر مقام پر برادریوں میں سے بااثر لوگوں کو چن کر ان کی عملی کمیٹیاں بنائی جائیں۔ برادری کے بڑوں کی اصلاح پر زور صرف کیا جائے اور پھر ان کے ذریعہ اس اثر کو پھیلایا جائے جس میں عملی مشقت اور جدوجہد کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ جمعیت علماء قیام مکاتب اور تبلیغی نظام کے سلسلہ میں یہ خدمت باحسن اسلوب انجام دے سکتی ہے۔ پس قیام مکاتب اور تنظیمی مساعی کے وقت اس اصلاحی تنظیم کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو بہ سہولت کامیابی ہو سکتی ہے۔ یہ اصلاحی کام خود اتنا وسیع اور اہم ہے کہ جو طبقہ بھی اس کام میں ہمہ تن لگ جائے گا، اسے دوسرے میدانوں میں کودنے کا وقت نہیں مل سکتا۔

بنا بریں ان امور کے لئے تقسیم عمل کی ضرورت ہے۔قومی کاموں کے سینکڑوں شعبے ہیں اگر کارکنوں کا ایک ہی طبقہ سارے کاموں کو سنبھالنے کی فکر میں لگ جائے تو کوئی کام نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے تقسیم عمل کے اصول پر کارکنوں کی جماعت کو بانٹ دیا جانا ضروری ہے۔

جمعیت علماء ان تعمیری خدمات میں لگ کر یقیناً سیاسی میدانوں میں پہلے کی طرح نہیں اتر سکتی، لیکن اس کے معنی کلی یکسوئی کے بھی نہیں۔ اگر جمعیت علماء مسلمانوں کی مذہبی، معاشرتی اور عام اجتماعی خدمت کے لئے کمربستہ ہوگی تو لامحالہ مثبت پہلو کے ساتھ اسے منفی پہلو بھی سامنے رکھنے ہوں گے اور یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ مسلمانوں کے مذہبی، معاشرتی اور تمدنی حقوق پر کس راستہ سے زد پڑ رہی ہے؟ اور اس کے انسداد کی کیا صورت ہے؟ اگر قانون ان حقوق پر اثر انداز ہے تو اس کے خلاف احتجاج کرنا اور اسے اپنی پوری آئینی جدوجہد سے بدلنے کی سعی کرنا بھی اسی کا کام ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس منفی پہلو کی روک تھام کے لئے اسے سیاست اور سیاسی رفتار سے کلی علیحدگی کئے بغیر، اس پر گہری اور تنقیدی نظر بھی رکھنی پڑے گی اور ساتھ ہی سیاسی حلقوں سے کچھ نہ کچھ قریب بھی رہنا ہوگا۔ اس لئے جمعیت علماء کے سیاست سے کلی علیحدگی کے کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتے۔ سیاسی میدان سے اس حد تک تعلق اس کے ۱۹۴۷ء کے اعلان علیحدگی سیاست کا مخالف نہیں، کیوں کہ سیاست سے اس کا اتنا تعلق کسی عام عملی جدوجہد کے بغیر بھی ممکن ہے۔ جہاں تک پارلیمنٹری سیاست کا تعلق ہے جس سے جماعتی علیحدگی کا اعلان ۴۷ء میں کیا گیا ہے وہ بدستور اپنی جگہ قائم ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ گذارش کئے بغیر نہ رہوں گا کہ خاص افراد کو چھوڑ کر کم از کم جمعیت کے عام عہدیداران اور اس نظریہ میں عملی ہم آہنگی قائم رہنی ضروری ہے۔ ورنہ یہ صورت حال غلط اور صحیح ہر قسم کے الزامات کا منشاء بنتی رہے گی۔

جو جماعتیں خالص سیاسی یا دفاعی لائنوں پر کام کرنا چاہتی ہیں، ہمارے لئے ان سے الجھنے کا کوئی موقعہ نہیں۔ تعمیری کام کتنے بھی ضروری ہوں، دفاعی ضرورتوں سے خالی نہیں رہ سکتے۔ بالخصوص جبکہ دور ہی کشاکشی اور کشمکش کا ہو۔ تقسیم عمل کے اصول پر اگر کوئی جماعت اپنے اندرونی دواعی اور سچے ارادوں سے ایسی کوئی لائن اختیار کرتی ہے تو اس کے مسائل پر ہمیں جانچ اور تنقید کا حق حاصل ہونا چاہئے۔ لیکن خود اس کمیونٹی یا جماعت کو رد کر دینے کا کوئی موقع نہیں۔ اگر وہ آئین کے دائرے میں اپنے کام کے لئے کوئی وجہ جواز رکھتی ہو تو کلمہ خیر کہہ دینے کا بھی مضائقہ نہیں۔

جمعیت کا منتہائے نظر...... جمعیت علماء اپنے نام ورسم کے اعتبار سے اہل علم کی جماعت ہے، جس کا منتہائے نظر مذہب اور دین ہے۔ اس لئے وہ صرف اپنے ہی حلقہ کے لئے نہیں بلکہ مسلمانوں کی تمام کارکن جماعتوں کے لئے ایک مفتی کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اس لیے اس کا اخلاقی ہی نہیں بلکہ کوئی نہ کوئی آئینی ربط بھی ملک کے ذی رائے طبقہ اور مسلمانوں کی دوسری مذہبی اور سیاسی جماعتوں سے قائم رہنا مناسب ہوگا۔ تاکہ مسلمانوں کے ہر طبقہ کی مذہبی ضروریات اور ان کی مواقع و مشکلات خود ان ہی حلقوں کی زبانی براہ راست جمعیت علماء کے سامنے آتی رہیں اور ادھر

جماعتی مسائل میں جمعیت کو بھی ہر طبقے سے فکری مدد ملتی رہے۔ اس سلسلہ میں اگر جمعیت کے انتخابات کی صورتیں امکانی حد تک رسمیات سے آزاد ہو کر سادہ اور بے تکلف رہیں تو ان میں ہمہ گیری بھی بڑھ جائے گی۔ خود اس عوام کی کشش میں بھی اضافہ ہوگا اور کسی طبقہ کو بھی عقیدت سے اس کی طرف رجوع کرنے کی کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔

تقسیم ہند کے بعد جمعیت کا کردار...... ۱۹۴۷ء کے بعد جمعیت علماء کے ذمہ دار کارکنوں نے مسلمانوں کے پرسنل اور مخصوص معاملات کی سرانجام دہی کے سلسلہ میں جو شاندار خدمات انجام دی ہیں نہ وہ نظرانداز کی جاسکتی ہے اور نہ ہی صفحہ عالم سے مٹ سکتی ہیں۔ ایسے معاملات کا سلسلہ ظاہر ہے کہ اس وقت تک برابر قائم رہے گا جب تک کہ حالات کلیۃً سازگار نہ ہو جائیں۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی حجاج اور زائرین حرم کے پاسپورٹ کے ساتھ انکم ٹیکس کے فارم کی خانہ پری کی قید بھی ہے جو اس سال سے لگائی جا رہی ہے۔ یہ مختلف وجوہ سے حجاج کے لئے پریشانیوں کا باعث ہوگی اور اس کا اثر زائرین کی تعداد اور حج کے ابھرتے ہوئے ذوق وشوق پر بھی پڑ سکتا ہے۔

امید ہے کہ جمعیت علماء اس بارے میں پوری توجہ سے کام لیتے ہوئے حج کے پاسپورٹ سے اس قید کو اٹھا دیئے جانے کی پوری پوری جدوجہد کرے گی۔

بے کاری اور بے روزگاری کا مسئلہ...... اس سلسلہ میں ایک مسئلہ مسلمانوں کی بے کاری اور بے روزگاری کا بھی ہے جو ان کے لئے باعث تشویش و پریشانی بنا ہوا ہے۔ اس میں الجھ کر بھی ان میں ترک وطن کے وساوس ابھرنے لگتے ہیں۔ کبھی آئندہ نسلوں کے بارے میں پریشان کن خیالات انہیں ستاتے ہیں اور یوں بھی بے کاری بہت سے فتنوں کی آبیاری (افزائش) کی جڑ ہوتی ہے۔ برسرکار اور بارروزگار ہو جانے سے خود ہی بہت سے مفاسد کا سدباب ہو جاتا ہے۔ جمعیت علماء اس کی کوئی ذمہ داری تو نہیں لے سکتی۔ لیکن اگر زیر غور مسائل میں یہ مسئلہ بھی سامنے رکھ لیا جائے تو قوم کے اغنیاء یا حکومت کے ذریعہ غرباء کی بیکاری کا مسئلہ حل کرنے کی کیا کیا صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ تو ممکن ہے کہ کسی حد تک اس مسئلہ میں مسلمانوں کو تسلی دلائی جاسکے اور ان کے اطمینان خاطر کا کم از کم استدلالی سامان ہی فراہم کیا جا سکے۔

قیام مکاتب اور اصلاح معاشرت کی مساعی کے سلسلہ میں اگر یہ مسئلہ سامنے رہے تو ہر جگہ کے اغنیاء اور غرباء کے ارتباط (رابطہ) سے اس مشکل کے آسان ہونے کی صورتیں کچھ نہ کچھ ضرور پیدا ہوں گی۔

جمعیت کے ساتھ تعاون کی ضرورت...... بہر حال جمعیت علماء کی سابقہ بیش قیمت خدمت کے ساتھ آج بھی اگر اس کے تعمیری پروگرام اور کام کو سامنے لایا جائے تو اس کی وسعتیں سابق سے کم نہیں ہوئیں۔ یہ کہنا کسی طرح بھی معقول نہ ہوگا کہ اگر جمعیت علماء نے سیاسیات سے علیحدگی کا اعلان کر دیا، تو اب اس کے مشغول میں کچھ باقی نہ رہا اور اس کی کائنات ختم ہوگئی اگر اس کی سیاسیات حقیقتاً مذہب کے ماتحت اور بلاشبہ تھیں تو یہ کہا جا سکتا

ہے کہ پہلے بھی وہ مذہب ہی کا کام کر رہی تھی اور آج بھی مذہب ہی اس کے سامنے ہے۔ ضرورت ختم ہو جانے یا بدل جانے پر کام کی نوعیت میں فرق پڑتا ہے، اصل موضوع و مقصد میں کوئی تغیر نہیں آتا۔ اور اس نے آج بھی اس کے نصب العین کا دامن پہلے ہی کی طرح بھرپور ہے اور اس لئے جس طرح ۴۷ء سے پہلے اس کے نظام میں شامل ہونے کی ضرورت تھی، اسی طرح آج بھی ہے۔

بالخصوص اس کے تعلیمی پروگرام کو عملاً جاری کرنے اور پھیلانے کے لئے ضرورت ہے کہ مسلمان جمعیت علماء کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں اور پوری امنگ اور حوصلہ کے ساتھ اس کا ساتھ دیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد جمعیت علماء ہی ایک ایسی جماعت ہے جس کے پلیٹ فارم پر مسلمان اپنے تمام دینی، معاشرتی، تمدنی اور دوسرے تمام جماعتی مقاصد کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک شاندار تاریخ ہے جو سب کے سامنے ہے، کل کی طرح آج بھی اس سے بے اعتماد ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس لئے نئی نئی جماعتیں بنانے کی بجائے یہی زیادہ بہتر ہے کہ اس بنی ہوئی جماعت سے کام لیا جائے۔ اس کے نظام کو مضبوط بنایا جائے اور زیادہ سے زیادہ اس کے نظام سے وابستہ ہو کر اسے کامیاب بنایا جائے۔

رائیوں کے تفاوت اور اختلاف خیال سے نہ کوئی ادارہ خالی رہ سکتا ہے نہ کوئی جماعت۔ لیکن یہ کسی جماعت کے ساتھ مل کر کام کرنے میں مخل نہیں ہو سکتا۔ بشرطیکہ کام کرنے کا عزم ہو اور نیت صادق ہو، بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ جمعیت علماء کے مقاصد مسلمانوں کی کسی خاص جماعت یا خاص پارٹی سے بھی تعلق نہیں رکھتے، اس لئے تمام مسلمان اس ادارہ کو بلاتفریق خیال و مشرب اپنا سکتے ہیں۔

سرمایۂ جمعیت...... جمعیت علماء اپنے پیچھے ایک عظیم الشان تاریخ رکھتی ہے۔ اس کے نظریات ہندوستان کے ان چیدہ علماء کے ذہنوں کا سرمایہ ہیں جنہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کی کامیاب خدمت اور تربیت کی ہے۔ اس لئے اس کے نظریات کی حد تک بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اس کے کسی بھی نظریہ کو مان کر مسلمانوں کو پچھتانا نہیں پڑا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس کے نظریات اور ہمارے اعتماد و تعاون میں کوئی خلیج حائل نہیں ہو یا ہم اس کی تنظیم میں شامل ہونے سے کوئی جھجک محسوس کریں، اگر رکاوٹ کی کوئی وجہ بھی سامنے ہو تو اس کے دفعیہ کا طریق بھی اعتراض یا دور بیٹھ کر کچھ کہنے سننے کی بجائے کہیں زیادہ مفید ہو سکتا ہے کہ یگانگت کے ساتھ قریب ہو کر اس کی اصلاح کی جائے۔

جو چیزیں اس وقت عرض کی گئیں وہ نئی نہیں ہیں، پہلے بھی بارہا کہی جا چکی ہیں ہیں اور ان کا بہت سا حصہ خود جمعیت علماء کے پروگرام میں پہلے ہی سے شامل ہے۔ مقصد صرف تذکیر و تجدید اور آپ سے طلب عمل ہے، کسی آئین و اصول کی خوبی کھلنے کا راستہ صرف عمل ہے، اگر عمل نہ ہو تو قرآنی اور قطعی اصول بھی اپنی جگہ کتنے ہی بلند پایہ ہوں، نافع ثابت نہیں ہو سکتے۔

حالات کا تقاضا ہے کہ جزوی آراء و قیاسات کے اختلافات کو یک قلم ترک کر کے راہ عمل پر قدم بڑھائے

جائیں، بلکہ اب اس کی بھی ضرورت نہ ہونی چاہئے کہ جمعیت علماء لوگوں کو بلائے اور کام میں لگنے کی بار بار اپیل کرے بلکہ لوگ از خود اپنی خدمات پیش کر کے اس کا ہاتھ بٹائیں، اگر بالفرض کارکنان جمعیت کے عمل میں کوتاہی اور فروگذاشت بھی ہے جس سے کوئی فرد اور کوئی جماعت بری نہیں، تو وہ بھی آپ حضرات کے مستعد ہو جانے اور عمل کا مطالبہ کرنے پر رفع ہو جائے گی جس سے اعتراض کی ضرورت ہی پیش نہ آئے گی۔

بزرگان جمعیت علماء کی یہ صدارت بخشی اپنے ایک کمر بستہ خادم کی محض حوصلہ افزائی ہے، ورنہ اس مجمع اکابر و اعیان کے سامنے ایک ذکارہ و نااہل کا کرسیٔ صدارت ہی نہیں بلکہ اس صف کی کسی کرسی پر بیٹھنا بھی جرأت و بے ادبی ہے۔ میں اس بے ادبی کی معافی چاہتے ہوئے ان سطور کو ختم کرتا ہوں اور ”جمعیت علماء زندہ باد“ کہتا ہوں۔

نصاب تعلیم کی تدوین

قرآن ہر زمانے میں ایک رہا لیکن اس کی تفہیمات کا انداز بدلتا رہا۔ جس دور میں مثلاً فلسفہ کا زور تھا تو قرآن کو فلسفیانہ رنگ میں سمجھایا گیا۔ جس دور میں تصوف کا زور ہوا تو قرآن کو صوفیانہ رنگ میں سمجھا گیا۔ آج سائنس کا دور ہے تو وہ سائنسی رنگ میں تجلی کرے گا۔ اس ساری حقیقت کو میں بطور خلاصہ ان الفاظ میں لاسکتا ہوں کہ "مسائل پرانے ہوں اور دلائل نئے ہوں" ہم ان ہی ٹھیٹ فطری مسائل کو جدید آلات سے مسلح کر کے میدان میں لائیں گے۔

(از: حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ)

عربی و فارسی نصاب تعلیم کے متعلق اسمبلی ہال لکھنؤ میں
حضرت اقدس حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخی معرکۃ الآراء تقریر

پس منظر..... حکومت ہند نے مدارس عربیہ کی تنظیم اور ترمیم و اصلاح نصاب تعلیم علوم مشرقیہ کے متعلق جو قدم اٹھایا ہے وہ یقیناً قابل تحسین اور لائق تشکر و امتنان ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند نے ۷ ربیع الاول ۶۶ھ کو ایک مفصل مکتوب عالی جناب حضرت مولانا ابوالکلام آزاد صاحب وزیر تعلیمات انٹریم گورنمنٹ ہند کی خدمت میں ارسال فرمایا تھا جس میں دارالعلوم دیوبند کی سند فراغ اور سند تکمیل کو معتبر اور موثر قرار دیئے جانے کے متعلق موصوف کو خصوصی توجہ دلائی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ آج اگر فضلائے دارالعلوم اپنی معاشی ضروریات کے ماتحت حکومت کے کسی محکمہ میں ملازمت کرنا چاہتے ہیں تو وہ خواہ کتنی ہی بہترین استعداد رکھتے ہوں، انہیں مولوی فاضل یا اسی کے مساوی کوئی سرکاری امتحان پاس کئے بغیر سرکاری ملازمت کا موقع میسر نہیں آتا۔ حالاں کہ دارالعلوم کے فضلاء علمی قابلیت کے اعتبار سے ہر حیثیت سے یونیورسٹیوں کے رسمی ڈگری یافتہ لوگوں سے لائق و فائق ہوتے ہیں، اگرچہ دارالعلوم کی تعلیم کا مقصد سرکاری ملازمتوں کا حصول نہیں ہے، مگر جو لوگ ضروریات سے مجبور ہو کر اس کے خواہش مند ہوتے ہیں ان کے حقوق مولوی فاضل، بی اے، ایم اے کے مساوی اور سند تکمیل کو ایم اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے مساوی تسلیم کئے جانے میں حکومت کو تامل نہیں ہونا چاہئے۔

اس سلسلہ میں اس امر کی وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ دارالعلوم ہر حالت میں اپنے نظام تعلیم، امور انتظامی اور حکومت کی امداد سے جس طرح اب تک بے تعلق اور آزاد رہا ہے۔ یہی پالیسی اس ادارہ کی مستقبل میں بھی بدستور رہے گی۔

حضرت مہتمم صاحب کے اس مفصل مکتوب کے جواب میں مولانا آزاد صاحب کی جانب سے جواب موصول ہوا کہ میں خود اس بارے میں جناب والا سے ملاقات اور مفصل گفتگو کرنا چاہتا تھا، چوں کہ ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء کو اسمبلی ہال لکھنؤ میں عربی وفارسی نصاب تعلیم کے متعلق ایک سرکاری تعلیمی کمیٹی کے زیر سرپرستی ایک تعلیمی کانفرنس منعقد ہوگی۔ جس میں دارالعلوم کے نمائندے بھی شریک ہوں گے، اسی میں جناب والا سے بھی اس معاملہ میں تبادلہ خیال ہوگا۔ براہ کرم اس موقع پر تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی جائے۔

چنانچہ ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء کو اس تعلیمی کانفرنس میں دارالعلوم کی جانب سے حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند شریک کانفرنس ہوئے۔ ان حضرات کی معیت میں مولانا فخر الحسن صاحب، مولانا معراج الحق صاحب مدرسین دارالعلوم، مولانا عزیز احمد صاحب مبلغ دارالعلوم اور احقر خلیق احمد صدیقی مدیر ماہنامہ دارالعلوم، مبلغ و ناظم شعبہ صنعت وحرفت دارالعلوم بھی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ یوپی کے مختلف مشرقی تعلیمی اداروں کے نمائندوں سے اسمبلی ہال بھرا ہوا تھا۔ حکومت یوپی کے وزیر اعظم اور دیگر متعدد وزراء اور پارلیمنٹری سیکرٹری صاحبان بھی شریک کانفرنس تھے، ٹھیک تین بجے سہ پہر صدر کانفرنس مولانا آزاد صاحب نے ایک بسوط (جامع) تقریر صدارت تقریباً پونے دو گھنٹہ فرمائی جس میں تاریخی حیثیت سے مسلمانوں کے علمی تفوق اور اس کے تنزل کی کیفیت بیان فرماتے ہوئے مدارس عربیہ کے موجودہ نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم پر سخت تنقید فرمائی، اور بتلایا کہ اس طریق تعلیم اور نصاب تعلیم کے بہت سے گوشے وقت کے تقاضوں اور ضرورت کو پورا کرنے سے عاری اور یکسر خالی ہیں۔ جنہیں بہت جلد پورا کر دینے کی ضرورت ہے، طریق تعلیم املا ہونا چاہئے۔ کتاب کی پابندی ایک فضول اور مضر چیز ہے۔ جس سے علم چند سطروں میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ نظر وفکر اور اجتہاد کا ملکہ پیدا ہونا مفقود ہو چکا ہے۔ مولانا کی اس تنقید سے بعض حضرات علماء پر گرانی کا اثر ہوا اور وہ ایک حد تک بجا تھا لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ ختم تقریر پر خود مولانا آزاد صاحب نے بھی اس کو محسوس فرمایا کہ موصوف اس تنقید میں حدود سے ایک حد تک تجاوز فرما گئے ہیں۔

اور انہوں نے فرمایا کہ: مجھے ابھی اور بھی کچھ کہنا تھا اور پھر آپ حضرات کی آراء سے مستفید ہونا تھا لیکن چونکہ وقت پورا ہو چکا ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ کانفرنس کا ایک دوسرا اجلاس کل ۲۳ فروری کو ڈیڑھ بجے سہ پہر سے اور رکھ لیا جائے۔ چناں چہ دوسرے روز ٹھیک ڈیڑھ بجے سہ پہر کو حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم اور دوسرے حضرات علماء کرام، اسمبلی ہال میں وقت مقررہ پر پہنچ گئے۔ تقریباً پونے دو بجے مولانا آزاد صاحب نے تقریر صدارت کا سلسلہ شروع فرمایا جس میں نصاب تعلیم کے مسئلے کو دہراتے ہوئے فرمایا کہ اس سلسلہ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آج علم کو محض علم کے لئے جو طبقہ پڑھتا ہے جس کی غرض علم سے کسب معاش نہیں ہے، بلکہ صرف علم اور علمی کمال پیدا کرنا ہے۔ وہ صرف یہ قومی مذہبی آزاد مدارس ہیں۔ جو دینیات کی تعلیم انتہائی استغناء اور لاغرضانہ

طریق پر دے رہے ہیں۔ جن میں خصوصیت سے دارالعلوم دیوبند ایک اعلیٰ ترین مرکزی درسگاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس نے گزشتہ اسی (۸۰) سال میں نہایت شاندار علمی خدمات انجام دی ہیں، اس مرکزی علمی ادارے نے مشرق و مغرب میں اپنے علمی آثار پھیلائے اور افغانستان، بخارا، بلخ، جاوا، سماٹرا، عرب، ترکستان، وغیرہ تک اس کے فضلاء پھیل گئے جنھوں نے اسلام کی سچی اور حقیقی خدمت انجام دی۔

میرے پاس اس بارے میں ایک جچی تلی تحریر بھی پہنچی ہے جس میں یہی دکھ ظاہر کیا گیا ہے کہ ان فضلائے دارالعلوم کو ان کی اعلیٰ ترین قابلیت کے باوجود آخر وہ مقام کیوں نہیں دیا جاتا جس کے وہ اہل اور مستحق ہیں (یہ اشارہ حضرت مہتمم صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے اس خط کی طرف تھا جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے) یہ خود میرے دل کی آواز ہے۔ مگر ضرورت اسکی ہے کہ وہ تھوڑا سا اپنی جگہ سے آگے بڑھیں اور ان کی تعلیمی زندگی میں کچھ خفیف سا تغیر ہو۔ ان کے نصاب تعلیم میں وقت کے تقاضوں کو کچھ پورا کیا جائے۔ زیادہ نہیں، بہت تھوڑا سا تغیر کافی ہوگا۔ نصاب کی اصلاح، طریق تعلیم میں قدرے تغیر اور تعلیمی رنگ کی ذرا سی تبدیلیاں۔ بہر حال اس طرح مولانا آزاد صاحب نے آج کی تقریر میں دردمندانہ انداز میں علمائے کرام سے اپیل کی کہ وہ اصلاح نصاب تعلیم کے مسئلہ پر غور کریں اور پہلے دن کی تقریر میں جو شدت آگئی تھی اس کی کافی حد تک تلافی فرمادی۔ مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کے بعد مصلاحی خان بہادر مولوی مہدی حسن صاحب شیعی مدارس عربیہ لکھنؤ کے نمائندے کی حیثیت سے تقریر کے لئے باجازت صاحب صدر کھڑے ہوئے اور انہوں نے تحریری یادداشت سامنے رکھ کر مولانا آزاد کی حرف بحرف تائید کی۔ صرف انگریزی زبان کی تعلیم بحیثیت زبان ثانوی مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں داخل کئے جانے کی مخالفت کی۔ اس کے بعد حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند (جو تمام علماء دیوبند، علمائے مظاہر العلوم سہارنپور اور مرادآباد کی طرف سے اس بارے میں اظہار خیال کے لئے نمائندہ بنائے گئے تھے) اپنی جگہ کھڑے ہوئے اور صدر محترم مولانا آزاد سے تقریر کی اجازت چاہی۔

صاحب صدر نے نہایت خوش دلی اور آرزومندانہ انداز کے ساتھ حضرت مہتمم صاحب کو تقریر کی اجازت دی۔ چونکہ ابتداء میں آواز کسی قدر دھیمی تھی جسے صاحب صدر نہیں سن سکے۔ اس لئے صاحب صدر نے فرمایا کہ جناب! میرے پاس اسٹیج پر تشریف لے آئیں اور یہاں سے تقریر فرمایئے۔ چناں چہ حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم نے اسٹیج پر مولانا آزاد کی کرسی کے قریب کھڑے ہو کر اپنے مخصوص خداداد دلنشیں انداز میں نہایت فصیح و بلیغ جامع مانع تقریر فرمائی جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

خلاصۂ تقریر حضرت مہتمم صاحب رحمہ اللہ علیہ..... اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی (اس کانفرنس میں صرف اسی تقریر کی خصوصیت تھی کہ وہ اللہ کے نام سے شروع کی گئی) صدر محترم و معزز حاضرین! تعلیمی کمیٹی کا یہ عملی اقدام جو عظیم الشان کانفرنس کی صورت میں آپ کے سامنے ہے اور کانفرنس میں صدر گرامی قدر کے

ارشادات جوکل سے اب تک آپ نے سنے ہیں، ایک نہایت ہی مبارک اقدام اور تعلیمی سلسلہ میں مستحسن قدم ہے۔

صحیح تعلیم کے اسباب وعوامل...... اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی قوم کی برتری اور ترقی اس کی بقا نہیں بلکہ اس کا قیام جس بنیاد پر استوار ہے، وہ صرف صحیح تعلیم ہے۔ صحیح تعلیم سے میری غرض یہ ہے کہ نصاب تعلیم موزوں ہو، طریق تعلیم موثر ہو، ذریعہ تعلیم فطری ہو، اساتذہ کا انتخاب صحیح ہو، نظام تعلیم درست ہو۔ اگر کسی قوم میں تعلیم ہی نہ ہو تو یہ ایک بنیادی روگ ہے جس سے کوئی قوم پنپ نہیں سکتی، نصاب تعلیم اگر غلط ہو تو ذہن کا سانچہ درست نہیں ہو سکتا، طریقہ تعلیم غلط ہو تو تعلیم کا پورا اثر نہیں ہو سکتا۔

استاذ قابل نہ ہو تو قابلیت کا دروازہ ہی نہیں کھل سکتا۔ سب کچھ ہو اور نظام تعلیم درست نہ ہو تو نتائج متوقع نہیں نکل سکتے۔ غرض تعلیم کی صحت کے لئے ان اجزاء کا ہونا ازبس ضروری اور یہ تعلیم کے حق میں بنیادی ہیں۔ لیکن اگر آپ غور فرمائیں تو ان سب بنیادوں کی ایک اور گہری بنیاد ہے کہ اس کی صحت وسقم پر ان سب امور کی صحت وسقم موقوف ہے اور وہ ہے "تعلیم کا نصب العین اور مقصد" اس نصب العین کی خوبی وخرابی سے ان بنیادوں میں خوبی و خرابی پیدا ہوتی ہے، بلکہ یہ نصب العین تعلیمی اداروں اور اداروں سے فیض حاصل کرنے والوں کی کامیابی اور ناکامی کی کسوٹی ہے۔ اسی نصب العین کے لحاظ سے اس ادارہ کے کمال ونقصان کا فیصلہ کیا جائے۔

نصب العین کی اہمیت...... نصب العین کے مسئلہ کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ مثلاً گورنمنٹ برطانیہ نے سرکاری تعلیم گاہوں کا نصب العین ملازمت قرار دیا تا کہ اس تعلیم کے ذریعے سے کلرک اور محرر یا دفتری کارکن تیار کر لئے جائیں۔ یقیناً حکومت برطانیہ کا نصب العین انسانیت کی خدمت یا دیانتداری اور حق وصداقت کی خدمات نہ تھا، اس لئے ہم سرکاری اداروں کو اسی کے نصب العین کے ماتحت پرکھ سکتے ہیں۔

ہمیں سرکاری اداروں سے نکلے ہوئے لوگوں کو اس معیار پر جانچنا ہی نہ چاہئے کہ وہ کس قدر سچے اور کتنے بہی خواہ ملک وقوم ہیں۔ بس خود اپنے مقرر کردہ معیار سے گورنمنٹ اور اس کے ادارے کامیاب رہے۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم اپنے معیار سے ان کو جانچیں۔ ہاں ہمیں اعتراض کا حق اس سرکاری نصب العین پر ہو سکتا ہے نہ کہ اس کے پروردہ افراد پر کہ وہ تو اپنے معیار پر کامیاب ہیں۔

اس کے بالمقابل قومی اداروں اور دینی درس گاہوں کا نصب العین اس دینی تعلیم سے نہ روٹی ہے نہ کرسی بلکہ تہذیب نفس ہے کہ اس تعلیم سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو انسانیت کے سچے خدمت گزار ہوں، اور عالم بشریت کی بہی خواہی میں اپنی جان، مال اور آبرو کی کوئی پرواہ نہ کریں۔ ظاہر ہے کہ ہمیں ان افراد کی کامیابی اور ناکامی اور ان اداروں کے کمال ونقصان کو اسی معیار اور نصب العین سے جانچنا ہوگا جس کو لے کر یہ ادارے کھڑے ہوئے ہیں۔ بلاشبہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہیں۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم ان کو سرکاری معیار سے جانچیں اور پھر ان کی تنقیص کریں۔

قومی اور سرکاری اداروں کا نقطۂ اشتراک...... قومی اداروں کے فضلاء اور حکومت کے تعلیمی اداروں یا عام

سرکاری محکموں میں آئندہ باہمی ربط کیا رہے گا؟

اس سلسلہ میں مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دی جائے کہ آج ایک تیز رفتار انقلابی ہوا چل رہی ہے اور اقتدار بدل رہا ہے۔ موجودہ حکومت قومی حکومت سے تشکیل پا رہی ہے۔ سو اس کے تعلیمی اداروں کا نصب العین اگر وہی ہوگا جو بدیسی حکومت کا تھا کہ چند کلرک، چند سرکاری مشین کے کل پرزے حکومت کی دفتری مشین کے لئے تیار ہو جائیں تو مدارس کے طلبہ کا جو رویہ سابق حکومت کے ساتھ رہا ہے وہی اس حکومت کے ساتھ بھی رہے گا۔ لیکن اگر موجودہ گورنمنٹ کا نصب العین تعلیمی دفتری کارکن تیار کرنا نہیں بلکہ ایسے ذہن و طبیعت کے لوگ تیار کرنا ہے جو حقیقی انسانیت سے آراستہ ہو کر انسانیت کے سچے خادم ہوں، آشتی و مسالمت اور پریم و صلح کے خوگرہ (عادی) کر ملک کو آسمان ترقی پر پہنچا دینے کے جذبات رکھیں، تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ نصب العین ان قومی مدارس کے قریب آ جائے گا اور یہ ایک نقطہ منظم کا پیدا ہو جائے گا۔ تعاون کے لئے قرب ضروری ہے اور قرب اس اشتراکی (مشترک) نقطہ پر ممکن ہوگا۔ اس لئے میرے خیال میں دینی عربی مدارس کے رویہ میں تبدیلی پیدا کرنے سے زیادہ ضروری اور اہم یہ ہے کہ سرکاری اداروں میں نصب العین کو تبدیل کیا جائے۔ یہی ایک مشترک نقطہ ہے جو سرکاریت اور قومیت کو ایک دوسرے کے قریب لا سکتا ہے۔ اس صورت میں قومی مدارس کو اس کی ضرورت نہ ہوگی کہ وہ کسی سرکاری ڈگری یا امداد کی طرف جھکیں بلکہ شاید خود گورنمنٹ کو اس کی حاجت ہوگی کہ وہ وہاں کے فضلاء کی خریدار بن جائے اور ان کی تلاش میں رہے۔ سو اس صورت میں دینی مدارس ہر اخلاقی امداد کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ مگر اپنی آزادی کو برقرار رکھ کر وہ جیسے ہمیشہ سے آزاد رہے ہیں اب بھی ان کی تعلیم اور نظام تعلیم دونوں آزاد رہیں گے۔ یہ ان کی آزادی کا ہی کرشمہ ہے کہ جب حضرت مولانا آزاد نے آزادی سے انہیں اور ان کی خدمات کو سراہا ہے۔ اگر وہ آزاد نہ ہوتے تو قابل ستائش بھی نہ ہوتے اور جو آزاد نہیں انہیں یہ مقام حاصل بھی نہیں۔

نصاب تعلیم میں تبدیلی کا قضیہ...... اب رہا مدارس عربیہ کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کا قضیہ سو مجھے اس اصول سے انکار نہیں اور نہ کسی کو ہو سکتا ہے۔ کہ جن تعلیمات کا وحی الٰہی سے تعلق ہے اس کی تبدیلی پر نہ ہم قادر ہیں نہ ہمیں حق ہے۔ باقی جو فنون یا کتابیں قرآن کے خادم کی حیثیت سے زیر تعلیم آتی ہیں وہ زمانہ اور احوال کے لحاظ سے بدل سکتی ہیں۔

قرآن ہر زمانے میں ایک رہا لیکن اس کی تفہیمات کا انداز بدلتا رہا۔ جس دور میں مثلاً فلسفہ کا زور ہوا تو قرآن کو فلسفیانہ رنگ میں سمجھایا گیا، اس دور میں تصوف کا زور رہا تو قرآن کو صوفیانہ رنگ میں سمجھایا گیا، آج سائنس کا دور ہے تو وہ سائنسی رنگ میں تجلی کرے گا۔ اس ساری حقیقت کو بطور خلاصہ ان الفاظ میں لا سکتا ہوں کہ

مسائل پرانے ہوں اور دلائل نئے ہوں...... ہم ان ہی ہیئت فطری مسائل کو جدید آلات سے مسلح کر کے میدان میں لائیں گے۔ پس تبدیلیٔ نصاب کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے مخاطبوں کی زبان میں اپنے گھر کی چیز ان کے سامنے پیش کر دیں۔ نہ وحی کی کتابیں اور مسائل بدلے جا سکتے ہیں اور نہ ہمیں اس کا حق ہے۔ اس لئے وقت

کے تقاضوں کے ماتحت یہ تعبیراتی فنون اور کتب بدلتی سدلتی رہی ہیں اور برابر بدلتی رہیں گی۔ خود درس نظامی کی تدوین ہی تبدیلی نصاب کی سب سے بڑی دلیل ہے، کیوں کہ بہر حال یہ نصاب قرن اول کا نہیں ہے۔ وقت کے تقاضوں سے بنایا گیا ہے۔ جب اس کے آغاز کے وقت تغیر وتبدل ممکن تھا تو آج بھی ممکن ہے مگر ان ہی حدود کے ماتحت جو عرض کی گئیں۔ نصاب کا مسئلہ بہر حال علماء میں زیر غور ہے اور وقتاً فوقتاً اس نصاب میں بہت سے تغیرات ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ میں نے خود ۱۳۵۸ھ میں سفر افغانستان سے واپسی پر دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں اس سلسلہ میں ایک مفصل رپورٹ پیش کی تھی جس میں تبدیلی نصاب کے متعلق اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ ظاہر کئے تھے۔

بہر حال نصاب تعلیم میں تغیر ہوتا رہا ہے اور ہوگا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ذمہ دار علماء اسے از خود ہی کریں۔ جیسا کہ اب تک کرتے چلے آئے ہیں ہاں جو کچھ بھی ہو وہ اپنی بصیرت سے تغیر کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ تمام سرکاری اداروں کے لئے قابل تقلید ہونا چاہئے، جس سے وہ قومی مدارس کے قریب لائے جاسکتے ہیں۔

نصاب کا تغیر وتبدل ہر دور میں ہوتا آیا ہے جو اس امر کی مستقل دلیل ہے علماء میں فکر ونظر کو ہر زمانہ میں اہمیت حاصل رہی ہے اور ہر دور میں مفکر وبصر علماء پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جنہوں نے وقت کے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ قرون اولی، قرون متوسط، اور قرون اخیرہ میں اہل فکر ونظر کی امت میں کمی نہیں رہی اور نہ ہو سکتی ہے کیوں کہ خود صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ”مَثَلُ أُمَّتِیْ کَمَثَلِ الْمَطَرِ لَایُدْرٰی أَوَّلُهٗ خَیْرٌ أَمْ اٰخِرُهٗ.“ ① جس سے واضح ہے کہ اہل نظر کسی خاص قرن کے لئے مخصوص نہیں بلکہ خلف میں سلف کے ہم رنگ ارباب نظر پیدا ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح صاحب شریعت (فداہ ابی وامی) نے ارشاد فرمایا: ”یَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ کُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ یَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِیْفَ الْغَالِیْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِیْنَ وَتَاوِیْلَ الْجَاهِلِیْنَ.“ ② اسی طرح ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ”إِنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَهَا دِیْنَهَا.“ ③ اور دین کا حاصل جبکہ ایمان عقائد، اسلام واحکام، تزکیہ اخلاق اور اعلائے کلمۃ اللہ تو ناممکن ہے یہ مجدد اس سے ناآشنا ہوں یا ان کے زیر تجدید تربیت یافتہ مفکر نہ بنیں، اس لئے بہر حال فکر ونظر کا دروازہ ہر آن کھلا رہے گا۔ مگر ہاں اپنی ہی بساط اور اپنی ہی استعداد کے مطابق ہم حدود سے گزرے ہوئے فکر کو فکر ونظر نہیں بلکہ تو ہم کہیں گے۔

بہر نوع بنیادی چیز نصب العین ہے۔ اس سے ادارے بنتے ہیں اور اس کے بگڑ جانے سے بگڑ جاتے ہیں۔ اس نصب العین کے ماتحت پھر وہ بنیادی چیزیں ہیں جن کی تفاصیل پہلے عرض کی جاچکی ہے۔

---

① مسند ابی یعلی الموصلی، ثابت البنانی عن انسؓ، ج:۷، ص:۹۵، رقم:۳۴۸۱۔ بزار کے طریق سے یہ روایت حسن ہے۔ دیکھئے: مجمع الزوائد، باب ماجاء فی فضل الامة ج:۳ ص:۳۵۶۔

② السنن الکبری للبیهقی، ج:۱۰ ص:۲۰۹۔ (جماع ابواب من تجوز شهادته ومن لاتجوز..)

③ السنن لابی داؤد، کتاب الملاحم، باب مایذکر فی قرن المئة، ج:۱۱، ص:۳۶۲۔

میں اپنے ذہن میں اس سلسلہ میں مزید تفصیلات پاتا ہوں، لیکن ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں کیوں کہ جناب صدر محترم ان تفاصیل پر بحث کرنے کے لئے خود ہی ایک کمیٹی کا تقرر منظور فرما رہے ہیں۔ یہ چیزیں اس میں آ سکتی ہیں۔اس لئے اس اجمال پر قناعت کیا جانا کافی خیال کرتا ہوں۔

تاثراتِ تقریر...... حضرت حکیم اسلام رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تقریر مسئلہ تعلیم کے ہر پہلو پر اصولی حیثیت سے اس درجہ جامع تھی کہ بعد کے آنے والے مقررین کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہ رہا کہ وہ تعلیم کے بنیادی نقطوں میں حضرت موصوف کی تقریر کا حوالہ دے کر پرزور تائید کریں۔ چناں چہ حضرت موصوف کی تقریر کے بعد مولانا محمد رضا صاحب فرنگی محل نے علمائے فرنگی محل لکھنؤ کی طرف سے تقریر فرمائی، جن کی اصل تقریر کا ماحصل مناظرانہ انداز میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر پر غم و غصہ کے اظہار کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جب تعلیمی نقطہ کی بات آئی تو انہوں نے بالآخر حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کی پرزور تائید کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبد الحلیم صاحب عربی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی والے نے بھی مناظرانہ انداز میں تقریر فرماتے ہوئے مولانا آزاد کی تقریر پر نکتہ چینی کی اور آخر میں حضرت مہتمم کی تقریر کا بنیادی نقطہ تعین نصب العین لے کر اس کی تائید و تصویب نہایت پرزور الفاظ میں کی۔

آخر میں علامہ سید سلمان صاحب صدر قاضی و ڈائریکٹر علوم مشرقیہ ریاست بھوپال تقریر کے لئے کھڑے ہوئے اور موصوف نے ایک نہایت مفصل و مدلل تقریر فرماتے ہوئے حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کا یہ جملہ دہراتے ہوئے کہ "مسائل پرانے اور دلائل نئے ہوں" فرمایا یہ کہ اس سے زیادہ جامع جملہ کوئی نہیں ہے جو تغیر نصاب پر جامع روشنی ڈال سکے۔

علامہ موصوف کی تقریر کی بعد مولانا عبدالمجید صاحب حریری نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ تقریر فرماتے ہوئے نہایت پرشوکت الفاظ میں حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کی تائید کی۔

سب سے آخر میں مولانا آزاد صاحب نے اختتامی تقریر فرمائی اور حضرت مہتمم صاحب کی تقریر سے اس حد تک اپنے تاثر کا اظہار فرمایا کہ گویا اپنی اختتامی تقریر صدارت کا متن حضرت مہتمم صاحب کی تقریر کو قرار دے کر اس کے مختلف جملوں کو بار بار اپنے الفاظ میں دہرانا شروع فرمایا جیسا کہ ابھی مولانا محمد طیب صاحب نے فرمایا اور یہ مولانا محمد طیب صاحب نے بالکل بجا درست فرمایا۔

مولانا آزاد صاحب نے فرمایا کہ محمد طیب صاحب کی تقریر کا یہ جملہ کہ "مسائل قدیم ہوں اور دلائل جدید ہوں، ہمارے ان تمام تعلیمی مقاصد کا آئینہ دار اور لب لباب ہے جو ہمارے پیش نظر ہیں۔ یہ اس قدر جامع تعبیر ہے کہ آپ کتنی شرحیں کرتے چلے جائیں، تفاصیل کے دفتر تیار کر دیں لیکن کوئی مقصد بھی اس جملہ سے باہر نہ ہوگا۔

مولانا آزاد نے فرمایا کہ ہاں! مولانا محمد طیب صاحب نے بالکل درست اور نہایت ہی بجا فرمایا کہ مدارس عربیہ کو اپنے نصاب تعلیم اور نصب العین میں اصلاح کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ سرکاری تعلیمی اداروں کو

ضرورت ہے۔ یہ اگر اپنا نصب العین اور طریقۂ تعلیم وتربیت درست کرلیں تو وہ قومی مدارس کے قریب آجائیں گے۔ اس کے بعد مولانا آزاد نے فرمایا کہ مولانا محمد طیب صاحب نے یہ بالکل صحیح فرمایا کہ ان قومی اور دینی مدارس کا تفوق ان کی آزادی اور آزاد روش پر منحصر ہے۔ بالکل صحیح ہے کہ ان کا آزاد رہنا ہی ان کا اونچا اور بلند مقام ہے اور انہیں اسی مقام پر رہنا چاہئے۔

پھر مولانا آزاد نے فرمایا کہ مولانا محمد طیب صاحب نے صحیح فرمایا کہ تعلیم کی غرض وغایت اگر محض کلرک اور محرر یا دفتری لوگ پیدا کرنا ہے تو اس کم مرتبہ غرض کوئی دوسری نہیں ہوسکتی اور یہ ملک کی کوئی صحیح خدمت نہ ہوگی۔

بہر حال حضرت مولانا آزاد صاحب نے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے جملہ جملہ کو لے کر اس کی شرح نہایت وقیع اور شاندار انداز سے اپنے الفاظ میں فرمائی جس سے مولانا کے تاثرات قلبی کا اظہار ہوتا رہا اور جس کا تمام حاضرین نے نہایت اچھا اثر قبول کیا۔

ہم جملہ وابستگان دارالعلوم کے لئے بالخصوص انتہائی مسرت وخوشی کا مقام ہے کہ اس پوری تعلیمی کانفرنس کا ہیرو دارالعلوم دیوبند رہا اور دارالعلوم کے حلقہ میں پوری کانفرنس کے ہیرو حضرت مہتمم صاحب رہے۔ جن کی تقریر کے ہر ہر جملہ بلکہ ایک ایک لفظ کو سنجیدہ اور باہوش علماء کرام نے دہرایا۔ پرزور تائیدیں فرمائیں اور تقاریر میں اس کی تشریح وتفصیل کرتے رہے اور ایک مرکزی تعلیمی ادارے کی تعلیمی لائنوں میں جو حیثیت ہونی چاہئے تھی وہی رہی۔

"فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالْمِنَّةُ"

خاتمۂ تقریر پر مولانا آزاد صاحب نے اعلان فرمایا کہ میں ایک عملی تجویز آپ کے سامنے رکھتا ہوں وہ یہ کہ ۱۵ تا ۲۱ ارکان پر مشتمل ایک تعلیمی کمیٹی بنا کر جلد سے جلد نصاب تعلیم کی اصلاح وترمیم کا عملی کام شروع کردیا جائے۔ یہ تجویز بالاتفاق منظور ہوئی اور نہایت خیر وخوبی کے ساتھ یہ تعلیمی کانفرنس اختتام پذیر ہوئی۔

احقر: خلیق احمد صدیقی

مدیر ماہنامہ دارالعلوم (دیوبند)

تصویر سازی کی مذہبی وتمدنی حیثیت

ہندوستان کے صنم پرست اور خدا کے فرضی مظاہر سے رشتہ نیاز جوڑنے والے ۳۳ کروڑ، دیوتاؤں کی رنگین تصویروں کے غلام بنے، مغرب کے تثلیث پرست کنواری کے بت اور ابن اللہ کے مجسمے کے سامنے اوندھے ہوئے، ایران کے مجوسی یزدان واہرمن کے پیکروں کے سامنے رغبت ورہبت کا اظہار کرنے لگے۔ آتش پرستوں نے آتشیں لپٹوں کے سامنے سرنیاز خم کیا۔ غرض اس راہ محسوس پسندی نے صورتوں میں الجھا کر سب ہی کو حقیقت سے بیگانہ بنادیا۔ (از: حکیم الاسلام نور اللہ مرقدہٗ)

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَـہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. اَمَّا بَعْدُ!

مہلک دستکاری..... بزرگانِ محترم! آج تصویر اور صورت سازی اپنی غیر معمولی شیوع کی بدولت موجودہ تمدن کا ایسا جزء لاینفک بنی ہوئی ہے کہ اس کا کوئی شعبہ اپنی رونق کو تصویر کے بغیر قائم نہیں رکھ سکتا۔ مکان، دوکان، خطوط، کتب، رسائل، سکہ، تمغہ، رقعہ، دستاویز، تلوار، ہتھیار، چھری، چمچہ، لیول مارکہ کوئی چیز نہ تصویر سے خالی اور نہ تصویر بغیر اس میں کوئی کشش ہی محسوس کی جاتی ہے۔ پس جاذبیت کی ساری ہی طاقتیں آج تصویر کے ایک رخ میں پنہاں ہو چکی ہیں اور تقریباً دنیا کی ہر قوم بلا استثناء اپنی پوری ہی گرویدگی وشغف کے ساتھ تصویر کی طرف پروانہ وار دوڑتی چلی جارہی ہے۔

اقوامِ متحدہ (اقوامِ عالم) کے اس اجماع میں جو تصویر کے ساتھ فدائیت پر منعقد ہو چکا ہے، ہم تصویر کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بلاشبہ اس اجماع کے خلاف ہم ایک ایسے نظریہ کے ماتحت تصویر کو دیکھ رہے ہیں کہ اس کے ہوتے ہوئے تصویر نہ صرف بدترین منکر ہی دکھائی دیتی ہے جسے معروف کی لائن سے کوئی مناسبت نہیں۔ بلکہ ایسی مہلک اور مخرب دستکاری نظر آتی ہے جسے ایک مسلم کی مسلمانہ ذہنیت تبدیل کر دینے میں کافی مداخلت حاصل ہے۔ صورت محض وسیلۂ تعارف ہے..... یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ہر صورت اپنی حقیقت کا ظہور اور اس کے لئے تعارف کا ایک ذریعہ ہے۔ دنیائے صور واشکال میں کوئی حقیقت بغیر صورت کے شناسا نہیں ہو سکتی۔ پس

صورت ایک درمیانی خادم ہے جس کا منتہی غرض صرف حقیقت تک پہنچا دینا ہے اور بس۔

زید اور عمر کی صورتیں، حیوانات اور نباتات کی ہئیتیں (شکلیں) صرف اس قدر اہمیت رکھتی ہیں کہ دنیا کو اپنے باطنی حقائق سے شناسا بنادیں۔ جس کے صاف معنی یہ نکل آتے ہیں کہ کوئی صورت بلا حقیقت یا بلا ترجمانی ہی نہیں کہ کہ صورت محض نہ بذاتہ مقصود ہے اور نہ مقصودیت کی شان رکھتی ہے۔

اس اصول پر یہ اندازہ لگا لینا مشکل نہیں کہ مقصود واقعی صرف حقیقت ہے صورت نہیں۔ صورت وسائل تعارف میں سے ایک وسیلہ ہے۔ اگر بالفرض ہم بلا صورت ہی کسی حقیقت پہچاننے پر قادر ہو جائیں تو شاید پھر صورت کی طرف التفات بھی ہم پر شاق گزرنے لگے اور ہم اسے اضاعت وقت سمجھنے لگیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ صورتوں کی طرف توجہ کرنا فی الواقع حقیقت پر براہ راست قدرت نہ پاسکنے کا ثمرہ اور ہمارے قصور ادراک کا نتیجہ ہے۔ مثلاً ہم تاج محل آگرہ کا اصلی نقشہ آنکھوں میں رکھنے کے لئے اس کی تصویر سامنے رکھ لیتے ہیں۔ لیکن اگر کسی ذریعے سے ہم خود تاج محل کو یہاں اٹھا کر لا سکتے ہوں یا ہمہ اوقات ہر جگہ سے اسے دیکھتے رہنے کی قدرت رکھتے تو شاید ہمارا دھیان اس کاغذی تاج محل کی طرف کبھی بھی نہ منعطف ہوتا۔ اس لئے یہ نتیجہ صاف ہے کہ صورت وہیئت سامنے رکھنا اصل کی یاد آوری کا ایک ذریعہ اور ساتھ یہ صورت بین کے قصور ادرک کا ثمرہ ہے کہ وہ براہ راست اصل حقیقت کو نہیں دیکھ سکتا۔ پس جب کہ ایک ایسی صورت بھی جو کسی واقعی حقیقت کا عنوان یا ترجمان بھی بنی ہوئی ہے۔ واسطہ محض سے زائد کوئی درجہ نہیں رکھتی تو وہ تصویر جو صورت ہی صورت کی ترجمانی کررہی ہو اور حقیقت سے اسے کوئی بھی واسطہ نہ ہو یا تصویر ہی فرضی ہو جس کے نیچے کسی واقعی صورت کا بھی وجود نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ بے اصل محض، بے وزن محض اور بے التفات محض ہونی چاہئے، کہ وہ حقیقت کی بجائے باطل اور بے بنیاد شے یا لاشے محض کی ترجمانی کررہی ہے۔ پھر بھی اگر ایسی بے بنیاد اور باطل صورتوں کو مرکز توجہ بنالیا جائے تو یہ مقصود سے اعراض اور وسائل میں شغف کے سوا کون سے لفظ سے تعبیر کیا جائے گا اور کون نہیں جانتا کہ مقصود کے ہوتے ہوئے وسائل محض میں انہماک و شغف رکھنا یا بالفاظ دیگر اپنے قصور ادراک اور عجز تصور کو باوجود ازالہ کی قدرت کے پالتے رہنا، دانائی کی بجائے انتہائی سادہ لوحی بلکہ اس سے بھی آگے ہی کا درجہ ہے۔

شرک فی المقصود...... بس اسی قلب موضوع سے کہ وسائل مقصود کا درجہ حاصل کرلیں اور خود مقصود غیر اہم ہو جائے، شرک فی المقصود کی بنیاد پڑتی ہے۔ جس کی ذمہ داری تنہا تصویر پر عائد ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ جب قلب جو باطن اور غیبی امور میں منہمک ہو کر ذوقی مشاہدوں کا شائق بنایا گیا ہو۔ تصویر آرائی کے ذریعے گرفتار صورت بنادیا جائے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے اور کیا نکل سکتا ہے کہ وہ اپنی جمعیت کھو کر کچھ باطن کا ہو رہے اور کچھ ظاہر کا ہو رہے۔ کچھ حقیقت کی طرف مائل ہو اور کچھ صورت کی طرف۔ گویا اپنی اصل جبلت سے تو غیبیات اور حقائق کی طرف جھکے اور ان غیر جبلی تو اسر سے ظاہری نمود اور صورت و اشکال کی طرف مائل ہو اور اس طرح توحید

مطلب کے بجائے تعدد مطالب کا مجرم ہو جائے جو شرک کی حقیقت ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ مقصور کے مقصود باقی رہتے ہوئے شرک فی المقصود رہے نہ بچنا، عقل کی گمراہی اور فہم سلیم کا خون اپنی گردن پر لینا ہے۔ ہاں جس درجہ کا مقصود ہوگا، اسی درجہ غیر مقصود کا اس میں ساجھا قائم کرنا خلاف فطرت اور جرم ہوگا۔

تصویر پرستی ...... یہاں پہنچ کر دنیا کی قوموں کے دو راستے ہو گئے۔ ایک طبقہ نے جو تلاش معبود میں سرگرداں اور تعارف غیب کا دلدادہ تھا، اپنی خوگر محسوس ذہنیت سے مغلوب ہو کر تصویر کو خدائے برتر و توانا کے تعارف کا ذریعہ قرار دیا اور معرفت رب کے لئے ابتداءً تصویر کو مرکز تصور بنایا۔ لیکن عادت جاریہ کے موافق انسان کی خوگری احساس اور مغلوبیت عقل و معرفت نے پہلے تصویر کو اس کا ساجھی بنایا اور پھر رفتہ رفتہ تصویر میں مقصودیت اور معبودیت کی شان پیدا کر دی۔ وہ تمام افعال عبودیت، رکوع و سجود، نذر و نیاز، بھینٹ اور قربانی وغیرہ جو اس بے چون و بے چگون ذات کے لئے ہوتے۔ اب اس کی نام زد صورتوں اور فرضی مجسموں کے لئے ہونے لگے۔ کل تک جو حظ و کیف اس کے نام اور اسی کے لطیف دھیان سے روح میں پیدا کیا جاتا تھا۔ آج اس کی فرضی صورتوں سے حاصل کیا جانے لگا۔

دنیا کی سب سے پہلی بت پرست قوم (امت نوح علیہ السلام) جس نے پانچ مردانِ حق (ود، سواع، یغوث، یعوق، نسر) کی تصویروں کو ذریعہ خدا شناسی بنا کر اپنے معبدوں میں نصب کیا۔ آخر کار انہی مجسموں نے اس خوگر محسوس قوم کی ذہنیت پر فتح حاصل کر لی اور ایک لطیف و خبیر خدا کی جگہ پانچ کثیف الاجسام معبود جم گئے اور ایسے جمے کہ پھر مستقلاً انہی سے استمداد (مدد طلب) کی جانے لگی۔ وہی اولاد دہندہ شمار ہوئے۔ وہی ابر و باراں کے مالک ٹھہر گئے اور انہی کی سنگین صورتوں سے ہر ایک مراد مانگی جانے لگی۔ جس کا ثمرہ یہ نکلا کہ قوم حقیقت الحقائق تک تو کیا پہنچتی، عام حقیقتوں سے بھی محروم ہو کر محض صورت پرستی کے جال میں پھنس گئی۔ اور اس کی ذہنیت غائر ہونے کی بجائے اس درجہ سطحی ہو کر رہ گئی کہ نوح علیہ السلام کے ساڑھے نو سو سالہ وعظ و پند (وعظ و نصیحت) سے سوائے چند روزہ ظاہر داری کے، کوئی ایک عبرت اور کوئی ایک انجام بینی بھی ان کے دل و دماغ تک نہ پہنچ سکی۔ پھر نہ صرف قوم نوح بلکہ ہر تصویر کی پجاری قوم جو قوم نوح کے نقش قدم پر گامزن ہوئی، اسی سطح پرستی کا شکار ہوئی۔

ہندوستان کے صنم پرست اور خدا کے فرضی مظاہر سے رشتۂ نیاز جوڑنے والے تینتیس (۳۳) کروڑ دیوتاؤں کی رنگین تصویروں کے غلام بنے۔ مغرب کے تثلیث پرست کنواریؑ کے بت اور ابن اللہ کے مجسمے کے سامنے اوندھے ہوئے۔ ایران کے مجوسی یزداں و اہرمن کے پیکروں کے سامنے رغبت و رہبت کا اظہار کرنے لگے۔ آتش پرستوں نے آتشیں لپٹوں کے سامنے سر نیاز خم کیا۔ غرض اس راہ محسوس پسندی نے صورتوں میں الجھا کر سب ہی کو حقیقت سے بیگانہ بنا دیا اور خالص شرک کے راستہ پر لا کھڑا کیا۔ جس سے یہ اشرف المخلوقات اپنی توحید مطلب کو یکسر فنا کر بیٹھا اور قلبی پراگندگی و تشتت کے مہلک جال میں پھنس کر اپنی طمانیت و بشاشت خاک میں ملا دی۔

تصویر بازی ...... دوسری قوم کو اپنی تصویر بازی اور صورت پسندی کے ذریعے خدا کی تلاش نہ تھی اور نہ انہوں نے

تصاویر سے مظاہرِ غیب کی جستجو شروع کی۔ تاہم تمدن ومعاشرت کے سلسلہ میں ساری کائنات کو اس کی تصاویر کے ذریعہ پہنچاننے کے جذبہ نے ان کو بھی اصل سے ہٹا کر نقل پسندی، اور پھر خالص صورت پرستی یا حقیقت سے بے تعلقی میں الجھا دیا۔ یہ قوم پہلے سے بہت ادنٰی اور ذلیل مرتبہ پر آ کر رکی۔ پہلی قوم نے اگر صورتوں اور مجسموں کو قبلۂ استقبال بنایا تو خداشناسی کے لئے گویا حقیقت رسی کم از کم جذبات میں تو مرکوز تھی۔ گویا تلاش حقیقت ہی کے سلسلہ میں صورتوں کے ساتھ انہیں شغف پیدا ہوا۔ لیکن دوسری قوم کی تصویر بازیوں میں ابتداء ہی سے حقیقت بینی کا کوئی جذبہ بھی دستیاب نہیں۔ اس کے تصویری جذبات صرف تزئین وآرائش یا نمائش وزیبائش ہی تک محدود ہیں۔ جس کا تعلق صورت درصورت ہی سے ہے اور بس۔

یعنی اس قوم کے یہاں تصویروں سے کسی مستور اور غیبی حقیقت کا ظہور تو کیا مطلوب ہوتا اس مشاہد کائنات کی بھی صرف صورتوں ہی سے شناسا ہونا منتہائے مقصود ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کائنات کی حقیقت وصورت میں صورت کا درجہ خود فانی اور عارضی تھا اور جب کہ فانی کا بھی، فانی درجہ، یعنی تصویر کو منتہائے مقصود بنا دیا جائے تو ایسی قوم صرف واقعیت ہی سے دور نہیں ہوگی۔ بلکہ باطل سے باطل اور بے حقیقت بنیاد پر کھڑی ہو کر اپنے وزن اور طاقت اور جڑوں کو اپنے ہی ہاتھوں سے کمزور کر دینے کی مرتکب ٹھہرے گی۔

یورپ کی تمدن پرست قومیں اسی باطل سازی اور تصویر بازی کی لعنت میں سب سے زیادہ گرفتار ہوئیں۔ ان اقوام کو اس بنیاد وصورت پرستی اور نمائش پسندی نے اس درجہ سطحی اور بے بنیاد قوم بنایا، کہ آج وہ کسی حقیقت تک تو کیا پہنچتیں اپنی مصنوعی صورتوں کے سامنے قدرتی صورت کے ساتھ پورا شغف قائم نہ رکھ سکیں۔ کہ ان میں کچھ نہ کچھ تو واقعیت کی شان ضرور تھی۔ ان کی ذہنیت اور جذبات کا بہت بڑا حصہ اپنی ہی خود ساختہ صورتوں کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ تصویروں کی ساخت وپرداخت اور خریداری پر لاکھوں روپیہ صرف کرنا تصویریں سامنے رکھ کر عالم خیال میں ان سے باتیں کرنا، عشق ومحبت کے جذبات کاغذ کے رنگین عکوس پر نچھاور کرنا ان کا شعار ہو گیا۔

سطح پرستی کی انتہاء...... آج عریاں تصویروں کو سامنے رکھ کر شہوانی جذبات اس طرح مشتعل کئے جاتے ہیں۔ جس طرح کسی اصل صورت کے سامنے ہو سکتے ہیں۔ بڑی بڑی شخصیتوں کے مجسمے صرف بازاروں ہی کے چوک میں نصب نہیں بلکہ دلوں کی گہرائیوں میں اس درجہ گھس چکے ہیں کہ ان کی کسی ادنٰی توہین پر اسی طرح ازالہ حیثیت کے مقدمات چلائے جاتے ہیں، جس طرح اصل شخصیت کے بارہ میں مقدمہ چل سکتا ہے۔

آخر لارنس کے بت کا مقدمہ دنیا کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا ہے۔ وکٹوریہ کے بت کی توہین پر تحقیقاتی پولیس کا مقرر کیا جانا اس دورِ صورت پرستی کی تاریخ میں محفوظ ہے۔ حالاں کہ اصل کا آج کوئی پتہ نشان بھی نہیں، یہ تمام معاملات صرف مصنوعی پیکروں کے ساتھ اسی شدومد سے کئے جا رہے ہیں، جس طرح قدرتی مجسموں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بعض نایاب اور پرانی تصویری شاہکاروں کی قیمتیں اسی مقدار میں اٹھ جاتی ہیں کہ شاید اس

مصوروں کو اگر نیلام کیا جاتا تو اس کے عشرِ عشیر بھی دام نہ اٹھ سکتے۔ حتیٰ کہ ان تصویری جذبات نے فلم سازی کا ایک مستقل فن ہی پیدا کر دیا جس کے لئے خزانوں کا ایک مستقل حصہ وقف ہے۔ ایک ایک فلم پر ہزار ہا روپیہ کی لاگت ہے، فلم سازوں کی بیش قرار تنخواہیں اور سینما کی قیمتی عمارتیں، باب تمدن کا ایک نہایت ہی شاندار اور خوشگوار اضافہ سمجھی گئیں۔ آدمیوں سے وہ اثر نہیں لیا جاتا جو سینما کی متحرک تصویروں سے لیا جا رہا ہے۔

نمائش وسطح پرستی کی یہ وہ انتہائی حد ہے کہ آج کا انسان گویا خود بھی اپنے نزدیک اس لئے باطل محض ہو گیا کہ اس کے شغل کے لئے خود اس کی قدرتی شکل بھی کافی نہ رہی، جب تک کہ اس صورت کی بھی خود ساختہ صورت اس کے سامنے موجود نہ ہو۔ غرض حب وبغض، نفرت ورغبت، عشق ومحبت اور خرید وفروخت کے تمام وہ معاملات جو ایک سطح پسند انسان، انسان کی اصلی اور قدرتی صورت سے قائم کرتا، آج اس سطح کی بھی نقلی اور فرضی سطح وصورت کے ساتھ جوڑتا جا رہا ہے، کیا یہ صورت پسندی کی انتہا نہیں ہے؟ اور جب ایسا ہے تو کیا یہ حقیقت سے بے خبری اور بیگانگی کی بھی انتہا نہیں ہے؟ اور پھر ایسی قوم کے حق میں جو حقائق سے بیگانہ محض بن کر محض صورتوں اور صورتوں کی بھی نقالی میں الجھ کر رہ جائے، عقل ودانش کیا فیصلہ کرے گی؟

صورت پسندی کی آخری منزل...... بہرحال قوموں کے ان دونوں طبقات میں تصویر نے اپنی طبعی رفتار کے ماتحت اصل کو پردۂ نسیان میں چھپا کر زبردستی اس کی جگہ سنبھال لی۔ اور اس طرح دونوں جگہ اس توحید مطلب کی جڑیں اکھاڑ کر شرک کی بنیادوں کو مستحکم کر دیا۔ متدین اقوام میں شرک عبادت پیدا کر دیا اور متمدن اقوام میں شرک عادت۔ پھر یہ شرک بھی اس تصویر پسندی کا درجہ اول ہے۔ صورت پسندی کی آخری منزل یہ ہے کہ بلا شرکت غیرے صورتیں ہی حقائق کی جگہ سنبھال کر بالاستقلال خود مقصودیت کی شان پیدا کر لیں۔ چناں چہ مذہبی اقوام کے سامنے اصنام ہی مستقل حاجت روا بن کر قبلۂ قلوب ہو گئے، اور تمدنی قوموں کے سامنے فوٹو اور تصویریں ہی مستقل محبوب ومطلوب بن گئے۔

آج کوئی ڈیزائن اور نمونہ مقبول نہیں جس میں تصویر کو دخل نہ ہو، کوئی رسالہ جاذب نظر نہیں جب تک تصاویر اور خصوصاً عریاں تصاویر سے مزین نہ ہو، گویا ادبی رسالوں کی جان اب بجائے علومضامین کے، رنگین تصاویر قرار پا گئی ہے۔ علم میں طاقت نہیں کہ لوگوں کی جیبوں سے پیسے کھسیٹ سکے۔ مگر تصویر اپنی خالص مجوبیت کی بناء پر یہ جذب وکشش ضرور رکھتی ہے کہ تجارتوں کو فروغ دے سکے، دوکانوں کی رونق بڑھائے اور لوگوں کا وقت اپنے اوراق کے لئے خرید سکے۔

خزائن مخفیہ سے محرومی...... خلاصہ یہ نکلا کہ تصویر بالخاصہ حق پسندی سے ہٹا کر بسہولت باطل پسندی کی ذہنیت پر لے آتی ہے، واقعی جذبات کو بے ثمرہ بناتے ہوئے انجام کار عاقبت کی بہرہ مندیوں کو ملیا میٹ کر دیتی ہے، ورنہ کہاں تو انسان غیب سے نکل کر عالم شہود میں اس لئے آیا تھا کہ ہر حسی شاہد سے کنارہ کش ہو کر غیب کی قلبی مشاہدوں

میں مصروف ہو، ہر صورت سے اعراض کر کے حقیقت کی طرف جائے، اور ہر باطل سے نگاہ ہٹا کر حق کی طرف دوڑے تا کہ اس کا لگاؤ فانی کے بجائے باقی سے ہو اور اس طرح وہ خود بھی باقی بن جائے اور اسے اپنی اصل سے وابستگی رہے۔ اور کہاں ان تصاویر کی بدولت اس کج راہی میں گرفتار ہوا کہ غیب کے ہر مرتبہ سے کنارہ کش (الگ) ہو کر اس نے محسوسات ہی کو اپنا قبلۂ نظر بنالیا۔ مخفیات کے ہر خزانہ سے محروم ہو کر حسیات ہی کو منظور نظر کر لیا اور روحانیت کے تمام لذیذ مشاغل سے بے پرواہ ہو کر مادیات کی کثافتوں میں دھنسے رہنا ہی اپنا سب سے زیادہ لذیذ مشغلہ قرار دے لیا۔ یہاں تک کہ جب باقیات صالحات سے اعراض کر کے فانی چیزوں میں جا پھنسا تو اپنی اصل سے منقطع ہو کر خود بھی بے اصل بن گیا۔

شناسان حقیقت کا تصویر سے معاملہ...... اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر اگر بارگاہ حق کے حقیقت شناس اور ان کے حقیقت رس قلوب صورتوں سے بے لگاؤ اور تصویروں سے متنفر ہوں تو کون سی جائے تعجب ہے؟

ملائکہ جیسے حقیقت شناسان بارگاہ حق تصویروں کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں؟ "لَا تَدْخُلُ الْمَلٰٓئِكَةُ بَيْتًا فِيْهِ كَلْبٌ وَلَا تَصَاوِيْرُ" ① "جس گھر میں کتا اور تصاویر ہوں اس میں ملائکہ داخل نہیں ہوتے"۔

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جیسے حقیقت شناس بارگاہ قدس کا ان رسوم ونقوش کے ساتھ کیا برتاؤ تھا؟ "إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَكُنْ يَتْرُكُ فِيْ بَيْتِهٖ شَيْئًا فِيْهِ تَصَالِيْبُ إِلَّا نَقَضَهُ" ② (رواہ البخاری) "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں کوئی ایسی شے جس میں تصویر ہو بلا توڑے نہیں چھوڑتے تھے"۔

تصویر سازی کا اخروی انجام...... حق تعالیٰ شانہ تصویر سازوں کے ساتھ یوم آخر میں کیا طریق عمل اختیار فرمائیں گے؟ اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ الَّذِيْنَ يُضَاهُوْنَ بِخَلْقِ اللّٰهِ ③ (وَفِيْ رِوَايَةٍ) اَلْمُصَوِّرُوْنَ ④ "یوم قیامت میں سب سے زیادہ سخت عذاب میں وہ لوگ ہوں گے جو خدا کی شان تخلیق میں اپنے کو اس جیسا بنانا چاہتے تھے (یعنی مصورین)"۔ یہ تو صورتوں کی تصویروں کے متعلق ارشادات شریعت تھے۔ لیکن حقائق کی تصویریں خود ہماری صورتیں ہیں، ان کے متعلق بھی منشاء حق یہ ہے کہ ہم انہیں مستقلاً مرکز التفات نہ بنادیں۔

"إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلٰى صُوَرِكُمْ وَلٰكِنْ يَّنْظُرُ إِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَنِيَّاتِكُمْ." ⑤ "اللہ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا، لیکن وہ تمہارے دلوں اور نیتوں کو دیکھتا ہے (جو تم میں غیب کی چیزیں ہیں)"۔

اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انسان کا بلاشرکت غیرے اصل وجود اور اپنی حسی کائنات کی اصل الاصول کی

---

① الصحيح للبخاري، كتاب اللباس، باب التصاوير، ج:٢، ص:١٢٧٩. ② الصحيح للبخاري، كتاب اللباس، باب نقض الصور، ج:٢، ص:١٦٧٨. ③ الصحيح للبخاري، كتاب اللباس، باب ما وطئ من التصاوير، ج:١٨، ص:٣٣٢. ④ الصحيح للبخاري، كتاب اللباس، باب عذاب المصورين يوم القيامة، ج:١٨، ص:٣٢٦. ⑤ الصحيح لمسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم ظلم المسلم وخذله واحتقاره، ج:١٢، ص:٤٢٧.

فکر و دھیان میں رہنا جب ہی ممکن تھا کہ صورتوں سے اپنی حسی آنکھ بند کر کے فہم و فراست اور قلب کی آنکھ کھولے تاکہ غیبی وجود اور مخفی اسرار اس کے مشاہدے میں آسکیں۔

حقیقت الحقائق کی جستجو...... پس اسلامی تعلیمات کا خلاصہ یہ نکلا کہ صورتوں کی تصویریں تو بالکلیہ نا قابل التفات اور تشتت کی جڑیں ہیں۔ رہیں قدرتی صورتیں سو گو کچھ نہ کچھ عارضی واقعیت رکھتی ہیں، لیکن پھر بھی تم کائنات کی اس حسی اور صوری خوشنمائی سے یکسو ہو کر اس کی حقیقی خوبی کو توجہات کا مرکز بناؤ۔ بلکہ پھر ان حقائق سے بھی قطع نظر کر کے اس حقیقت الحقائق تک پہنچنے کی سعی کرو جو تمام کمالات و جمالات کا سرمنشاء اور حقیقی خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے شہود سے ہٹا کر غیوب کی طرف انسان کو بڑھانا چاہا ہے، اجسام سے ہٹا کر حقائق کی طرف اور بالآخر مخلوقاتی حقائق سے بھی ہٹا کر حقائق الٰہیہ کی طرف لانا چاہا ہے۔ جن کا مشاہدہ بجز صورتوں سے قطع تعلق کئے ہوئے دشوار و ناممکن تھا۔

پس کہاں اسلام کی یہ حقیقت رسانی اور حق نمائی کہ بطون در بطون اور غیب در غیب کی طرف بڑھا کر انسان کو حقیقت سے ہم کنار کر دیا، اور کہاں انسانی تخیل کی یہ کج راہی کہ نمائش و زیبائش اور نمود در نمود کی طرف دھکیل کر انسان کو حق اور حقیقت سے بعید و بیگانہ محض کر دیا۔ حقیقت الحقائق سے جدا کر کے جزوی حقائق پر اور ان سے بھی بے بہرہ بنا کر صور و اشکال پر اور پھر ان سے بھی ہٹا کر تصویری خد و خال پر لا کھڑا کیا۔ پس وہاں اگر اصل الاصول تک پہنچ جانے کی وجہ سے توحید در توحید حاصل ہوتی تھی تو یہاں غیر حق کی طرف بڑھتے چلے جانے سے شرک در شرک پیدا ہو گیا۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ تصویر اشراک (شرک) کی جڑ ہے اور صورت پسندیاں انسان کی توحید کو بجائے خود کبھی باقی نہیں چھوڑ سکتیں تو یہ ایک بجا اور مطابق واقعات دعویٰ ہوگا۔

توحید پسند کا تصاویر سے تنفر...... اس لئے اگر توحید پسند طبقہ مطلقاً تصویر کا دشمن اور اس سے متنفر (نفرت کرنے والا) ہو تو یہ اس کا ایک قدرتی جذبہ اور فطری حق ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام جیسے کامل موحدین نے انسان کو انہماک صور و اشکال سے دور و در رکھنا ہی اپنے مسلک کا ایک جلی اور روشن نشان قرار دیا ہے اور انہوں نے:

1 تصویر ذی روح کو حرام قرار دیا۔ 2 ملائکہ کی نفرت اس سے ظاہر کی۔ 3 خود اپنا بغض اس سے جتلایا۔ 4 تصویر سازی اور مصور (فوٹو گرافر) پر لعنت کی۔ 5 تصویر بنادیئے جانے پر اس کے مٹا دینے کی تعلیم دی۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے شجرۃ الرضوان جیسے متبرک شجرہ کو کٹوا دیا کہ کہیں اس سے صورت پرستی کی بنیاد نہ پڑ جائے۔ مطاف مقدس میں حجر اسود کو یہ جتلا کر چوما کہ: "میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جس کے قبضہ میں نہ نفع ہے نہ ضرر، اگر میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے چومتے ہوئے نہ دیکھتا تو تجھے ہرگز نہ چومتا"۔

حقیقت پسندانہ ذہنیت...... پس اسی لئے حقیقت شناسانِ باطن نے تصویر پسندوں اور صورت دوستوں کو ایسے مظان (گمان) سے بھی بچانے کی سعی کی ہے جہاں ان کے گرفتارِ صورت ہو کر بعید از حقیقت ہو جانے کا ذرا سا

بھی خطرہ تھا۔

سالک ابتدائے سیرالی اللہ میں جبکہ حقائق کو مختلف باطنی صور واشکال کے جامہ میں مشاہدہ کرتا ہے جو خود بھی ایک حد تک غیبی ہی چیز ہیں اور ان کا مشاہدہ بھی غیب ہی میں ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کا راہنما اور مربی اسے ان صورتوں سے بے التفات بنانے کی سعی کرتا ہے، کہ کہیں ان نقوش کی رنگینیوں میں پھنس کر اصل حقیقت سے بے گانہ نہ رہ جائے ؎

کہ تو طفلی و خانہ رنگین است

غرض صورت پسندی، تصویر دوستی، تصویر سازی، تصویر بازی اسلامی مقاصد کے منافی اور اس کے بنیادی مقصد رجوع الی الغیب یا سیر الی اللہ کی راہ میں ایک عظیم الشان رکاوٹ ہے۔ اس لئے کم از کم مسلم قوم کو اپنی حقیقت پسندانہ ذہنیت چھوڑ کر صورت پرستانہ جذبات پیدا کر لینا بلاشبہ قلب ماہیت (حقیقت کو بدلنا) اور قلب موضوع (مقصد سے ہٹنا) ہے۔

حق تعالیٰ توفیق دے کہ ہم صحیح اسلامی جذبات کا احترام کریں اور کم سے کم ایسی پگڈنڈیوں سے کترا کر چلنے کی سعی کریں جو اسلامی شاہراہ سے دور پھینک رہی ہوں اور منزلِ مقصود کو بعید سے بعید تر بنانے میں جادو کا اثر رکھتی ہوں۔

وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْق

اشتراک مذہب

حالات یہ بتلا رہے ہیں کہ جب ہماری تمدنی اور معاشرتی زندگی ایک جیسی ہو جائے گی تو پھر قدرتی طور پر یہ جذبہ پیدا ہوگا کہ ہماری روحانی زندگی بھی یکساں ہو اور مذہبی جذبات بھی یکساں ہوں۔ اس لئے لامحالہ آج کے قبول کئے جانے والے مذہب میں یہ بات ضروری ہے کہ اس میں تعصب نہ ہو، اونچ نیچ نہ ہو۔ جو مذہب ان تمام خصوصیات میں پورا اترے گا، وہی کامیاب ہوگا۔ (از: حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ)

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ!

اشتراک زمن...... بزرگانِ محترم! اس وقت آپ جانتے ہیں کہ سائنس نے پھیلی ہوئی دنیا کو سمیٹ کر بہت مختصر بنادیا ہے۔ پوری دنیا ایک چھوٹا سا کنبہ بن گئی ہے۔ ایجادات نے ملنا جلنا اور چلنا پھرنا سہل بنادیا ہے۔ پہلے بیل گاڑی وغیرہ کے سفر میں بہت دشواری ہوتی تھی۔ خشکی کے راستے سے حج کے لئے پیدل چلنے میں دو تین سال لگتے تھے۔ دوسری سواریوں میں نو مہینے لگتے تھے، لیکن آج سائنس کی ترقیات نے سفر کو سہل بنادیا۔ رتھوں اور بیل گاڑیوں کی جگہ ریلیں چلیں اور اب تو ہوائی جہاز چلنے لگے جو بمبئی سے جدہ تک ۹ گھنٹے میں پہنچ جاتے ہیں، حالاں کہ دریا کے راستے سے یہ سفر (۹) دن میں ہوتا ہے اور اب تو ریڈیائی لہروں سے ہوائی جہاز چلانے کے بارے میں سوچا جارہا ہے۔ یعنی انسان بالکل پرندوں جیسے ہو جائیں گے اور گھنٹوں کی مسافت منٹوں میں طے ہوگی۔ اب تو اس کی بھی ضرورت نہیں کہ کوئی بات کہنے کے لئے کہیں جائیں، کسی شہر میں جلسہ ہو تو مقرر وہیں پہنچ کر تقریر کرے بلکہ ریڈیو کے ذریعے ساری دنیا سے خطاب کیا جاسکتا ہے۔ ان چیزوں نے پوری دنیا کو ایک کنبہ بنادیا ہے اور سارے ممالک محلوں کی حیثیت میں ہوگئے ہیں۔ ان ایجادات کا اثر یہ پڑا کہ ملکوں کی خصوصیات ختم ہوتی چلی گئیں اور ایک ملک کا اثر اور اس کے رجحانات دوسری جگہ اثر انداز ہونے لگے۔ خیالات میں بھی اشتراک پیدا ہوتا جارہا ہے یعنی جذبات ایک سے، افکار ایک سے، خیالات ایک سے یعنی ساری دنیا یہ چاہتی ہے کہ ہم سب ایک ہو جائیں۔ برما کے وزیر مجت ہمارے یہاں آئے تھے، ان سے پوچھا گیا کہ آپ کا دہلی کیسے تشریف لانا ہوا تھا، تو انہوں نے

فرمایا کہ: ہمیں حکومت ہند سے کچھ مشورہ کرنا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ملک اپنے داخلی معاملات میں بھی خارجی ممالک کی پالیسی کے ماتحت ہے۔ گویا کہ سیاست داخلی سیاست خارجی سے پوری طرح متاثر ہے۔ چناں چہ یونائیٹڈ نیشن کا ادارہ (یو این او) یعنی مجلس اقوام متحدہ قائم ہے جو اشتراک ذہن کا نتیجہ ہے۔ گویا کہ دنیا کی قوموں کے تعصبات ختم ہوتے جارہے ہیں۔ حد بندیاں اور خصوصیات ختم ہو رہی ہیں۔

تبدیلی اصول..... چناں چہ اب یہ صدا اٹھ رہی ہے کہ اگر عالمی امن چاہتے ہو تو چھوت چھات مٹاؤ اور امتیازات کو ختم کرو، اسی وقت امن قائم ہوگا۔

گاندھی جی جب دلی میں آتے تھے بھنگی بستی میں قیام کرتے تھے۔ محض یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اب امتیازات ختم کرنے کا زمانہ آ گیا ہے۔

پنڈت پنت صاحب جب رکھنڈی میں آئے تو انہوں نے ایک ہریجن کے مکان پر قیام کیا اور اس کے گلاس میں دودھ پیا۔ ان واقعات سے معلوم ہوا کہ تمام قوموں کے اصول بدل رہے ہیں۔

پہلے عوام تابع تھے خواص کے اور اب خواص تابع ہیں عوام کے، پہلے چراغ تلے اندھیرا تھا اب چراغ کے اوپر اندھیرا ہے۔ پہلے جو چیز چھپانے کی تھی وہ اب برسرِ عام آ گئی، مثلاً دولت، عورت، پہلے خواص کی رائے اہمیت رکھتی تھی۔ اب عوام کی رائے کو اہمیت ہے، لہٰذا خواص کو نیچے اترنا پڑے گا اور عوام کو اوپر اٹھنا پڑے گا۔

اشتراکِ مذہب..... حالات یہ بتلا رہے ہیں کہ جب ہماری تمدنی اور معاشرتی زندگی ایک جیسی ہو جائیگی تو پھر قدرتی طور پر یہ جذبہ پیدا ہوگا کہ ہماری روحانی زندگی بھی یکساں ہو اور مذہبی جذبات بھی یکساں ہوں۔ اس لئے لامحالہ آج کے قبول کئے جانے والے مذہب میں یہ بات ضروری ہے کہ اس میں تعصب نہ ہو، اونچ نیچ نہ ہو، جو مذہب ان تمام خصوصیات میں پورا اترے گا وہی کامیاب ہوگا۔ چناں چہ ایک مذہب نے اعلان کیا کہ۔ ﴿يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ أُنْثٰى﴾ ① الخ. گویا تمام اقوام مل کر ایک بدن کے اعضاء ہیں۔ "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند"۔

"ہم نے تم میں قبیلے بنائے تاکہ پہچان باقی رہے نہ اس لئے کہ تفاخر کا ذریعہ ہو، تم میں نسل کے اعتبار سے کوئی بڑائی چھوٹائی نہیں، البتہ عمل کے اعتبار سے بڑائی چھوٹائی رہے گی، پیدائشی اعتبار سے کوئی چھوٹائی بڑائی نہیں، آفتاب اگر چمکتا ہے تو وہ روشنی تقسیم کرنے میں اونچ نیچ نہیں برتتا بلکہ سب اپنی اپنی اہمیت کے مطابق روشنی سے مستفید ہوتے ہیں، شیشہ اپنی قابلیت کے لحاظ سے روشن ہوتا ہے اور کالا توا اپنی صلاحیت کے لحاظ سے نمایاں ہوتا ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ عبادت گاہیں کسی کے لئے مخصوص نہیں ہیں۔ جو زیادہ خشوع سے عبادت کرے گا وہ بڑھ جائے گا اور جو ایسا نہ کرے گا وہ نیچا رہے گا۔

① پارہ: ۲۶، سورۃ الحجرات، الآیۃ: ۱۳۔

عمومی مساوات...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اگر میری بیٹی فاطمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) بھی چوری کرے گی تو اس کا بھی ہاتھ کاٹ دوں گا'' ①۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا کہ سنو اور مانو! ایک بڑھے نے کہا ہم ایسا نہیں کریں گے تم خائن ہو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ میں نے کیا خیانت کی؟ تو اس نے کہا، بیت المال سے سب کو ایک ایک چادر ملی ہے لیکن آپ کے بدن پر دو چادریں ہیں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کا جواب میرا بیٹا عبداللہ دے گا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں نے اپنی چادر اپنے باپ کو دے دی تھی۔ معلوم ہوا کہ اگر امیر اعتراض کر سکتا ہے تو غریب بھی اپنے امیر پر اعتراض کر سکتا ہے۔ غور کی بات ہے کہ آج کے دور میں یہ اعلان مناسب ہوگا کہ اے انسانو! تم ایسے کام کرو جن میں سب کے لئے نفع سب کے لئے عزت سب کے لئے راحت ہو۔

یا یہ اعلان مناسب رہے گا کہ اے ہندیو! اے عربو! تم صرف اپنا نفع دیکھو، بہر حال اونچ نیچ جو کچھ بھی ہے عمل کے اعتبار سے ہے، لہٰذا وہی مذہب چل سکے گا جس میں عمومی مساوات موجود ہو۔ ہم تو یہ کہیں گے کہ اس وقت دنیا نے اسی اصول مساوات سے استفادہ کیا ہے۔ لہٰذا اب زمانہ کا تقاضہ ہے کہ معاشی اور معاشرتی اور روحانی ہر اعتبار سے یکسانیت ہو، جو کہ وہ پہلے ہی سے اس ہمہ گیر ذہنیت کو لے کر چل رہا ہے۔ اسے کسی سے لڑنے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی، وہ سب کو اپنے اندر سمو سکے گا۔

حد بندیوں کے توڑنے کا واحد اصول...... بہر حال تعصب سے بچنا پڑے گا۔ تعصب مختلف اسباب سے قوموں میں پیدا ہوجاتا ہے۔ مثلاً بعض دفعہ اس سے بھی تعصب پیدا ہو جاتا ہے کہ دوسرے کے مقتداء کو برا کہا جائے۔ لہٰذا سب سے پہلے اس آیت قرآنی میں یہی کہا گیا ہے کہ ''ہم نے مان لیا اللہ کو اور اس کی کتاب کو جو ہماری طرف اتری ہے''۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ پہلوں پر نازل ہوا اس کو برا کہو بلکہ یہاں تک ہے کہ جو کچھ نبیوں، رشیوں، منیوں پر نازل ہوا ہم ان سب کو بھی ان کے وقت کے لئے سچا سمجھتے ہیں۔ حد بندیوں کے توڑنے کا واحد اصول یہی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں جتنی سچائیاں ہیں انہیں قبول کرے اور کتابوں کو سچا سمجھے اور جو کچھ ان لوگوں نے بعد میں اضافہ یا ترمیم کی ہے، اس کو رد کرے۔ قرآن کریم نے اعلان کیا ہے کہ ہم نے تمام اقوام میں رسول بھیجے ہیں، شام، دمشق، عرب وغیرہ میں پیغمبر آئے۔ پھر کیا ہندوستان میں کوئی پیغمبر نہیں آیا؟ ضرور آیا۔ سب سے پہلے تو حضرت آدم علیہ السلام ہی آئے جو لنکا میں اترے۔ گویا مذہب کی ابتداء ہندوستان سے ہوئی ان کی کنیت ابوالبشر ہے (یعنی مہا دیو) ان کے بیٹے حضرت شیث علیہ السلام کی قبر جودھیا میں ہے، پھر ہر ملک اور قوم میں انبیاء علیہم السلام تشریف لاتے رہے، آخر میں حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم عرب میں مبعوث ہوئے، تو

---

① السنن للنسائی، کتاب قطع السارق، باب ذکر اختلاف الفاظ الناقلین لخبر الزہری۔ ج:۱۵، ص:۹۰۔
حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے صحیح وضعیف سنن النسائی ج:۱۰ ص:۳۹۶ رقم:۴۹۲۲۔

گویا ہندوستان سے پیغمبری کی ابتداء ہوئی اور عرب پر ختم ہوئی۔

مہاتمابدھ کی پیشین گوئی...... حدیث میں ہے کہ اللہ کے نزدیک دو جگہیں بہت مقبول ہیں، ایک وہ جگہ جس میں حضرت آدم علیہ السلام اترے، دوسری وہ جگہ جس میں کعبۃ اللہ ہے۔ حضرت مولانا مناظر احسن صاحب نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "النبی الخاتم" اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مہاتمابدھ نے ہندوستان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت دی تھی۔

چنانچہ بدھ کی جانکنی کے وقت بدھ کے ایک شاگرد نندا نے ان سے پوچھا کہ تمہارے بعد اب ہماری راہنمائی کون کرے گا؟ تو مہاتمابدھ نے کہا کہ ہم سے پہلے بہت بدھ آ چکے ہیں اور اب ایک آخری بدھ آئے گا جس کا لقب متریا ہوگا۔ اس کے بتلائے ہوئے طریقے پر چلنا چاہئے۔ متریا کے معنی ہیں رحمت کے۔ قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے۔ چنانچہ بدھ مذہب والوں نے اکثریت سے اسلام کی تعلیمات قبول کیں۔

اجمالی ایمان...... قرآن پاک میں ایک پیغمبر کا نام ذوالکفل فرمایا گیا، مولانا مناظر احسن نے اس کے متعلق اپنے اس خیال کا بھی اظہار فرمایا ہے یہ مقام کپل ہے اور کپل وستو اسی سے بنا ہے کفل اور کپل میں زیادہ فرق نہیں، ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ بہر حال مشرقی ممالک نے اس بشارت کو قبول کیا اور مغربی ممالک مادیات میں پھنس کر تباہ ہو گئے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے سرہند شریف کے متعلق فرمایا ہے کہ یہاں دو پیغمبر ہیں، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ گنگا کے پانی میں خصوصی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس پر غور کیا کہ گنگا کہاں سے شروع ہوئی ہے۔ اس کی تلاش میں چل دیئے اور گنگوتری پہنچے، وہاں ایک ہفتہ قیام کیا اور واپس آ کر فرمایا کہ جہاں گنگا کا دہانہ ہے وہاں کسی پیغمبر علیہ السلام کے انوار نظر آتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ گنگا کسی پیغمبر کی دعا سے نکلی ہو۔ جیسے زمزم کا چشمہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی برکت سے جاری ہو۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ رام چندر جی اور کرشن جی کو برا مت کہو۔ ممکن ہے یہ اپنے وقت کے پیغمبر ہوں، اس لئے نام لے کر انہیں بھی برا نہ کہو۔ چنانچہ ان کے پیغامات میں بہت سی باتیں حق ہیں۔ ممکن ہے بعد کے لوگوں نے خلط ملط کر دیا ہو۔ جس طرح عیسائیوں اور یہودیوں نے اپنی تعلیمات میں خلط کر دیا ہے۔ اسی لئے حکم ہے کہ جن کا نام قرآن وحدیث میں صراحۃً موجود ہے ان کا نام لے کر مانو اور جن کا نام نہیں آیا ان پر اجمالاً ایمان لاؤ۔

مذہب کی بنیاد...... اس کے یہ معنی ہیں کہ اسلام کی بنیاد ماننے پر ہے، یعنی تصدیق پر مدار ہے تکذیب پر نہیں۔ بخلاف اس کے یہودیوں کا مدار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار پر ہے اور عیسائیوں کا مدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار پر۔ مگر اسلام نے اپنی بنیاد ماننے پر رکھی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مذہب کی بنیاد ماننے ہی پر ہو سکتی ہے نہ ماننے پر نہیں، یعنی مذہب کی بنیاد مثبت پہلو پر ہونی چاہئے منفی پہلو پر نہیں۔

بہر حال چوں کہ پوری دنیا ایک قبیلہ بن گئی ہے اس لئے اب حد بندیاں قائم نہیں رہ سکتیں۔ یہی حال روحانی

خیالات اور عقائد کا بھی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے تعصبات مٹانے پڑیں گے اور تفریق ختم کرنی ہوگی اور وطن کی حد بندی ختم کرنی ہوگی۔ مدار ملک کا کلی امور پر ہوتا ہے، جزوی امور پر نہیں ہوتا۔ اور کلی امور عالمی امور ہیں۔ ان ہی پر ملک کا دارومدار ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے تیرہ سو سال پہلے یہ اعلان کر دیا تھا کہ کسی ملک والے کو دوسرے ملک والے پر فضیلت نہیں، سوائے تقویٰ کے۔

احترام انسانیت...... انسانیت کا احترام اسی طرح ضروری ہے۔ جس طرح مذہبیت کا احترام، لہٰذا چھوت چھات اور تعصب کو مٹانا پڑے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جبلہ بن ایہم شاہ غسان مسلمان ہو کر طواف کر رہا تھا، اس وقت کسی اعرابی کا پاؤں اس کی چادر پر پڑ گیا تھا۔ جبلہ نے اس اعرابی کو طمانچہ مار دیا۔ اعرابی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ انہوں نے حکم دیا کہ یہ اعرابی اپنا بدلہ اس طرح لے سکتا ہے کہ جبلہ کے ایک طمانچہ لگائے۔

یہ دینی مساوات کا معاملہ تھا۔ جبلہ نے اس حکم کو سن کر کہا کہ مجھے مہلت دی جائے، جب اس کو مہلت دی گئی تو وہ بھاگ گیا اور پھر کفر کو اختیار کر لیا۔ لیکن اسلام نے بڑے اور چھوٹے، اونچ نیچ کے فرق کو مٹانے کے لئے کسی بات کی پرواہ نہ کی۔

مذہب واحد...... بنی اسرائیل کو ہر طرح کی دولت اور حکومت دی گئی تھی۔ انہوں نے عیش پرستی میں زندگی گزارنی شروع کر دی۔ پیغمبروں نے بہت سمجھایا، مگر انہوں نے نہ مانا۔ آخر عراق کے بادشاہ بخت نصر نے چڑھائی کی اور ان کا قتل عام کیا اور کئی لاکھ بنی اسرائیل گرفتار کیے گئے۔ حضرت دانیال علیہ السلام پیغمبر بھی اسیروں میں سے تھے ان کی دیانت و امانت و راست بازی، صدق و صفا اور عبادت و زہد کو دیکھ کر حکام جیل ان کے گرویدہ اور معتقد ہو گئے اور کمال احترام سے پیش آنے لگے۔ اس حالت پر ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بخت نصر نے ایک خواب دیکھا جس سے اس کے دل میں گھبراہٹ اور بے چینی پیدا ہوئی۔ اس نے دربار کے کاہنوں اور ساحروں کو طلب کیا، اور اپنی قلبی بے چینیوں کا ذکر کرتے ہوئے جو اس غیر معمولی خواب سے پیدا ہوئی تھیں، ان سے خواب کی تعبیر طلب کی۔ انہوں نے کہا کہ خواب بیان فرمائیے کہا، کہ خواب تو مجھے یاد نہیں رہا۔ انہوں نے کہا کہ پھر ہم تعبیر کیسے بتلائیں؟ اس نے غضبناک ہو کر کہا کہ "میں نے تمہیں اسی قسم کے انکشاف کے لئے تو دربار میں اس رتبہ تک پہنچایا تھا (جب تم ایسے امور کا بھی انکشاف نہیں کر سکتے تو تم کس مرض کی دوا ہو؟) جاؤ تمہیں تین دن کی مہلت ہے۔ اگر تم نے اس مدت میں خواب اور تعبیر بتلا دی فبہا، ورنہ تم سب قتل کر دیئے جاؤ گے"۔ اس واقعہ کا چرچا ہو گیا شدہ شدہ یہ خبر جیل میں بھی پہنچی اور حضرت دانیال علیہ السلام کے کان میں پڑی۔ آپ علیہ السلام نے جیلر سے فرمایا جو ان کا بہت زیادہ معتقد اور محسن تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ تو بادشاہ سے میرا تذکرہ کر دے۔ کیونکہ میرے پاس اس کے خواب کا علم ہے اور مجھے امید ہے کہ اس سے بادشاہ کے یہاں تیرا رتبہ اور منصب بڑھ جائے گا اور میری رہائی کی صورت نکل آئے گی (جس سے میری قوم اس قید و بند کے عذاب سے چھٹکارا پا سکے گی) جیلر

نے کہا، مجھے آپ کے بارے میں بادشاہ کے بے پناہ غصہ کا ڈر ہے کہ کہیں آپ جیل کے مصائب سے چھوٹنے کے لئے فرمارہے ہیں یا واقعی آپ کو علم ہے۔ حالاں کہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں اگر کسی کو بادشاہ کے اس فراموش شدہ خواب کا علم ہے تو وہ صرف آپ ہی کی ذات ہے۔ فرمایا: تم میرا خوف نہ کھاؤ اور بے فکر ہو کر بادشاہ سے میرا تذکرہ کردو (میں قطعاً اس کے خواب اور تعبیر خواب کو جانتا ہوں) جس کی وجہ یہ ہے کہ میرا ایک رب ہے جو مجھے ان باتوں کی خبریں دے دیتا ہے، جن کو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

جیلر نے بادشاہ سے جا کر تذکرہ کر دیا۔ بادشاہ نے اسی وقت حضرت دانیال علیہ السلام کو طلب کر لیا اور وہ شاہی دربار تک پہنچا دیئے گئے۔ دربار کا ضابطہ تھا کہ اندر داخل ہونے والا بادشاہ کو سجدہ کرے۔ لیکن دانیال علیہ السلام داخلِ دربار ہو کر کھڑے رہے اور سجدہ نہ کیا۔ تھوڑے وقفہ سے بادشاہ نے دربار برخاست کیا اور تخلیہ میں حضرت دانیال علیہ السلام سے گفتگو شروع کی۔

سب سے پہلے پوچھا کہ آداب دربار کے مطابق آپ نے مجھے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ فرمایا: اس کی وجہ یہ کہ میرا ایک رب ہے، اس کا حکم ہے کہ میں اس کے سوا کسی کو سجدہ نہ کروں۔ میں اس سے ڈرتا ہوں کہ میں تجھے سجدہ کرلوں اور وہ اسی وقت یہ علم مجھ سے سلب کر لے، تو میں تیرا خواب نہ بتلانے کے سبب تیرے ہاتھ میں قیدی بن کر رہ جاؤں اور تو مجھ سے اس علم کا فائدہ نہ اٹھا سکے اور مجھے قتل کر ڈالے۔ اس لئے میں نے ترک سجدہ قتل سے آسان سمجھا اور ترک سجدہ کے خطرہ کو اس خطرہ سے ہلکا سمجھا کہ تو ساری عمر اس بے چینی میں مبتلا رہے۔ جس میں فراموش شدہ خواب کی وجہ سے اب مبتلا ہے، پس میں نے ترک سجدہ کو تیرے اور اپنے دونوں ہی کے لئے مفید سمجھا۔

بخت نصر نے کہا کہ میرے نزدیک تجھ سے زیادہ اپنے الٰہ و معبود کا وفادار دوسرا نہیں اور بلاشبہ وہی لوگ پسندیدہ ہیں جو اپنے رب کے عہد و میثاق کو پورا کرتے اور وفادار رہتے ہیں۔ ہاں تو کیا تیرے پاس میرے خواب اور اس کی تعبیر کا علم ہے؟ فرمایا: ہاں ہے۔

”تو نے خواب میں دیکھا کہ زمین و آسمان کے درمیان ایک عظیم الشان بت معلق ہے۔ جس کے پاؤں زمین پر لگے ہوئے ہیں اور سر آسمان میں۔ اس بت کے اوپر کا حصہ سونے کا ہے، درمیانی حصہ چاندی کا ہے اور نچلا حصہ تانبے کا ہے، ٹانگیں لوہے کی ہیں اور قدم مٹی کے ہیں۔ تو اس کی خوبصورتی، حسن و جمال اور بے نظیر ساخت کو حیرانی سے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک آسمان سے ایک زبردست پتھر گرا اور اس بت کی کھوپڑی پر آ کر اس زور سے پڑا کہ یہ بت پاش پاش ہو کر سرمہ کی طرح پس کر رہ گیا۔ اس کا سونا، چاندی، تانبہ، لوہا اور مٹی سب ایک رل ہو کر اس طرح خلط ملط اور ڈھیر ہو گئے کہ یہ سب دھاتیں رل مل کر ایک ذات ہو گئیں اور کوئی دھات دوسری سے ممتاز اور جدا نہ رہی اور تو اس یقین پر پہنچ گیا کہ اب اگر دنیا کے تمام انسان اور جن بھی جمع ہو کر یہ چاہیں کہ ان دھاتوں کو الگ الگ کر دیں تو نہیں کر سکتے۔ اگر اس حالت میں ہوا چل جائے تو (یہ دھاتیں پس کر اس درجہ سرمہ ہو گئی ہیں

کہ ہوا بھی ان ذرات کو اڑا سکتی ہے۔

اسی حالت میں تو نے دیکھا کہ وہ آسمان سے گرنے والا پتھر (اس بت کو پیس دینے کے بعد) اچانک فضائے آسمانی میں پھیلنا شروع ہوا، اور پھیلتے پھیلتے اتنا بڑا ہوگیا کہ پوری زمین پر چھا گیا، اور زمین اس سے چھپ گئی یہاں تک کہ آسمان اور اس پتھر کے سوا تجھے کچھ اور نظر نہیں آ رہا تھا۔

بخت نصر نے کہا بالکل درست، یہی تھا وہ خواب جو میں نے دیکھا تھا۔ اچھا اب اس کی تعبیر فرمایئے! حضرت دانیال علیہ السلام نے فرمایا (سنیے) وہ بت دنیا کی مختلف قومیں ہیں جو دنیا کے اول و آخر اور درمیانی زمانوں میں (مختلف درجات و مراتب کے ساتھ آئیں گی اور) موجود ہیں۔ سو اس بت کے سونے کا حصہ تو یہ موجودہ دور اور تیری قوم ہے جس پر تو حکمرانی کر رہا ہے اور چاندی کا حصہ تیرے بعد کی قوم ہے، جس پر تیرا بیٹا حکمرانی کرے گا۔ اور تانبے کا حصہ رومی قوم ہے اور لوہے کا حصہ فارسی قوم ہے۔ اور مٹی کا حصہ دو اور قومیں ہیں جن پر دو عورتیں حکمرانی کریں گی۔ ایک مشرقی یمن میں اور ایک مغربی شام اور وہ پتھر جو اس خوش نما بت کے اوپر آسمان سے پھینکا گیا، وہ دین ہے جو کہ نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وسلم) لے کر آویں گے وہ اور ان کی امت اس دین کو ان قومیتوں کے بت پر پھینک مارے گی تاکہ اس دین کو تمام اقوام کے ادیان پر غالب کر دے۔ (قومیتوں کی اونچ نیچ کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دے) پس اللہ تعالیٰ ایک نبی امی کو عرب میں مبعوث کرے گا جو تمام امتوں قومیتوں اور متخالف مذہبوں کو توڑ پھوڑ کر مذہب واحد کر دے گا۔ جس طرح اس پتھر نے بت کی تمام اونچی نیچی دھاتوں کو توڑ پھوڑ کر ایک کر دیا (اور پھر وہ آخری دین) اسی طرح پوری دنیا میں پھیل جائے گا۔ جس طرح وہ پتھر بت کو توڑ کر خود ساری فضاء میں چھا گیا۔

حق تعالیٰ اپنے دین کو خالص کر دے گا، باطل کا سر نیچا ہو جائے گا، راہ ہدایت سامنے آ جائے گی۔ ضلالت گم ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ امیوں (ان پڑھوں) کو اس دین کی تعلیم دے گا اور دین کے ذریعہ ضعفاء کو (جنہیں اچھوت بنا دیا گیا تھا) قوت عطاء کرے گا۔ ذلیل اس سے عزت پائیں گے اور کمزوروں کو اس سے مدد ہوگی۔

(بادشاہ کے دل میں یہ بات اتر گئی اور اس نے انتہائی عقیدت سے) عرض کیا کہ میں نے جب سے سلطنت سنبھالی ہے میری نظر سے آپ جیسا شخص نہیں گزرا، جس نے میرے دل پر چھائی ہوئی کسی کیفیت (دہشت و بے کلی) کو اس طرح چھانٹ دیا ہو اور اب میرے دربار میں آپ سے زیادہ کوئی بارتبہ نہ ہوگا۔ میں آپ کو اس احسان عظیم کے بقدر ہی صلہ دوں گا۔ ①

دینِ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم...... اس حدیث صاف سے واضح ہے کہ خاتم الانبیاء کا دین جو دنیا کے آخری دور میں ظاہر ہوگا (جیسا کہ ہو چکا ہے) ان تمام قومی نسلی اور وطنی امتیازات کو پاش پاش کر ڈالے گا اور اس

① تفسیر الطبری، سورۃ الاسراء، الآیۃ: ۷، ج: ۱۷، ص: ۳۷۷.

طرح دنیا کی متفاوت قومیتیں اور اونچی نیچی ذاتیں رل مل کر ایک ذات ہو جائیں گی۔ چھوت چھات کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ دیا جائے گا۔ وہی قومیں جن کا مذہب ہی اونچ نیچ اور چھوت چھات تھا، خود اپنے اس مذہب پر لعنتیں بھیجنے لگیں گی۔ حتیٰ کہ سارے رجعت پسند لیڈر مل کر بھی اگر ان امتیازات کو پھر لوٹانا چاہیں گے تو نہیں لوٹا سکیں گے اور اس طرح پوری دنیا میں ایک قوم ہوگی، ایک ازم ہوگا اور دنیا کی اس واحد قوم کی عالمی حکومت ہوگی۔

پھر جب یہ بات پوری طرح ذہن نشین ہو چکی کہ سارے عقلاء و مدبرین اصول مساوات کو تمدنی، معاشی اور معاشرتی حیثیت سے قولاً و عملاً و قلباً قبول کرتے جا رہے ہیں اور اس کے فوائد سے متمتع ہو رہے ہیں۔ تو جس اسلام میں اس کی مکمل تعلیم تیرہ سو برس سے موجود ہے۔ اس مذہب کے دوسرے اصول بھی قابل غور ہو جاتے ہیں اور میں پورے اطمینان کے ساتھ یہ چیز پیش کر رہا ہوں کہ یقیناً اسلام کے تمام اصول اسی طرح مکمل اور بہترین ہیں۔ پھر جس طرح دنیاوی ضروریات کے لئے سب نے وصول اسلام کو قبول کر لیا ہے تو کیوں نہ روحانی حیثیتوں سے بھی اسلامی اصول کو تسلیم کیا جائے۔ تعصبات سے ہٹ کر سنجیدگی سے گہرائی کے ساتھ تحقیق کی جائے تو ان شاء اللہ اسلام ہی ایسا مذہب ظاہر ہوگا جو شخصی جذبات کو تو نہیں، لیکن سلیم الطبع ہر مدبر و سنجیدہ انسان کے قلب و دماغ کو مطمئن کر سکتا ہے۔

دنیا وآخرت

اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ دنیا بھی ایک برابر کا عالم ہے، آخرت بھی ایک برابر کا عالم ہے۔ محض راہ گزر نہیں ہے کہ دنیا تو ایک راستہ ہے یہاں سے چل پڑو اور آخرت میں پہنچ جاؤ بلکہ فرمایا: اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ. ① ”دنیا آخرت کی کھیتی ہے“۔ جیسا بیج یہاں ڈال دو گے، ویسا ہی پھل آخرت میں پاؤ گے۔ تو دنیا گویا کھیتی کی جگہ ہے۔ انسان کا کام بیج ڈالنا ہے۔ اچھا بیج ڈالے گا، اچھا پھل نکل آئے گا، برا بیج ڈالے گا برا پھل آئے گا۔

گندم از گندم بروید جوز جو
از مکافات عمل غافل مشو

(از: حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ)

”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ، وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ، لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ، فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ○ لِيَكْفُرُوْا بِمَا اٰتَيْنٰهُمْ وَلِيَتَمَتَّعُوْا، فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ﴾ ② صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

احوالِ واقعی...... بزرگانِ محترم! مجھے اس وقت کوئی لمبی تقریر کرنی نہیں ہے۔ وقت بھی تھوڑا ہے۔ اور میں بھی اس وقت تھکا ہوا ہوں۔ عمر کے لحاظ سے بھی ضعیف ہوں اور عوارض کے لحاظ سے بھی۔ اس لئے زیادہ بولنے کی ہمت نہیں، مختصر طریق پر اس آیتِ کریمہ کی روشنی میں ”چند باتیں“ آپ حضرات کی خدمت میں گزارش کرنی ہیں۔

① علامہ عجلونی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: قال في المقاصد لم اقف عليه مع ايراد الغزالي له في الاحياء، وقال القاري: قلت معناه صحيح مقتبس من قوله تعالى "من كان يريد حرث الآخرة نزد له في حرثه" دیکھئے: کشف الخفاء ج: ١ ص ٤١٢. ② پارہ: ٢١، سورة العنكبوت، الآية: ٦٤، ٦٥، ٦٦.

تذکرۂ دنیا کا مقصد...... اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ، نے دو عالموں کا ذکر فرمایا ہے۔ایک عالم دنیا اور ایک عالم آخرت۔عالم دنیا کا ذکر اس لئے کیا کہ ہم اس میں آباد ہیں۔ہمارے فرائض بتلانے کے لئے دنیا کا ذکر کیا گیا ہے، دنیا کو منوانے یا دنیا پر ایمان لانے کے لئے تذکرہ نہیں کیا گیا۔اس لئے کہ ایمان غیبی چیزوں پر لایا جاتا ہے۔"انبیاء علیہم السلام کی خبروں پر اعتماد کر کے کسی چیز کو ماننا" یہ ایمان ہے آنکھ سے دیکھ کر ماننا یہ ایمان نہیں ہے یا عقل سے سمجھ کر مان لینا، اسے ایمان نہیں کہتے۔کوئی یوں نہیں کہہ سکتا کہ میں ایمان لایا کہ دو کا دگنا چار ہوتا ہے۔یہ ایک عقلی چیز ہے ایمان لانے کی چیز نہیں محسوسات میں سے ہے، یا جب صبح آفتاب نکلے تو کوئی یوں نہیں کہے گا کہ میں ایمان لایا کہ سورج نکل آیا ہے وہ ایمان لانے کی چیز نہیں، وہ تو آنکھوں سے دیکھنے کی چیز ہے۔غرض ایمان غیبی چیزوں پر لایا جاتا ہے۔اور وہ بھی پیغمبر کے منہ پر اعتماد اور اطمینان کر کے جیسے وہ فرمائیں ویسے مان لینا اسے ایمان کہتے ہیں۔

بہر حال اس آیت کریمہ میں دنیا کا ذکر ایمان لانے کے لئے نہیں فرائض بتلانے کے لئے کیا۔

تذکرۂ آخرت کا مقصد...... اور آخرت کا ذکر ایمان لانے کے لئے کیا ہے کیوں کہ وہ آنکھوں کے سامنے موجود نہیں۔آخرت کی پہلی منزل "عالم برزخ" ہے جسے قبر کہتے ہیں۔اس کے حالات کو نہ عقل معلوم کر سکتی ہے نہ آنکھ دیکھ سکتی ہے۔بجز اس کے کہ مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خبر پر اطمینان کیا جائے اور کوئی صورت نہیں۔عالم آخرت کا برپا ہونا، میدان محشر کے حالات، جنت، دوزخ کا وجود، پل صراط اور میزان کا وجود آج تک کسی آنکھ نے نہیں دیکھا نہ عقل نے دریافت کیا۔اس کو ماننا یہ ایمان ہے۔غرض دنیا کا ذکر احکام کو بتلانے کے لئے کیا گیا ہے اور آخرت کا ذکر ایمان لانے کے لئے کیا گیا ہے۔

آخرت کو عقل سے سمجھنے کا نقصان...... جن قوموں نے آخرت کو عقل سے سمجھنا چاہا ہے، انہوں نے بہت ٹھوکریں کھائیں اور وہ حقیقت حال نہیں سمجھ سکیں کیوں کہ عقل غیبی امور کا ادراک نہیں کر سکتی۔

عقل تو ان محسوسات میں آنکھ سے دیکھی چیز، کان سے سنی چیز یا ناک سے سونگھی چیز ان میں سے کچھ نتائج نکالتی ہے۔لیکن غیبی امور کو پالینا یا پرکھ لینا یہ عقل کا کام نہیں ہے یہ وحی کا کام ہے اور وحی ہی یہ خبر دے سکتی ہے۔کہ غیب کیا چیز ہے؟ عالم غیب میں کیا واقعات پیش آئیں گے؟ اس میں عقل درکار نہیں ہے نہ عقل کارآمد ہے نہ عقل اس میں چل سکتی ہے، غرض جن قوموں نے آخرت کو محض نشانہ بنایا، انہوں نے ٹھوکریں کھائیں۔

منکرین آخرت کا نظریہ...... بعض قوموں نے تو یہ سمجھا کہ آخرت کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، صرف دنیا ہی کا عالم ہے، آگے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔وہ کہتے ہیں جب آدمی مر گیا تو فنا ہو گیا، اب وہ نہ آئے گا نہ پہلے تھا، نہ آئندہ ہوگا، بس قصہ ختم ہوا۔وہ آخرت کو مانتے ہی نہیں کہ جزا و سزا ہوگی، حساب و کتاب ہوگا اور اللہ کے آگے بندوں کی پیشی ہوگی۔وہ نہیں مانتے۔اس لئے کہ کرام انبیاء علیہم السلام کی خبروں پر اطمینان نہیں رکھتے بلکہ وہ عقل پر پرکھتے ہیں۔ظاہر بات ہے کہ عقل مرنے کے بعد کی چیزوں کی کوئی خبر نہیں دے سکتی، اس واسطے انہوں نے انکار

کر دیا۔ اور موت کے معنی ''فنا محض'' کے سمجھے کہ بس گیا سو گیا، جیسے پہلے نہیں تھا ویسے ہی آئندہ بھی نہیں ہوگا۔
غرض بعض اقوام نے ایک نظریہ یہ قائم کیا کہ جو کچھ ہے معاذ اللہ وہ دنیا ہے اور آخرت کوئی چیز نہیں۔

دنیا کو فقط ''راہ گزر'' ماننے کا نظریہ..... بعض قوموں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ اصل آخرت ہے، دنیا اس کا راستہ ہے۔ اس سے گزر کر ہی عالم آخرت آئے گا۔ جو دنیا میں نہیں آیا، پیدا نہیں ہوا اس کے لیے آخرت بھی نہیں۔ جو دنیا میں آ گیا، پیدا ہو گیا پھر اس نے انتقال کیا اس کے لئے عالم آخرت ہے۔ غرض دنیا ایک راستہ اور راہ گزر ہے، آنے والی چیز آخرت ہے۔ وہی اصل منزل و مقصد ہے وہیں جانا ہے۔ تو ایک یہ نظریہ کہ آخرت کو مانا مگر اس کے ساتھ دنیا کو محض ایک راہ گزر مانا۔

پہلے نظریے کے دنیوی آثار..... ان دونوں نظریات کے اقوام پر دو اثر پڑے، جنہوں نے کہا کہ فقط دنیا ہی کا عالم ہے آخرت آنے والی نہیں۔ وہاں سے تمدن کا غلو برپا ہوا۔ انہوں نے کہا جب دنیا ہی دنیا ہے تو عیش اڑانے میں کوئی کمی نہ کی جائے۔

بابر بہ عیش کوش کہ ایں عالم دوام نیست

کھانا، پینا، پہننا اور رہنا سہنا، نیز کوٹھی اور بنگلے، یہی ان کی دنیا ہے اور یہی ان کی آخرت ہے۔ اس سے آگے کوئی چیز نہیں۔ نہ ان کو حلال اور حرام کی تمیز کی ضرورت۔ جب دنیا ہی دنیا ہے آگے کہیں جانا نہیں۔ کوئی حساب دینا نہیں۔ اس لئے جائز و ناجائز کی بحث ہی نہیں آتی، بس جس طرح سے ہو عیش اڑاؤ۔ اس طرح سے تمدن کا غلو اور تمدن میں مبالغے برپا ہوئے کہ فقط یہی نہیں کہ آدمی اچھا کھا لے، پی لے اور اچھا پہن کر گزر کر لے۔ بلکہ کھانے اور پینے میں اتنا مبالغہ اور اتنے تکلفات بھی جہاں عقل بھی نہ پہنچے، وہ تکلفات بھی پیدا کیے جا رہے ہیں۔ غرض دنیا کو سجا دینے کا نام زندگی ہے۔ وہ نہ سجے تو انسان کی زندگی نہیں ہے۔ تو تمدن کے مبالغے، عیش و آرام کی چیزیں، کھانے اور پینے کے سامان، رہنے اور سہنے کے سامانوں میں مبالغے اتنے ہوئے کہ پچھلوں کی عقل میں بھی نہیں آ سکتے تھے کہ دنیا ترقی کر کے اس درجے پر پہنچ جائے گی، عیش و آرام کے اتنے سامان برپا ہو جائیں گے۔ غرض اس نظریے کے تحت تمدن کا غلو پیدا ہوا کیوں کہ دیانت اور دین کوئی چیز نہ رہا۔ اللہ کے آگے حاضری اور حساب دینے کا کوئی سوال نہ رہا۔ دنیا ہی دنیا رہ گئی تو جس طرح سے چاہو اس کو برپا کر لو۔ جتنا چاہو اس کو برپا کر لو، جتنا چاہو اس میں عیش اڑا لو، بقول شاعر کہ۔

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوام نیست

جتنی عیش اڑانی ہے اڑا لو آگے کچھ نہیں ہے۔ تو تمدن و مدنیت اور تمدنی سامانوں کی افراط پیدا ہوئی۔ اس لئے جو لوگ اس تمدن کے موجد ہیں انہیں شاید بھول کے بھی موت کا خیال نہیں آتا۔ بھول کر بھی قبر یا آخرت کا کوئی تصور نہیں۔ ایک ہی تصور ہے کہ دنیا آنکھوں کے سامنے ہے، بس جس طرح چاہو اسے چلا لو۔ غرض ایک نظریہ تو یہ تھا اور

اس کا یہ اثر پڑا کہ دین ختم ہو گیا، دنیا رہ گئی۔ آخرت نگاہوں سے اوجھل ہو گئی، فقط دنیوی سامان سامنے رہ گئے۔
دوسرے نظریے کے دنیوی آثار...... دوسرا نظریہ یہ تھا کہ آخرت ہے اور وہی مقصود ہے۔ دنیا ایک راستہ ہے جس سے گزر کر جانا ہے۔ اس کا اثر یہ پڑا کہ نہ صرف یہ کہ تمدن اختیار نہ کرو۔ بلکہ جتنا جسم کو عذاب دو، جتنا اسباب عیش کو ترک کرو، جتنی رہبانیت اختیار کرو وہی آخرت بنانے والی ہے۔ تو بعض اقوام نے یہی کیا۔

چنانچہ ہم نے برما میں دیکھا کہ ان کے جو مذہبی پیشوا ہیں جنہیں "بھکشو" کہتے ہیں، وہ نہ گھر بناتے ہیں، نہ نکاح نہ شادی نہ بیاہ۔ بلکہ کھانا پینا بھی خود نہیں پکاتے، بھیک بھی نہیں مانگتے۔ ان کا کام یہ ہے کہ صبح کو وہ نکل گئے، قوم جانتی ہے کہ کھانے کے لئے آئے ہیں۔ تو ہر گھر میں کھانے سے پہلے ایک آدھ روٹی ان کے نام کی رکھ لی جاتی ہے اور کچھ سالن رکھ دیا۔ جہاں وہ آئے انہیں دے دیا۔ یہ ان کا کھانا ہے۔ پہاڑوں کی کھوہ میں رہتے ہیں۔ ایک دھوتی انہوں نے باندھ لی اور وہی اوڑھ لی۔ اور کہتے ہیں دنیا راہ گزر ہے۔ جتنا اس میں تکلف کیا جائے گا اتنا ہی آخرت فراموش ہو جائے گی۔ اور ہے اصل میں آخرت۔ بہر حال یہاں تمدن سرے سے ختم ہو گیا۔ پہلے نظریے کے تحت تو تمدن ہی تمدن رہ گیا تھا اور دوسرے نظریے کے تحت سرے سے تمدن ختم ہو کر دنیا لاشی، ہیچ اور فانی بن گئی کہ اس کے اندر ذرا سا بھی آرام کرنا یہ گویا آخرت کو کھو دینا ہے۔

عیسائیت اور دنیا...... عیسائیوں میں دیکھا گیا، ان کی تاریخ شاہد ہے کہ جتنا بدن کو تکلیف پہنچائی جائے اتنا ہی آخرت بنتی ہے۔ چنانچہ ان میں بعض رہبان دیکھے گئے، تاریخوں میں یہ موجود ہے کہ ایک گڑھا ہے اور اس میں گارا ہے اس میں پڑے برس گزارتے ہیں اور بڑی مکھیاں انہیں کاٹ رہی ہیں، بدن کے اوپر ورم چڑھا ہوا ہے۔ مگر وہ گارے کے اندر پڑے ہوئے ہیں اور سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم آخرت میں جا رہے ہیں، دنیا سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ شادی بیاہ سے غرض نہیں، مکان بنانے سے غرض نہیں۔ اگر گرجا میں کوئی عورت "نن" (NUN) بن کے گئی تو وہ یہ عہد کر کے جاتی ہے کہ نہ شادی کرے گی نہ بیاہ کرے گی۔ لذات دنیا سے اسے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ مرد جاتا ہے تو وہ عہد کر کے جاتا ہے نہ نکاح کرے گا نہ عورت اس کے گھر میں آئے گی، نہ گھر در ہوگا۔ غرض ایک نظریے کے تحت تمدن اتنا برپا ہوا کہ آخرت فراموش ہو گئی۔ اور ایک نظریے کے تحت تمدن اتنا مٹا کہ دنیا بے رونق ہو گئی۔ بس آخرت ہی آخرت پیش نظر ہے۔ وہ بنتی ہے یا نہ بنے، یہ الگ بات ہے۔ یہ دو متضاد نظریے ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا کوئی چیز نہیں ہے، آخرت ہی ایک چیز ہے۔ ایک یہ کہ جو کچھ ہے دنیا ہے، آخرت کوئی چیز نہیں ہے۔

اسلامی نقطۂ نگاہ...... اسلام نے یہ تعلیم دی کہ دنیا بھی ایک برابر کا عالم ہے، آخرت بھی ایک برابر کا عالم ہے۔ محض راہ گزر نہیں ہے کہ دنیا تو راستہ ہے، یہاں سے چل پڑو اور آخرت میں پہنچ جاؤ بلکہ فرمایا: "اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ." "دنیا آخرت کی کھیتی ہے، جیسا بیج ڈال دو گے، ویسا ہی پھل آخرت میں پاؤ گے تو دنیا گویا کھیتی کی جگہ ہے۔ انسان کا کام بیج ڈالنا ہے۔ اچھا بیج ڈالے گا، اچھا پھل نکل آئے گا، برا بیج ڈالے گا برا پھل۔

گندم از گندم بروید جوز جو   از مکافات عمل غافل مشو

گیہوں کا بیج ڈالو گے تو گیہوں اُگے گا، کیکر کا بیج ڈالو گے تو کانٹے دار درخت اُگے گا۔ سینڈھ کا بیج ڈالو گے بدبودار درخت اُگے گا۔ غرض جیسا یہاں کرو گے ویسا ثمرہ سامنے آ جائے گا۔ تو آخرت سے دنیا ملحق ہے، یہ نہیں ہے کہ دنیا کا تعلق آخرت سے نہیں اور آخرت کا تعلق دنیا سے نہیں۔

دنیا میں رہنے کا انداز...... اب یہ کہ دنیا میں کس طرح سے رہو؟ تو اسلام نے یہ نہیں بتلایا کہ تم پھٹے حال سے رہو، تم بھک منگے بن کر رہو، گھر گھر بھیک مانگ کر معاذ اللہ اپنا پیٹ پال لیا کرو۔ فرمایا: "اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلٰی." ① "اونچا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے"۔ مانگنے والا ہاتھ وہ کم رتبہ ہے اور عطاء کرنے والا ہاتھ بہتر ہے۔

اور فرمایا: "کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَةِ." ② "حلال مال کا کمانا ایسا ہی فرض ہے جیسا نماز روزہ فرض ہے"۔ آدمی کا فرض ہے کہ وہ کمائے، وہ مانگ کر نہ کھائے، بلکہ دس کو کھلا کر کھانے کے بھی قابل ہو اس درجے پر آئے۔ غرض مسلمان کوئی بھک منگا نہیں بنایا گیا، کوئی سائل بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ بھکاری بنے۔ بلکہ عطاء کرنے والا بنا کر بھیجا گیا کہ دنیا کی اقوام کو کچھ دے، ان سے مانگنے کا روادار نہ ہو بلکہ معطی بنے، عطاء کرے اور وہ چیزیں دے جس کی دنیا محتاج ہے۔ ان کو دین کی طرف دعوت دے، اس دین کی طرف جس میں دنیا بھی برابر کی ہے اور آخرت بھی برابر ہے۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ اَنْ یُّرٰی اَثَرُ نِعْمَتِهٖ عَلٰی عَبْدِهٖ" ③ اللہ اپنے جس بندے کو نعمت دے تو اسے یہ بھی پسند ہے کہ اس نعمت کا اثر بھی اس کے اوپر کچھ آنا چاہئے۔ کچھ ڈھنگ کا لباس ہو، کچھ ڈھنگ کا کھانا پینا ہو، ڈھنگ کا رہنا سہنا ہو۔ ڈھنگ سے ہو اور جمال کے ساتھ ہو۔ مبالغے کو تو روکا ہے کہ حدود سے مت گذرو۔ جیسے دین کے بارے میں فرمایا: "لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ." ④ "دین میں زیادہ مبالغے مت کرو کہ تحمل سے باہر ہو جائے۔ اتنا ہی عمل اختیار کرو جسے عمر بھر نبھا دو" اسی طرح دنیا کے بارے میں فرمایا کہ اتنا مبالغہ مت کرو کہ وہ آخرت کے بھلانے کا ذریعہ بن جائے۔ اتنی دنیا اختیار کرو کہ عیش و آرام سے گزر بسر کرو۔ دوسرے کو کھلا کر خود کھا سکو۔ یہ ضرور کرو۔ مگر اچھی آخرت کو مت بھلاؤ کہ دنیا میں اتنا منہمک ہو جاؤ کہ دل سے موت کا تصور ہی نکل جائے۔ اس سے روکا ہے۔ یہ غلو اور مبالغہ ہے۔

دولت و عبادت کا باہمی ارتباط...... حدیث میں فرمایا گیا (جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے) تم اس طرح

---

① الصحیح لمسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب بیان ان الید العلیا خیر من الید السفلیٰ ج: ۱، ص: ۳۳۲.

② شعب الایمان للبیهقی، الستون من شعب الایمان وهو باب فی حقوق الاولاد، ج: ۱۸، ص: ۱۲۶.

③ السنن للترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء ان اللہ تعالیٰ یحب ان یری، ج: ۱۰، ص: ۲۰.

④ پارہ: ۶، سورۃ النساء، الآیۃ: ۱۷۱.

زندگی بسر کرو اور زہد و قناعت کے یہ معنی سمجھو کہ جب دنیا سے جاؤ تو کوئی چیز پیچھے چھوڑ کے نہ جاؤ، (اور نہ یہ کہ) اولاد بھیک منگی ہو۔ فرمایا۔ "یہ بہتر نہیں ہے" ۔ یہ بہتر ہے کہ اپنی زندگی میں اولاد کے لئے کچھ سامان کرتے جاؤ۔

یہ جبھی تو ہوگا جب آدمی کچھ کمائے گا، کچھ دولت فراہم کرے گا، کچھ بچوں کے لئے چھوڑے گا، کچھ ان کی خدمت کرے گا، کچھ عزیز و اقرباء کی خدمت کرے گا۔ ہزاروں عبادتیں ہیں جو دولت پر موقوف ہیں۔ اگر آپ کے ہاتھ میں دولت نہیں، آپ زکوٰۃ کیسے دیں گے؟ تو ایک فرض سے محروم ہو گئے۔ آپ کے ہاتھ میں مال نہیں حج کیسے کریں گے؟ تو حج کی دولت سے محروم ہو گئے۔ آپ کے ہاتھ میں دولت نہیں تو غرباء کی خدمت کیسے کریں گے؟ تو عطایا سے آپ محروم ہو گئے غرض ہزاروں عبادتیں ہیں جو دولت پر موقوف ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ جو مساجد میں آپ نماز پڑھ رہے ہیں یہ بھی تو دولت پر موقوف ہے، دولت ہاتھ میں نہ ہوتی تو اتنی خوشنما مسجد کہاں سے بنتی؟ اللہ کا گھر اتنا آراستہ کیسے ہوتا؟ اور یہ بہترین قالین کی جانمازیں جسے دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے کہ اللہ کے گھر کو سجا رکھا ہے۔ یہ دولت ہی کا تو کرشمہ ہے۔ تو دولت پر نماز بھی موقوف، حج بھی موقوف، زکوٰۃ بھی موقوف اور صدقات بھی موقوف، ہزاروں عبادتیں ہیں جو دولت پر موقوف ہیں۔ اسلام جامع دین تھا وہ دولت کو حرام کیسے قرار دیتا؟ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ آدمی کو ساری عبادتوں سے محروم بناتا۔ اس واسطے اس نے حکم دیا۔ "کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَةِ" "حلال کی کمائی کرنا انسان کے اوپر ایسا ہی فرض جیسا نماز روزہ فرض ہے"۔

مقصد تو یہ ہو کہ میں کسی کا محتاج بن کے نہ رہوں اتنا کمائے، مگر اب اللہ برکت دے اور لکھ پتی بنا دے تو اس کی اجازت بھی نہیں دی کہ اس مال کو ضائع کر دو یا سمندر میں بہا دو۔ اس کو اس کے مصرف میں جائز اور حلال طریق پر خرچ کرو۔ غرض حلال ہی طریق پر کماؤ اور حلال طریق پر اسے صرف کرو تو یہ صرف کرنا اور کمانا یہ سب عبادت میں داخل ہوگا۔ اس لئے کہ یہ عبادت کا وسیلہ ہے۔

وسائل عبادت کا حکم ...... اور وسیلہ کا حکم وہی ہوتا ہے جو مقصد کا ہوتا ہے، جب مقصد عبادت ہے تو اس کا وسیلہ بھی عبادت ہے۔ آپ جو نماز پڑھ رہے ہیں اس کا وسیلہ وضو ہے اس لئے وضو بھی عبادت میں داخل ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وضو پر کوئی ثواب نہ ملے۔ البتہ نیت شرط ہے۔ بلانیت وضو کریں گے تو پاکی تو حاصل ہو جائے گی، نماز بھی جائز ہوگی، مگر وضو پر ثواب نہیں ملے گا۔ جب تک آپ یہ نیت نہ کریں کہ اس لئے وضو کر رہا ہوں کہ یہ نماز کا وسیلہ ہے، تو وضو بھی عبادت ہے اس لئے کہ نماز کا وسیلہ ہے۔

دنیا وسیلۂ آخرت ...... اسی لئے ساری دنیا مسلمان کے لئے دین کا وسیلہ بنائی گئی ہے۔ "اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ." ① "دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو"۔

① شعب الایمان للبیہقی، فصل فیما یقول العاطس فی جواب التشمیت، ج: ۲۲، ص: ۲، رقم: ۱۰۱۸۵۔ حدیث منقطع ہے۔ دیکھئے: تخریج احادیث الاحیاء ج: ۷ ص: ۲۶۲ رقم: ۳۱۸۷۔

تو دنیا آخرت کے لئے کماؤ- خدمت و اطاعت کے لئے۔ اور یہ ساری چیزیں عبادت میں داخل ہیں۔ غرض کمانا اور خرچ کرنا یہ سب طاعت میں داخل ہے، بشرطیکہ نیت صحیح ہو اور رضائے خداوندی مقصود ہو۔

اسی لئے قرآن کریم میں بعض آیتوں میں تو مذمت کی گئی ہے اور بعض میں مدح کی گئی ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا۔ ﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَ أَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ ① "یہ تمہاری اولادیں اور یہ تمہارے مال تمہارے لئے فتنہ ہیں اور آزمائش کی چیزیں ہیں"۔ تو اس سے ایک گونہ مذمت نکلی۔ دوسری جگہ حدیث میں ارشاد فرمایا۔ "نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ." ② "اچھے انسان کا اچھا مال وہ بہترین متاع اور بہترین پونجی ہے"۔ تو یہاں مال کی تعریف کی ہے۔ غرض ایک جگہ ہے مذمت اور ایک جگہ مدح ہے۔ مذمت اس لئے ہے کہ رضائے خداوندی اور جائز طریق پیش نظر نہ ہو۔ مدح اس لئے کہ رضائے خداوندی مقصود ہے اس کے لئے آدمی بڑھ رہا ہے اور اس کے دائرے میں رہ کر کما رہا ہے۔ وہ مال بھی مبارک اور کمانے والا بھی مبارک۔

اگر مال مطلقاً مذمت کی چیز ہوتی تو صحابہ رضی اللہ عنہم میں کوئی دولت مند نہ ہوتا۔ حالاں کہ ان میں لکھ پتی بھی ہیں، ان میں کروڑ پتی بھی ہیں، ہزار پتی بھی ہیں۔ اسی طرح ائمہ ہدایت کے اندر کروڑ پتی، لکھ پتی لوگ موجود ہیں۔

کروڑ پتی امام...... آپ ہی کے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جن کی فقہ پر آپ چل رہے ہیں، کے ہاں ریشمی کپڑے کی تجارت تھی اور یہ نہیں کہ کوئی ایک آدھ دکان لگی ہوئی ہو کہ ریشمی کپڑا فروخت ہو گیا، بلکہ کپڑے بنانے کے کارخانے تھے اور ملکوں میں کپڑا سپلائی ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے امام صاحب گویا کروڑ پتی تھے، حتیٰ کہ وفات ہوئی تو مورخین لکھتے ہیں کہ ان کے خزانے کے اندر کروڑوں روپیہ جمع تھا جس میں کچھ وصیتیں تھیں۔ ان میں سے کچھ اولاد پر تقسیم ہوا۔

تجارت میں امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی احتیاط...... بایں ہمہ کمانا بھی انتہائی حلال کا تھا۔ چنانچہ ان کے واقعات میں موجود ہے کہ امام صاحب نے ایک شخص کو تجارت کے لئے وکیل بنا کر بھیجا اور فرمایا مصر میں جا کر اس مال کو بیچو۔ اول تو اس شخص نے یہ کیا کہ بیچنے میں کچھ تاخیر کی کہ ذرا مانگ کچھ بڑھ جائے اور مال کچھ گراں ہو، تب بیچوں۔ چنانچہ مہینہ بھر روکے رکھا۔ مہینہ بھر کے بعد قیمت چڑھ گئی تو ایک لاکھ کے بجائے دو لاکھ کمایا، کافی نفع ملا۔

دوسرا اس نے یہ کیا کہ جب مانگ بڑھی تو اس نے ایک پیسہ فی روپیہ اس کی قیمت بڑھا دی۔ گاہک زیادہ تھے تو دو لاکھ کے اڑھائی لاکھ وصول ہوئے۔ یہ رقم لا کر امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خدمت میں پیش کی۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اندازہ یہ تھا کہ ستر، اسی ہزار روپیہ نفع ہوگا، وہاں اڑھائی لاکھ نفع سامنے آیا۔ فرمایا اتنا نفع کیسے ہوا؟

اس نے کہا، اول تو میں نے بیچنے میں تقریباً ایک ماہ کی تاخیر کی تاکہ کچھ مانگ بڑھ جائے، کچھ گرانی ہو جائے

---

① پارہ: ۲۸، سورۃ التغابن، الآیۃ: ۱۵.

② مسند احمد، حدیث عمرو بن العاص، ج: ۳۶، ص: ۱۶۵.

اور اس کے ساتھ میں نے ایک پیسہ فی روپیہ بڑھا دیا۔

فرمایا: ”نعوذ باللہ! پہلی صورت ”احتکار“ کی تھی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ تاخیر کروتا کہ گاہک مجبور ہو کر خریدے۔ تو گاہک کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا یہ حرام خوری ہے۔ غرض احتکار کیا جو شریعت میں ممنوع ہے کہ مال بیچنے میں اس لئے تاخیر کرو کہ اس کی قیمت زیادہ اٹھے گی۔ بلکہ اپنے وقت پر بیچو۔ عام طور سے جتنی قیمت ہے اس پر فروخت کر دو۔ مال کا انتظار میں رکھنا کہ قیمت چوگنی ہو جائے، شریعت نے اسے حرام قرار دیا ہے“۔ پھر فرمایا کہ ”ایک پیسہ فی روپیہ بڑھا کر تم نے غبن فاحش کیا، شریعت اس کی بھی اجازت نہیں دیتی“۔ فرمایا۔ ”اب یہ تو مشکل ہے کہ تمہیں اڑھائی لاکھ روپے دے کر بھیجوں کہ لوگوں کو واپس کرو، خدا جانے کوئی گاہک کہاں کا ہوگا کوئی کہاں کا؟ لہٰذا ایک پائی بھی میرے خزانے میں داخل نہ کی جائے۔ ابھی اس مال کو غریبوں پر صدقہ کر دیا جائے“۔ تو اڑھائی لاکھ روپیہ اسی وقت غریبوں میں تقسیم کر دے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ یہ کمائی کی صورت تھی کہ انتہائی احتیاط کے ساتھ فروختگی ہوتی اور مال کمایا جاتا۔

مصارف سے مداخل کا اندازہ...... جب جائز طریق پر مال آتا تھا اس کے بعد میں تو جائز ہی طریق پر خرچ بھی ہوتا تھا۔ جیسے حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ ”میں مال کے مصارف کو دیکھ کر مداخل کا پتہ چلا لیتا ہوں۔ جس جگہ صرف ہوتا ہے سمجھ لیتا ہوں کہ اگر یہ اچھی جگہ ہے تو آیا بھی اچھے طریق سے ہے۔ اگر حرام جگہ صرف ہو رہا ہے تو سمجھ لیتا ہوں کہ حرام ہی کی کمائی ہے۔ غرض مصرف دیکھ کر اس کے مدخل کو پہچان لیتا ہوں کہ یہ کس طرح سے آیا ہوگا“۔ غرض امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مال پاک اور انتہائی پاکیزہ طریق پر آتا تھا تو خرچ بھی ایسے راستوں میں ہوتا تھا۔

امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے علماء کرام کی تنخواہیں...... امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مجلس بنائی جس میں تقریباً چار، پانچ سو علماء کرام اور محض علماء نہیں بلکہ اپنے اپنے فن کے امام اس میں جمع کئے۔ کوئی تفسیر کا امام، کوئی حدیث کا امام، کوئی لغت کا امام اور کوئی فقہ کا امام۔ ان سب پر مشتمل مجلس بنائی اور فقہ کے مسائل مرتب ہونا شروع ہوئے۔ اجتہاد اور استنباط سے مسائل نکالے گئے۔ ایک مسئلہ اس مجلس میں پیش ہوتا اور ہفتوں اس پر بحث ہوتی۔ نکھر نکھرا کر جو آخیر میں نکھری ہوئی بات نکلتی ہو، مرتب کر کے لکھی جاتی کہ یہ قرآن و حدیث سے قریب تر ثابت ہے۔ یہی آپ کا فقہ حنفی ہے۔ تو ان چار، پانچ سو علماء کرام کی تنخواہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خزانے سے دی جاتی۔ کسی کے ایک ہزار ماہوار مقرر، کسی کے دو ہزار اور کسی کے تین ہزار اس طرح لاکھوں روپے ماہوار کا خرچ اس پر ہوتا تھا۔

امام ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا غرباء پر خرچ...... پھر یہ الگ تھا کہ صدقات و خیرات کے اندر کوفے کے جتنے گھرانے تھے، ان کی فہرستیں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں لکھی ہوئی تھیں کہ فلاں گھر میں اتنے بڑے

ہیں، اتنے بچے ہیں، اتنی عورتیں ہیں اور اتنے مرد اور غریب ہیں۔ بس روز روز کا کھانا پی لیتے ہیں اور پس انداز (بچا یا ہوا) اور پیچھے کچھ چھوٹا ہوا نہیں۔

ہر گھر میں جتنے افراد ہوتے اور کوفے کے اندر جتنے غریبوں کے گھر ہیں سب کے لئے لباس ان کی قدو قامت کے مناسب رمضان میں تیار ہوتے۔ عید کا چاند دیکھا گیا اور فجر کی نماز سے پہلے ہر گھر میں گھر کے افراد کی تعداد کے مطابق لباس پہنچ جاتا تھا۔ تو غرباء کہتے تھے کہ ہم غریب نہیں، ہماری عید بھی امیروں کی سی ہے۔ ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سلامت چاہئے۔ غرض یہ خرچ الگ تھا کہ کوئی غریب گھرانہ خالی نہ رہتا تھا کہ ان کی عید نہ ہو۔ اعلیٰ ترین لباس جتنا اس کے مناسب حال ہے پہنچتا تھا۔ تو علماء پر لاکھوں کا یہ خرچ تھا اور غرباء پر یہ خرچ تھا۔

ایک مقروض سے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معاملہ...... پھر اوپر سے قرض کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ قرض لیتے تھے۔ کسی کو پچاس ہزار کی ضرورت ہے تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ دے دیتے تھے تیس ہزار کی ضرورت ہے تو دے دیتے تھے۔

اس میں بعض لوگ ایسے بھی تھے کہ لینے کے بعد ان کی نیت بدل گئی، دینے کو جی نہ چاہا۔ چنانچہ ایک شخص نے پچاس ہزار کا قرض لیا۔ اب یا تو یہ کہ دینے کی قوت نہیں رہی تھی یا یہ کہ اتنی بڑی رقم کیسے واپس کروں۔ تو کترانا شروع کیا۔ دیکھا کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ آ رہے ہیں تو کسی گلی میں گھس گیا۔ پھر دیکھا کہ ادھر سے آ رہے ہیں تو دوسری گلی میں گھس گیا۔ سامنے نہیں ہوتا تھا، شرمندہ ہوتا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سمجھ گئے کہ اس کی نیت کچھ بدلی ہوئی ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ آ رہے تھے وہ دیکھ کر دوسری گلی میں گھسا۔ تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ لپک کر اسی گلی میں گھسے اور جا کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔

”بھائی! ہم نے کیا قصور کیا جو ہم سے کترانے لگے؟ ہم کوئی اچھوت اقوام میں سے ہیں کہ ہم سے کنارے کنارے چلو؟ آخر کیا وجہ ہے؟“ اب وہ چپ، کیا کہے دل میں چور تھا ہی۔ فرمایا: ایسا معلوم ہوتا ہے پیسے واپس کرنے کو جی نہیں چاہتا“۔ یہ نہیں فرمایا کہ پاس نہیں ہیں۔ وہ خود مالدار آدمی تھا۔ یہ فرمایا کہ قرض ادا کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ کترانے کی یہ وجہ ہے۔ فرمایا: مال بھی ایسی چیز ہے کہ اس کی وجہ سے تعلقات خراب کیے جائیں؟ پچاس کا پچاس ہزار روپیہ بالکل معاف۔ مگر تعلقات پہ پانی نہیں پھیرنا چاہئے۔ آمدورفت ویسی ہی جاری رکھنی چاہئے۔ بالکل معاف ہے۔ تمہیں ایک پائی بھی دینی نہیں پڑے گی“۔

سینکڑوں واقعات ہیں کہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں قرضے معاف کر دیئے۔ یہ سخاوت کا دریا جاری تھا۔ تو کمانا بھی انتہائی احتیاط کا اور خرچ کرنا بھی انتہائی احتیاط کا تھا۔

عبادتِ مالیہ کی توفیق کا معیار...... اس لئے شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ نے فرمایا کہ میں مال کے مصرف کو دیکھ کر اس کے آنے کے راستہ کا پتہ چلا لیتا ہوں، اگر مصرف صحیح ہے تو آیا بھی صحیح راستہ سے اور اگر مصرف غلط

ہے تو آیا بھی غلط راستے سے ہے۔

مال حرام بود بجائے حرام رفت

جو ناجائز یا غیر محتاط طریق پر کمایا جاتا ہے وہ خرچ بھی ایسے ہی مصارف پر ہوتا ہے، اس مال کے لئے صحیح مصارف میں خرچ کرنے کی توفیق نہیں ہوتی جو ناجائز طریق پر کمایا گیا ہو۔

اظہارِ نعمت کا موقع ...... بہر حال میرا مقصد یہ تھا کہ اسلام نے دنیا کو لاشی اور ہیچ نہیں قرار دیا کہ آخرت کو پیش نظر رکھو اور دنیا میں بھک منگے بن کے رہو، دنیا میں بالکل ژولید (پریشان) حال ہو کر رہو اور پھٹے حال سے رہو، یہ نہیں فرمایا بلکہ: ''اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ اَنْ یُّرٰی اَثَرَ نِعْمَتِہٖ عَلٰی عَبْدِہٖ.'' ① ''جس بندے کو اللہ نعمت دے تو اللہ کو یہ بھی پسند ہے کہ اس نعمت کا کچھ اثر آئے۔''

کچھ لباس ڈھنگ کا ہو، کچھ کھانا بھی ڈھنگ کا ہو۔ کچھ رہنا سہنا بھی ڈھنگ سے ہو۔ اور کچھ معاشرت بھی اچھی ہو۔ یہ نہیں کہ پھٹے حال سے رہے۔

شخصی احوال قابلِ اتباع نہیں ...... اب بعض کو یہ شبہ ہوگا کہ بعض احادیث و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اللہ نے تو ٹاٹ تک پہنا ہے۔ اچھے کپڑے چھوڑ دیئے۔ وہ ان کا حال قانون نہیں ہوتا۔ یہ قانون شریعت ہے، باقی کسی پر زہد و قناعت کا حال غالب آجائے اور وہ سارا مال دولت صدقہ کر کے قبرستان میں جا بیٹھے، وہ اس کا حال ہے۔ اسے برا نہیں کہا جائے گا۔ وہ اپنے حال میں مگن ہے لیکن اسے قانون نہیں بنایا جائے گا کہ دنیا کو اس کی دعوت دی جائے۔ دعوت اس چیز کی دی جائے گی جس کا شریعت اسلام نے حکم دیا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قانون غیبی پیش کیا، قانون وہی رہے گا۔ لوگوں کے احوال قانون نہیں بن سکتے، ان لوگوں کی عظمت کی جائے گی، انکی عزت کی جائے گی۔ ان کے اس فعل کو بڑا سمجھا جائے گا، مگر قانون نہیں بنایا جائے گا کہ اس فعل کی آپ تبلیغ کریں کہ فلاں نے سارا گھر چھوڑ دیا تھا لہٰذا تم بھی چھوڑ دو۔ غرض یہ قانون نہیں، شخصی حال ہے۔ آپ کے اندر وہ حال آجائے گا، آپ اس پر عمل کریں پھر کوئی روکنے والا نہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کی اتباع ...... بعض حضرات صحابہ رضی اللہ عنہ میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کو اپنا مذہب قرار دیا۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کی شان وہ ہے کہ کون ان کے قدم بہ قدم چل سکتا ہے؟۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سید الانبیاء ہیں، تو آپ کی زندگی اور بھی اونچی ہے اور بھی بڑھ کر ہے۔ اس لئے ہر ایک اس کے اوپر چل نہیں سکتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ گنے چنے ہیں جو اس شان پر چلے ہیں، جو خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی شان تھی اس لئے وہ شہروں میں نہیں رہ سکے۔

چنانچہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کا زہد و قناعت مشہور ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ

---

① السنن للترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء ان اللہ تعالیٰ یحب ان یری، ج: ۱۰، ص: ۲۰۲.

عنہ کا دورِ خلافت تھا۔ یہ شام میں گئے اور شام میں تمدن و تکلفات اور کھانا، پینا خوب تھا۔ وہ غرض تھوڑا ہی رہی تھی جو عربوں میں تھی۔

مکانات اور بلڈنگیں بھی ہیں کھانے پینے کی بھی متعدد چیزیں ہیں، لباس بھی عمدہ ہے۔ اب جس کے ہاں دیکھا کہ دستر خوان پر دو کھانے تھے، بس ڈنڈا لے کر وہاں پہنچے اور فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستر خوان پر کب دو کھانے آئے؟ ابھی صدقہ کرو، صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین ڈر کے مارے صدقہ کر دیتے تھے۔ کسی کے گھر میں ایک لباس کے علاوہ دوسرا جوڑا بھی موجود ہے، بس ڈنڈا لے کر پہنچ گئے کہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں دوسرا جوڑا کب تھا؟ تو تمہارے لئے رکھنا کب جائز ہے؟ یا کسی کے پاس کچھ پیسہ جمع ہو گیا، بس ڈنڈا لے کر پہنچ گئے کہ: "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کب دولت جمع تھی جو تم نے جمع کی، ابھی صدقہ کرو"۔ حتیٰ کہ لوگ عاجز آ گئے۔ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو لکھا گیا کہ: "انہوں نے ہماری زندگی تنگ کر دی۔ ہم قانون شریعت پر چلتے ہیں، قانون میں گنجائش ہے، تو سعات ہیں"۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی کی ایک جھلک ...... اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی تو بہت اعلیٰ عزیمت کی زندگی ہے۔ کس کی مجال ہے کہ ہو بہو اس کی پیروی کر سکے۔ ہر ایک کی قوت نہیں۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو یہ ہے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: "مغرب کی تکبیر ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مصلے پر تھے، تکبیر ہو چکی نماز شروع کرانے سے پہلے ایک دم گھبرا گئے اور گھر میں تشریف لے گئے اور تھوڑے سے وقفے کے بعد تشریف لائے اور مغرب کی نماز پڑھائی"۔ صحابہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ! "آج خلافِ عادت تکبیر کے بعد کچھ وقفہ کیا، گھر میں تشریف لے گئے پھر واپس تشریف لائے، کچھ دیر لگی کیا وجہ پیش آئی؟ فرمایا: مجھے یاد آیا کہ میرے گھر کے طاق میں ایک دینار پڑا ہے اور نبی کے لئے جائز نہیں ہے کہ اس کے گھر پر رات گزرے اور سونا، چاندی اس کے گھر میں ہو"۔ وہ ایک دینار تھا جو سات درہم کا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے ہمارے لحاظ سے دو ڈھائی روپے کا سونا تھا۔ فرمایا: "جا کے اسے صدقہ کیا، گھر کو اس سے پاک کیا تب آ کر میں نے نماز پڑھائی نبی کے لئے زیبا نہیں ہے کہ نبی کے گھر پر رات گزرے اور سونا یا چاندی اس کے گھر میں ہو"۔ ① تو آج کون ہے جو اس ذاتی چیز پر عمل کرے کہ بیوی کا سارا زیور لے کر ابھی صدقہ کرے، جو کچھ تجوری میں رکھا ہے سب غریبوں کو بانٹ دے۔ یہ کس کی مجال ہے اور کس کی ہمت ہے؟

توسعاتِ شریعت ...... شریعت نے جب اجازت دی کہ زکوٰۃ دے دو، صدقات دے دو، بقیہ مال تمہارے لئے حلال ہے، عام لوگ تو اسی پر چلیں گے۔ اب یہ کیفیت کہ ایک پائی گھر میں نہ رہے، یہ جب حال ہوگا کیفیت

① السنن للنسائی، کتاب السهو، باب الرخصة للامام فی تخطی رقاب الناس، ج:۵، ص:۱۹۱.
حدیث صحیح ہے۔ دیکھئے: صحیح وضعیف سنن النسائی، ج:۳ ص:۹ رقم:۱۵۰۹.

ہوگی اور حال کسی کا حجت نہیں بنا کرتا، وہ قانون نہیں بنا کرتا، حجت قانون شریعت ہے۔ ہاں اللہ تمہیں وہ حال دے دے سبحان اللہ! تم یہ کام کرو، تمہاری بھی تعظیم کریں گے، لیکن تم قانون بنا کر اس کو اسٹیج پر پیش کرنے لگو کہ سارے گھر کی چیزیں ابھی صدقہ کر دو یہ جائز نہیں ہوگا، بلکہ یہ قانون کا مقابلہ ہوگا۔ بہر حال شرعی توسعات الگ چیز ہیں اور لوگوں کے ذاتی احوال الگ چیز ہیں، ہر کس و ناکس کے لئے جو پیغام ہوگا وہ شریعت کا قانون ہوگا۔ حال اس کے لئے حجت ہوگا جو صاحب حال ہے، وہ عمل کرے، اس کی عظمت کی جائے گی۔

اتباع بلا حال...... ورنہ ایسا ہی ہو جائے گا جیسا کہ ایک شیخ طریقت جن کے بہت سے مرید تھے۔ شیخ بیمار ہوئے اور اطباء نے کہا اگر آپ نے وضو کیا تو بیماری بڑھ جائے گی یا کھڑے ہونے کی قوت نہیں تھی، تو شریعت نے اجازت دی ہے، انہوں نے بیٹھ کر نماز پڑھی۔

اگلے دن مریدین نے اعلان کیا کہ شیخ نے بیٹھ کر نماز پڑھی ہے لہٰذا آج سے سب لوگ بیٹھ کر نماز پڑھا کریں گے اور قیام جو فرض تھا وہ ترک کر دیا۔ یہ حرکت کی جو بالکل ناجائز تھی۔

اس لئے کہ فعل میں نقالی کی۔ نقالی فعل جو غیر کی ہوتی ہے نہ کہ لوگوں کے فعل کی۔ پھر یہ کہ اگر نقل اتارنی تھی تو شیخ کی سی بیماری کا حال بھی اپنے اندر پیدا کرتے اتنی بیماری آنی چاہئے تھی، جو شیخ پر آئی تھی تو انہیں بھی بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت ہوتی۔ بیماری تو نہ ارہے کئے اور فعل میں شیخ کی نقل اتاری۔ تو ایسی نقالی محض روپ بنانا ہے۔ حقیقت اس کے نیچے کچھ نہیں ہے۔ اس لئے شرعی قانون ہی سب کے لئے حجت ہے۔ اسی پر عمل کیا جائے گا۔ اسی پر چلا جائے گا۔

تعظیم صاحب حال...... البتہ صاحب حال کی تعظیم کی جائے گی۔ اس پر کوئی ملامت نہیں کی جا سکتی، اللہ ویسا حال سب کو نصیب کر دے تو وہ خوش نصیبی ہوگی۔

توسعات شریعہ کا دائرہ کار...... بہر حال شریعت اسلام نے وسعتیں اور گنجائش دی ہیں۔ صرف یہ کہا ہے کہ ایک تو حرام کے دائرے میں مت پڑو، حلال کے دائرے میں رہو۔ دوسرے یہ کہ سامانوں میں مبالغہ مت کرو، اتنا رکھو کہ زندگی بھی آراستہ ہو اور اچھی ہو اور قلب بھی اٹکا ہوا نہ ہو۔ یہ نہ ہو کہ آدمی ان سامانوں کا بندہ بن جائے۔ ایسے شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا دی ہے۔ فرمایا: "تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ تَعِسَ عَبْدُ الدِّينَارِ تَعِسَ عَبْدُ الْخَمِيصَةِ." ①

"برباد ہو پیسے کا بندہ، برباد ہو گنی یا درہم مراد (سونے کا سکہ) کا بندہ، برباد ہو شالی چادروں کا بندہ"۔

یعنی جس کا دل ان چیزوں میں اٹکا ہوا ہے کہ ان میں پڑ کر نہ موت یاد نہ آخرت یاد نہ فرائض یاد۔ ایسی دولت تو وبال جان ہو جائے گی۔ تو ایسے آدمی کو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا دی ہے۔ لیکن جائز حدود میں رہ کے "جمال پسندی" جو انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ پھٹے حال سے رہنا پسند نہیں کرتا، بلکہ خوبصورتی کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ کھانا زمین پر ڈال کے اور منہ لگا کے کھا لے بلکہ رکابی ہو، پھر رکابی ذرا نفیس اور دیکھا اچھی بھی

① السنن لابن ماجه، کتاب الزهد، باب في المكثرين ج: ۱۲ ص: ۱۶۳.

ہو، دیکھنے والوں کی نظر میں نہ چبھے۔ تو تھوڑا بہت جائز حد تک تکلف بھی کرلیں تو کوئی مضائقہ نہیں، البتہ مبالغہ کرے کہ صبح کی رکابیاں اور ہوں، شام کی اور ہوں دوپہر کی اور۔ اسی طرح رات کے سونے کا لباس اور، دوپہر کا اور یہ تو لباس کی اور برتن کی بندگی ہے حالاں کہ بندگی اسے اللہ کی کرنی تھی۔

دولت دنیا کی مدح وذم کا معیار...... بہرحال مطلب یہ ہے کہ دولت دنیا کی مذمت بھی آئی ہے اور مدح بھی آئی ہے، اس دنیا کی مذمت آئی ہے جو آخرت سے غافل کردے اور اس دنیا کی مدح آئی ہے جو آخرت تک پہنچانے کا ذریعہ بن جائے۔ اسی لئے عارف رومیؒ نے مثال دی ہے کہ جیسے ایک سمندر ہے تو کشتی جب اس میں پڑی ہوئی ہو تو پانی اگر کشتی سے باہر باہر ہے تو کشتی کے لئے مددگار ہوگا۔ کنارے پر جالگائے گا اور منزل آجائے گی۔ لیکن اگر پانی کشتی کے اندر آگیا تو کشتی بھی ڈوبی اور کشتی والے بھی ڈوبے، دونوں کی تباہی ہے۔

اسی طرح فرمایا کہ انسانی قلوب کشتیوں کی شکل ہیں اور دنیا کی دولت اور سامان مثل دریا اور سمندر کے ہیں۔ تو قلب سے جب تک دولت باہر رہے گی، وہ قلب کو کنارے تک پہنچانے کا ذریعہ بنے گی اور اگر اندر آگئی تو قلب بھی ڈوبا اور قلب والا بھی ڈوبا۔

استعمالِ دنیا...... مطلب یہ کہ ایک دنیا کا استعمال ہے، اس کی شریعت نے ممانعت نہیں کی۔ ایک دنیا کی محبت ہے کہ اس میں پڑ کر محبت خداوندی رہ جائے، محبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم رہ جائے اس کی مذمت کی گئی ہے۔

محبت طبعی...... پھر یہ بھی ہے کہ قرآن کریم نے توسع کردیا ہے، یہ نہیں فرمایا کہ مال کی محبت بالکل نکال دو، یہ تو طبعی بات ہے کہ جب آدمی کمائے گا تو کچھ نہ کچھ اپنے مال سے محبت ہوتی ہے، اپنے گھر سے محبت ہوتی ہے، اپنے سامان سے بیوی بچوں سے محبت ہوتی ہے۔ بالکل محبت نکالنا انسان کے بس میں نہیں ہے۔

یہ تو طبیعت کا تقاضا ہے کہ جو چیز انسان کے پاس ہے اس سے تھوڑی بہت محبت ہو جاتی ہے، اجنبی بھی اگر پڑوسی بن جائے اور چند دن رہنا سہنا ہو تو آپس میں محبت ہو جاتی ہے، تو اپنے گھر اور مکان سے تو طبعاً محبت ہوگی تو قرآن کریم نے اس کی اجازت دی ہے۔

کیوں کہ ایک مطلقاً محبت ہوتا ہے، یہ ممنوع نہیں ہے۔ ایک ہے ایسی محبت ہونا جو فرائض اور واجبات میں حارج ہو جائے، اس سے بچو، چنانچہ ایک جگہ فرمایا: ﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ ۨ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ﴾ ①

"حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبی کریم! (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں سے فرما دیجئے یہ تمہارے آباء و اجداد، یہ تمہاری آل واولاد، یہ تمہارے عزیز واقارب اور تمہارے بیوی اور بچے، یہ تمہاری دولت اور مال تجارت جس کی

① پارہ: ۱۰، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۲۴۔

کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو کہ بازار مندا نہ ہو اور رات دن جوڑ توڑ میں ہو کہ نفع زیادہ ہو اور یہ تمہاری بلڈنگیں اور مکانات جن کے اندر تم راحت اٹھاتے ہو۔ یہ سب چیزیں اگر ''احب'' بن جائیں اور اتنی محبوب بن جائیں کہ خدا اور رسول سے غفلت پیدا کریں، تو عذاب خداوندی کا انتظار کرو کہ یہ دولت چھننے والی ہے''۔ لیکن اگر یہ نہ ہو کہ ''احب'' نہیں بلکہ مطلق محبت ہے تو وہ فطری اور طبعی ہے، اس کو شریعت نے نہیں روکا کہ فطرتاً اپنے مال اور گھر بار سے تھوڑی بہت محبت تو ہوگی، تو مطلق محبت کو منع نہیں کیا، احبیت کو روکا ہے۔ ''احب'' ہونے کے یہ معنی ہیں کہ مجھے صرف یہ محبوب ہے، نہ خدا محبوب نہ رسول محبوب نہ فرائض محبوب، نہ واجبات۔ اس محبت کو روکا ہے۔ لیکن اگر اتنی محبت ہے جو طبعی ہے اور ساتھ میں دین کی محبت بھی دل کے اوپر چھائی ہوئی ہے کہ دولت بھی ہے اور ساتھ میں نمازیں بھی پڑھ رہا ہے۔ روزے بھی رکھ رہا ہے، حج بھی کر رہا ہے، اور ذکر میں بھی مصروف ہے، یہ دولت ممنوع نہیں نہ اس کی فی الجملہ محبت ممنوع ہے۔

دولت دین و دنیا...... خدا کا شکر ہے کہ ہم افریقہ میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دولت دین بھی دی اور دولت دنیا بھی دی ہے، تجارتیں بھی ہیں، منافع بھی ہیں، گھر بار بھی اچھے ہیں، پہننا، رہنا سہنا اچھا ہے اور اس کے ساتھ میں مساجد بھی ہیں اور نمازیں بھی ہیں۔ بلکہ مساجد کو اتنا آراستہ کیا ہوا ہے کہ شاید لوگوں نے اپنی کوٹھی بنگلوں کو بھی اتنا نہ سجایا ہو۔ قالینوں کی جانمازیں بچھی ہوئی ہیں۔ راحت کا ہر سامان موجود ہے، جتنا اپنے گھر کی فکر ہے اس سے زیادہ اللہ کے گھر کی فکر ہے کہ وہ بھی آراستہ ہوں اور سجے سجائے ہوں۔

اللہ میاں کے بنگلے...... میں نے تو یہاں آ کر کہا کہ مسجدوں کو اللہ کا گھر کہا جاتا ہے، میں نے کہا یہ اللہ کے گھر نہیں یہ تو اللہ میاں کے بنگلے ہیں، آراستہ پیراستہ قالینوں سے سجے ہوئے۔ بجلی کی روشنی اور چھتیں بھی منقش اور آراستہ۔ یہ گھر تھوڑا ہی ہیں۔ گھر تو ہم جیسوں کے ہوتے ہیں، یہ تو بنگلے ہیں۔

ہمارے ہاں جو مسجدیں ہیں وہ تو اللہ میاں کے گھر ہیں۔ یہاں جو مسجدیں ہیں وہ اللہ میاں کے بنگلے ہیں، جو بنگلے بنانے والے ہیں وہ اپنے لئے بنگلہ بنالیں تو ان کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے، کوئی مضرت نہیں ہے۔ جو اللہ کے گھر کو سجا رہے ہیں وہ تھوڑا بہت اپنے گھر کو بھی سجالیں، اس میں کیا حرج ہے۔ اس طرح اپنے لباس کو بھی سجا لیں، اللہ کے گھر میں قالین بچھائے۔ اگر اپنے گھر میں بھی قالین بچھالیں تو اس میں کیا حرج ہے۔ بس یہ ہے کہ مبالغہ نہ ہو اور اتنا تعلق نہ ہو کہ اس سے دینی کاموں میں خلل پڑیں گے۔ ورنہ اگر یہ چیزیں بھی ممنوع ہوتی ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہ میں ایک بھی متمول نہ ہوتا۔ حالانکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مال دار لوگوں میں سے ہیں، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بڑے مال دار صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں۔

حضرت جابر کا تمول اور قلبی کیفیت...... مگر قلب کی کیفیت کیا ہے؟ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دن گھر میں تشریف لائے، کچھ اداس، غمگین اور چہرہ اترا ہوا۔ تو بیوی نے پوچھا آج آپ غمگین کیوں ہیں؟

فرمایا: ”خزانے میں دولت اتنی جمع ہوگئی ہے کہ میرے دل کے اوپر بار پڑ رہا ہے اور میرا قلب پریشان ہو رہا ہے“۔ وہ بھی صحابیہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ انہوں نے کہا پھر آپ نے کیا کیا۔؟ فرمایا: ”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا“۔ فرمایا: ”گھبرانے کی کیا ضرورت ہے، صدقہ کرنا شروع کردو، غریبوں کو دینا شروع کردو“۔ فرمایا: ”واقعی تدبیر تو اچھی بتائی“۔ چناں چہ جا کر خزانچی کو حکم دیا کہ تقسیم شروع کردو۔ صبح کو جو حساب لگایا تو رات بھر میں غرباء کے اوپر چھ لاکھ روپیہ تقسیم ہوا۔ صبح کو آکر بیوی کے ہاتھ چومے کہ اللہ تجھے جزائے خیر دے کیسی اچھی تدبیر بتائی، میرا دل ہلکا ہوگیا۔ تو اتنے دولت مند بھی تھے، مگر قلب متوجہ الی اللہ تھا، زیادہ دولت بڑھتی تھی تو ان کے دل پر بار پڑتا تھا۔ ہمارے ہاں کم ہو جائے تو دل پر بار پڑتا ہے۔ زیادہ ہو تو خوشی ہوتی ہے۔ وہاں قصہ الٹا تھا اور واقعہ بالکل برعکس تھا۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا مال کے بارے میں انوکھا جھگڑا...... حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے دوسرے صحابی سے زمین خریدی۔ قیمت ادا کردی زمین قبضے میں آگئی عمارت بنانے کے لئے جو بنیاد کھودی تو ایک بہت بڑا دیگچہ نکلا جس میں سونا اور چاندی بھرا ہوا تھا۔ گویا لاکھوں روپے کا مال نکلا۔ اسے لے کر ان کے ہاں پہنچے جن سے زمین خریدی تھی۔ اور فرمایا: ”یہ آپ کا دیگچہ ہے؟“ انہوں نے کہا:

”کیسا دیگچہ ہے“۔ فرمایا: ”وہ جو زمین میں نے خریدی تھی اس میں سے نکلا ہے اور میں نے زمین خریدی تھی، دیگچہ تھوڑا ہی خریدا تھا۔ یہ آپ کا حق ہے“۔ انہوں نے کہا: ”جب میں نے زمین بیچی تھی، زمین میں تحت الثریٰ تک جو کچھ تھا وہ سب بیچنے میں آگیا، لہٰذا یہ آپ کا حق ہے میرا حق نہیں“۔ اب لڑائی اس پر ہو رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کا حق ہے۔ انہوں نے کہا نہیں میرا حق نہیں یہ آپ کا حق ہے۔ آخر کو وہ مقدمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گیا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم دونوں کی کوئی اولاد ہے؟“۔ تو ایک کے ہاں بیٹا اور ایک کے ہاں بیٹی تھی۔ فرمایا ”دونوں کی شادی کردو اور اس میں اس دولت کو خرچ کردو! بس سکون ہوگیا“۔ ①

ہمارے ہاں تو اس پر لڑائی ہوتی ہے کہ میرا حق ہے تمہارا نہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرا حق ہے۔ وہاں لڑائی اس پر تھی کہ آپ کا حق ہے میرا نہیں۔ دوسرے کہہ رہے ہیں آپ کا حق ہے میرا نہیں۔ ان میں اور ہم میں فرق ہے۔ دولت مند وہ بھی تھے ہم بھی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ان کے دل دولت کے ساتھ اللہ رب العزت میں اور محبت دین میں فانی تھے۔ ہمارے قلوب میں وہ بات نہیں ہے۔ لیکن اس حد تک کہ اگر تھوڑی بہت محبت ہو اور دین کی محبت زائل نہ ہو، شریعت نے اجازت دی ہے کہ جمع بھی کرلو اور خرچ کرلو۔ کھاؤ اچھا کھاؤ پہن لو، کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

دنیا آخرت کی کھیتی ہے...... بہرحال مطلب یہ ہے کہ جو آیت میں نے پڑھی تھی تو اس کے ضمن میں یہ عرض کیا تھا کہ ایک نظریہ تو یہ ہے کہ دنیا کا راستہ اور ہے اور ختم ہو جانے والا ہے اور ہمیں تو گزر جانا ہے۔ چاہے چوراہے میں پڑ کے گزرے، چاہے میلے میں پڑ کے گزرے، چاہے بھیک مانگ کے گزرے، بس آخرت میں پہنچ جائیں

① الصحیح للبخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب حدیث الغار، ج: ۱۱، ص: ۲۹۱.

گے، اس کا نام تو رہبانیت ہے اور سرے سے دنیا کی حیثیت ختم ہے، اگر اس مذہب پر دنیا چلتی ہے تو ویران ہوتی ہے اور جگہ جگہ ویرانی کے اثرات ہوتے، دنیا آباد نہ ہوتی۔

اسی طرح یہ نظریہ بھی صحیح نہیں ہے کہ آخرت کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہے بس دنیا ہے۔ لہٰذا حلال و حرام کی تمیز نہ کرو، بس کھاؤ ماڑاؤ، عیش کرو اور مزے کرو۔ اس کا بھی شریعت اسلام نے رد کیا ہے۔ اور یہ بتلایا ہے کہ: "اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ" ① "دنیا آخرت کی کھیتی ہے"

جیسا بیج ڈال دو گے، ویسا ہی آخرت میں پھل کمالو گے، اگر دولت کا بیج پاک مصرف میں ڈالا ہے تو وہاں پاک ثمرات اور پاک پھل نمایاں ہوں گے۔ ناپاک جگہ میں ڈالا ہے، بیج بھی ناپاک اور وہاں کانٹے دار درخت ملیں گے اور "زقوم" ملے گا جس کا تحمل کرنا مشکل ہوگا، یوں کہ وہ عذاب کی صورت اختیار کرے گا۔

غرض دنیا کو نہ تو راستہ بتلایا کہ بھئی! مسافر کی طرح گزر جاؤ نہ کماؤ نہ دھماؤ اور نہ ہی اصل قرار دیا بلکہ کھیتی قرار دیا جس میں "بونا" ضروری ہے۔

کاشتکار کا فریضہ...... ظاہر بات ہے کہ جب کاشتکار بوئے گا تو کچھ نہ کچھ محنت تو کرنا پڑے گی۔ خون پسینہ ایک رنگ بھی کرنا پڑے گا بیج بھی ڈالنا پڑے گا، پانی بھی دینا پڑے گا، اچھی خاصی محنت اٹھانا پڑے گی۔ تب جا کے وہ چھٹے مہینے غلہ کمائے گا اور اس سے پھر پیسہ کمائے گا۔ غرض دنیا کو فرمایا یہ کھیتی ہے اور تم کاشتکار ہو۔ کاشتکار کا یہ کام نہیں ہے کہ گھر پر پڑا رہ جائے، ورنہ پھر لوگ غلے لے آئیں گے تو وہ بیٹھ کر روئے گا اور کہے گا کاش! بیج ڈالتا تو میں بھی غلہ کماتا، اس وقت حسرت میں مبتلا ہوگا۔ لہٰذا حکم دیا کہ دنیا میں رہو اور کچھ کام کرو۔

مقامِ آخرت...... اور اس دنیا ہی سے اپنی آخرت پیدا کرو۔ اس لئے یہ تصور نہیں ہونا چاہئے کہ دنیا یہ عالم ہے اور آخرت ساتویں آسمان پر کھی ہوئی ہے۔ بلکہ آپ کی آخرت اسی دنیا میں سے نکلے گی، نکالتے رہو۔ انہی اقعال میں سے نکلے جو ادا کر رہے ہو، نیت اچھی ہونی چاہئے، اتباعِ سنت ہونا چاہئے، اسی دنیا میں سے آخرت پیدا ہو گی۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ آدمی دسترخوان پر بیٹھے "بِسْمِ اللّٰهِ" سے شروع کرے اور "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ هٰذَا وَرَزَقْنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّةٍ" پر ختم کرے: "غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ." ② "اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے"۔ تو کھائی تو روٹی اور گناہ بخش دیئے گئے تو اس روٹی میں سے ہی آخرت نکلی۔ اگر روٹی نہ کھاتا اور سنت طریق پر حمد و ثناء سے ابتداء و انتہاء نہ کرتا تو یہ مغفرت گناہ کا وعدہ کہاں سے ہوتا۔؟ تو روٹی میں سے آپ کی آخرت نکلی۔

---

① علامہ عجلونی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں: قال فی المقاصد لم اقف علیه مع ایراد الغزالی له فی الاحیاء، وقال القاری: قلت معناه صحیح مقتبس من قوله تعالٰی "من کان یرید حرث الآخرة نزد له فی حرثه" دیکھئے: کشف الخفاء ج: ۱ ص: ۴۱۲۔ ② السنن للترمذی، کتاب الدعوات، باب مایقول اذا فرغ من الطعام، ج: ۱۱ ص: ۳۵۹۔

اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: اگر کوئی شخص شفقت ومحبت اور پیار سے یتیم کے سر پر ہاتھ رکھ دے تو جتنے بال ہاتھ کے نیچے آئیں گے اتنی نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔ ① دیکھا جائے تو یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنا تو ایک دنیوی فعل ہے۔ مگر نیت کی سچائی سے نیکیوں کے اضافے کا ذریعہ بن گیا۔ اگر یتیم کے سر پر ہاتھ نہ رکھتا یا اسے دین نہ جانتا تو بالوں کے برابر نیکیاں کہاں سے آتیں؟۔ تو یتیم کے سر میں سے آپ کی آخرت نکلی اور آپ کے ہاتھ میں سے آخرت نکلی۔ آپ یہ ہاتھ یتیم کے سر پر نہ رکھتے تو نیکیوں میں یہ اضافہ نہ ہوتا۔

حدیث میں فرمایا گیا اگر کسی شخص نے اللہ کی راہ میں صدقہ کیا اور ''زوج'' (جوڑا) بنا کے صدقہ کیا، یعنی پیسہ دیا تو ایک نہیں بلکہ دو دیئے، روپیہ دیا تو ایک نہیں بلکہ دو دو، کپڑا دیا تو ایک نہیں بلکہ دو دیئے: ''مَنْ اَنْفَقَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ زَوْجَيْنِ'' ② ''ہر چیز میں سے جس نے جوڑا جوڑا صدقہ دیا''۔ تو فرماتے ہیں جنت کے آٹھوں دروازے اس کے لئے کھلے ہوتے ہیں، جس میں سے چاہے داخل ہو جائے۔ تو دنیا میں دو چیزوں کا یعنی جوڑے کا صدقہ کیا، اس سے ہی تو آخرت بنی، تو آخرت آپ کے فعل سے نکلی، آخرت کہیں الگ تو نہیں رکھی ہوئی تھی۔ بہر حال دنیا آخرت کے کمانے کا ذریعہ ہے اور اس دنیا ہی میں سے آپ کی آخرت نکلے گی۔

تجارت میں نکلی آخرت..... آپ تجارت کر رہے ہیں، نیت صاف رکھیں۔ یہ تجارت آخرت کا ذریعہ بنے گی، چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا: ''اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ'' ③ ''ایک سچا تاجر جو امانت دار ہو اس کا حشر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوگا جنت میں ان کے ساتھ جائے گا'' کتنی بڑی فضیلت ہے۔ اگر دیانت کے ساتھ تجارت نہ کرتے تو یہ فضیلت ان کو کیسے ملتی؟ اسی طرح حدیث میں فرمایا گیا: ''غَفَرَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ كَانَ قَبْلَكُمْ سَهْلًا إِذَا اشْتَرٰى سَهْلًا وَإِذَا بَاعَ سَهْلًا.'' ④ ''اللہ اس شخص پر مغفرت اور رحم کرے جو شفقت کے ساتھ خریدتا ہے اور شفقت کے ساتھ بیچتا ہے'' بیچنے میں اس کا جذبہ یہ ہے کہ میرے گاہک کو نقصان نہ ہو۔ گاہک خریدتا ہے تو اس کا جذبہ یہ ہے کہ میرے تاجر کو نقصان نہ پہنچے۔ دونوں کے دل میں نیک جذبہ ہے تو دونوں کے لئے دعا دی کہ: غَفَرَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ ''اللہ اس کی بھی مغفرت کرے جو رحم دلی سے بیچ رہا ہے اور اس کی بھی مغفرت کرے جو رحم دلی سے خرید رہا ہے''۔ اگر یہ تجارت نہ ہوتی تو یہ آخرت کا وعدہ آپ کے لئے کہاں سے پورا ہوتا۔؟ اسی میں سے تو آخرت نکلی ہے۔ یہ نہیں کہ آخرت کہیں عرش کے نیچے چھپی ہوئی ہے اور دنیا یہاں ہے۔ اسی دنیا میں آخرت چھپی ہوئی ہے، نکال لینا آپ کا کام ہے جیسے اسی زمین کے اندر یہ پھل پھول

---

① مسند احمد، حديث ابى امامة الباهلى، ج: ۴۵، ص: ۱۲۷، رقم: ۲۱۱۳۲.

② المعجم الكبير للطبرانى، باب الجيم، ابوذر غفارىؓ، ج: ۲، ص: ۲۱۰.

③ الجامع للترمذى، ابواب البيوع، باب ماجاء فى التجار، ج: ۱، ص: ۲۲۹.

④ السنن للترمذى، كتاب البيوع، باب ماجاء فى استقراض البعير، ج: ۵، ص: ۱۵۹.

چھپے ہوئے ہیں، نکال لینا کاشتکار کا کام ہے کہ بیج ڈالتا رہے، پانی ڈالتا رہے پھل نکالتا رہے۔ اگر وہ یہ سمجھتا کہ یہ تو زمین ہے اور یہ جو پھلوں کی دنیا ہے کہ یہ آسمان پر رکھی ہوئی ہے۔ وہاں سے پھل برسیں گے تو کبھی بھی اسے پھل نہیں ملیں گے، اسی زمین پر محنت کرنی پڑے گی۔ تو انسان دنیا میں اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ رو کر کے پس پشت ڈال دے بلکہ اس سے اپنی آخرت کا کام لے۔ ہر چیز سے کام لے۔ حیات سے بھی کام لے، موت سے بھی کام لے۔

موت میں مخفی آخرت...... چنانچہ جب انسان کا کوئی عزیز گزر جاتا ہے تو طبعی طور پر آدمی کو صدمہ پیش آتا ہے۔ لیکن دانش مند وہ ہے جو اس صدمے سے اپنے لئے اجر نکال لے، وہ یہ ہے کہ نہ تو جزع فزع کرے نہ بین کر کے روئے نہ یہ کہ بالکل پتھر ہو جائے کہ اس کی آنکھ سے آنسو تک نہ نکلے، قلب کی سلامتی کے ساتھ جتنا طبعی غم ہے وہ ہو، اور عبرت پکڑے کہ جہاں آج یہ گیا ہے مجھے بھی کل کو جانا ہے۔ اس کی موت کو اپنی موت کی یادگاری کا ذریعہ بنائے تو اس کی موت دین کی ترقی کا ذریعہ بن گئی۔ اگر یہ میت نہ ہوتی تو اسے یہ اجر کیسے ملتا؟

حدیث میں ہے کہ: ایک بڑھیا کا جوان بیٹا مر گیا، وہ واویلا کر رہی تھی۔ سر کے بال نوچ رہی تھی کہ ہائے ہائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گزرے۔ فرمایا: ”بڑی بی! صبر کرو“۔ بڑی بی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اس نے کہا:

”ہاں! تم نے یہ کہہ دیا کہ صبر کرو، تمہارے گھر میں یہ آفت آتی جب میں جانتی تم صبر کرتے، مجھے صبر کرانے کے لئے آئے ہو؟ میں نہیں صبر کر سکتی“۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”اچھا تو جان!“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے تشریف لے گئے۔ اگلے دن اس کو پتہ چلا کہ وہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ تب حاضر ہوئی اور عرض کیا: ”یا رسول اللہ! مجھے خبر نہیں تھی کہ آپ ہیں، آپ نے صبر کی تلقین فرمائی تھی۔ میں اب صبر کرتی ہوں“۔ آپ نے ارشاد فرمایا: ”اَلصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْأُوْلٰى.“ ① ”جب صدمہ پیش آیا تھا، جب صبر کرتی تو اجر ملتا“۔ یوں تو دو چار برس کے بعد خود بخود ہی صبر آ جاتا ہے۔ کوئی ساری عمر آدمی تھوڑا ہی روتا رہتا ہے۔ تو وہ مجبوری کا صبر ہے اور صدمہ کے وقت اختیاری صبر ہوتا ہے۔ جو نفس کا ضبط کرنا ہے وہی اجر کا باعث ہے۔ مجبوری کی چیز اور بے اختیار چیز پر کوئی اجر نہیں ہوتا۔ جس چیز میں ارادہ و اختیار صرف کیا جائے اور طبیعت کے خلاف جدوجہد کی جائے اس پر اجر مرتب ہوتا ہے۔ غرض موت تک کو آخرت کی یادگاری کا ذریعہ بنایا ہے۔ جیسے زندگی کو بھی آخرت کی یادگاری کا ذریعہ بنایا ہے۔

دوسرے کی نیکی ذریعۂ ترقی...... علماء کرام لکھتے ہیں کہ کسی کی اچھائیاں دیکھو تو حرص کرو۔ برائیاں دیکھو تو حرص مت کرو۔ مثلاً آپ نے کسی کو دیکھا کہ نوافل بہت پڑھ رہا ہے اور دل میں حرص آئی اور دعاء کی کہ یا اللہ! مجھے بھی اتنے نفلوں کی توفیق دے۔ اور توفیق ہو گئی تو اس کے نوافل آپ کو نوافل پڑھوا دینے کا ذریعہ بنے۔ لوگوں کی نیکی بھی ہماری ترقی کا ذریعہ بنتی ہے اور لوگوں کی موت بھی ہماری ترقی کا ذریعہ بنتی ہے۔

---

① الصحیح للبخاری، کتاب الجنائز، باب زیارۃ القبور، ج: ۵، ص: ۲۹.

دوسرے کی برائی ذریعۂ عبرت......اور اگر برائیوں کو دیکھ کر آپ نے عبرت پکڑی اور ان سے بچ گئے تو لوگوں کے گناہ بھی ہمارے لئے ترقی کا ذریعہ بن گئے۔غرض دنیا کی ہر چیز میں عبرت، نصیحت و موعظت موجود ہے، انسان اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ دنیا کو مٹا کر ختم کر دے۔ اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اس کی ہر چیز سے عبرت پکڑے۔ ہر ہر چیز سے نصیحت حاصل کرے۔ ہر ہر چیز سے اپنی آخرت بنائے اور اپنی آخرت کو یاد کرے۔ یہ جبھی ہوگا جب دنیا بچی ہوئی ہو۔ اس کو دیکھ دیکھ کر ہم عبرت پکڑیں۔

حضرات کا احترام......اس واسطے یہ چند جملے میں نے عرض کئے۔ وقت بھی تھوڑا تھا، اور کچھ زیادہ ہمت بھی نہیں تھی اور ضعف بھی کافی تھا اور کچھ کام بھی زیادہ ہے اور سفر کی آخری رات بھی ہے۔ اس واسطے ارادہ کیا جب اعلان ہو گیا تو کچھ نہ کچھ عرض کیا جائے۔ اعلان کے احترام اور حضرات کے جمع ہونے کے احترام میں یہ چند جملے میں نے عرض کئے۔

اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے اور ہمیں علم و عمل کی توفیق دے۔ ہماری دنیا بھی درست فرما دے اور آخرت بھی درست فرما دے اور ہمیں عدل و اعتدال پر قائم رکھے۔ افراط و تفریط اور مبالغوں سے ہمیں محفوظ رکھے، آمین!

دعاء

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لَنَا بِالْخَيْرِ وَاخْتِمْ لَنَا بِالْخَيْرِ وَاجْعَلْ ثَوَابَهُ الْجَنَّةَ اٰمِيْنَ

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ خَيْرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ.

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ خَيْرَ الْحَيٰوةِ وَخَيْرَ الْمَمَاتِ وَ ثَقِّلْ مَوَازِيْنَنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْکٰفِرِيْنَ.

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا

اَللّٰهُمَّ انْصُرْنَا وَاعْفُ عَنَّا وَاهْدِنَا سُبُلَ السَّلَامِ وَاَخْرِجْنَا مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَجَنِّبْنَا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ.

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ وَاَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ مَعَ الْاَبْرَارِ يَا عَزِيْزُ يَا غَفَّارُ بِرَحْمَتِکَ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ.

(۶ شوال المکرم ۱۴۰۹ھ)

عالم اصغر

انسان ایک ایسی حقیقت جامعہ ہے کہ ساری ہی حقیقتیں اور صورتیں اس میں جمع ہیں۔ الٰہیات اور مخلوقات کے سارے ہی نمونے اس میں موجود ہیں۔ ہر انسان گویا ایک مستقل جہان ہے۔ جس میں ظلمانی اور نورانی، شیطانی اور رحمانی، مادی اور روحانی سارے ہی انموذج قائم ہیں۔

آسماں ہاست در ولایت جاں   کار فرمائے آسمان جہاں
در رہ روح پست و بالا ہست   کوہ ہائے بلند و صحرا ہست

گویا انسان اس کا مصداق ہے: میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں۔

(از: حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز)

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ. وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَافَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا، وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا. اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. ﴿وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾. ① صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ.

اقسام عالم اور ان کے حصص..... بزرگان محترم! انسان عالم صغیر ہے۔ عالم کبیر کے جملہ نمونے اور نقشے اس میں موجود ہیں، چنانچہ غور کیجئے کہ عالم کائنات کی دو ہی قسمیں ہیں۔ عالم شاہد اور عالم غائب عالم شاہد اجسام کا مجموعہ ہے جو آنکھوں سے مشاہد اور محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً دریا، پہاڑ، زمین، آسمان وغیرہ۔ انسان میں عالم شہادت بدن ہے۔ جس میں گوشت پوست، ہڈی، چمڑہ وغیرہ اور دیگر اعضاء بدن وغیرہ۔ پھر جیسے اس دنیا میں عالم شہادت کے دو حصے ہیں۔ سفلیات (نچلے)، جیسے زمین اور اس کے سبزہ زار و دریا، پہاڑ وغیرہ۔ علویات (اوپر کے) جیسے آسمان، چاند، سورج وغیرہ۔ ایسے ہی انسان میں فوقانی حصہ جس میں قلب اور دماغ ہے، اس کے علویات ہیں۔ اور تحتانی حصہ جس میں مختلف حسی اعمال و حرکات کی قوتیں پوشیدہ ہیں۔ مثلاً ہاتھ پاؤں، پیٹھ وغیرہ یہ اس کے سفلیات ہیں۔

① پارہ ۲۶، سورۃ الذاریات، الآیۃ: ۲۱.

عناصر اربعہ کی کارفرمائی میں کمال درجہ تشابہہ...... پھر جس طرح عالم انسانی کی بنیاد عناصر اربعہ آگ، ہوا، پانی اور مٹی کے مادوں پر ہے بعینہ انسان میں انہی چار مادوں کے اثرات حرارت، برودت، یبوست اور رطوبت کارفرما ہیں۔ پھر سفلیات میں عناصر اربعہ کی کارفرمائی کا جو رنگ ڈھنگ ہے وہی نقشہ انسانی سفلیات میں بھی ہے۔

مٹی کی جملہ انواع...... مثلاً زمین ایک تو وہ خاک ہے۔ ایسے ہی انسان کا پورا بدن ایک مشت خاک ہے۔ پھر جس طرح زمین ہموار نہیں بلکہ اس میں طول و عرض اور عمق (گہرائی) سب کچھ ہی ہے۔ ایسے ہی انسان کا بدن ہے۔ پھر جس طرح زمین کھودو تو تری نکلنا شروع ہو جاتی ہے ایسے ہی انسانی بدن کاٹنے سے خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر جیسے زمین مختلف رنگوں کی ہے۔ سفید، سیاہ، سرخ، زرد۔ ایسے ہی بدن انسانی میں بھی مٹی کے مختلف الوان موجود ہیں۔ سطح سفید ہے۔ مستور حصے جیسے زیر بغل، کنج ران سیاہ ہے۔ چہرہ پر سرخی رہتی ہے۔ ہڈیوں کے جوڑ پر کی کھال میں عموماً زردی نمایاں ہوتی ہے پوری نوع بشر پر نگاہ ڈالو تو ہر رنگ کا انسان نظر پڑتا ہے۔ مغربی انسان عموماً سفید، مشرقی اور افریقی سیاہ، ہندوستانی گندم گوں، چینی زرد اور عرب سرخی مائل ہوتے ہیں۔ پھر زمین کا کوئی حصہ صاف ستھرا ہے، جیسے تفریح گاہ اور کوئی گندا جس پر کوڑیاں پڑتی ہیں، ایسے ہی انسان کا لطیف اور صاف ستھرا حصہ چہرہ اور ہاتھ ہے جسے عزت سے چومتے ہیں۔ اور گندا حصہ زیر بغل یا اعضاء نجاست ہیں۔ غرض مٹی اور اس کی مخصوص صفات و کیفیات انسان میں سب موجود ہیں۔

آگ کی جملہ انواع...... پھر جیسے سارے عالم میں آگ اور برقی رو دوڑ رہی ہے۔ بعینہ بدن انسانی میں حرارت اور آگ پھیلی ہوئی ہے اور اسی حرارت غریزی وطبعی پر انسانی زندگی قائم ہے پھر جیسے مٹی اور پتھر اور لوہے کے آپس میں رگڑنے سے آگ پیدا ہوتی ہے۔ ایسے ہی انسانی ران یا ہاتھ کے آپس میں رگڑنے سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔ پھر جیسے آگ درحقیقت فیض ہے علویات یعنی سورج کا۔ یعنی سورج نہ ہو تو پتھر بھی ریت ہو کر بہہ جائیں۔ ایسے ہی بدن انسانی میں حرارت اس کے علویات یعنی قلب اور دماغ کا فیض ہے۔ قلب ہی حرارت غریزی تیار کرتا ہے۔ اگر قلب یہ حرارت نہ بھیجے تو بدن ٹھٹھرنے لگے اور قلب ہی نہ ہو تو ساری اقلیم بدن مردہ بن کر ختم ہو جائے۔

پانی کی جملہ انواع...... پھر یہ پانی جیسے زمین کے گوشے گوشے میں سمایا ہوا ہے ایسے ہی انسانی بدن میں رطوبات اور پانی کی تری بصورت خون رچی ہوئی ہے۔ پھر جیسے عالم میں چشمے جاری ہیں کوئی بڑے دریا ہیں، کوئی چھوٹے۔ ایسے ہی بدن انسانی میں بڑی اور چھوٹی رگیں گویا دریا ہیں۔ پھر جیسے زمین میں نہریں، ندی نالے، پانی کے ذخیرے مثلاً تالاب ہیں، ایسے ہی انسانی بدن میں وہ رطوبات کا پانی رہتا ہے۔ پھر جیسے زمین میں شیریں، نمکین اور شور مختلف قسم کے چشمے ہیں ایسے ہی انسانی بدن میں منہ سے آب شیریں اور آنکھوں سے شور چشمہ جاری ہے۔ پتے سے کڑوا اور معدہ سے ترش پانی چلتا ہے۔ پھر جیسے دنیا میں حرارت و برودت کے غلبہ سے یا مقامی خصوصیات سے کہیں کا دریا رواں ہے کہیں کا جما ہوا ہے جیسے بحر منجمد شمالی تو بلغم وغیرہ منجمد چشمے ہیں۔ پھر جیسے کہیں

گندا پانی ہوتا ہے۔ انسان میں پیشاب یا سنک گویا گندہ پانی ہے۔ جو گند صفائی سے بہتا ہے۔ پھر دنیا میں کہیں سرد چشمے ہیں۔ اور کہیں گرم جہاں گندھک کا زور ہے۔ ایسے بدن انسانی میں ٹھنڈے پانی کے چشمے جاری۔ زبان سرد پانی کا چشمہ اور پیشاب گرم پانی کا چشمہ۔ پھر دنیا میں مجمع البحرین ایک مقام ہے۔ جس کا ایک حصہ شیریں اور دوسرا تلخ وشور ہے۔ ایسے ہی انسان کے دماغ کی حس مشترک میں شیریں چشمہ قوت ذائقہ اور نمکین چشمہ قوت باصرہ موجود ہے۔ پھر جس طرح دنیا میں برسات ہوتی ہے ایسے ہی بدن انسانی میں پسینہ ہے۔

ہوا کی جملہ انواع..... پھر جس طرح عالم کا ہر خلا ہوا سے پر ہے۔ ایسے ہی انسانی بدن کا ہر خلا ہوا سے بھرپور ہے۔ پھر جیسے زمین پر ہوائیں چلتی ہیں ایسے ہی انسان میں سانس کے ذریعے جو ہوا اندر جاتی ہے وہ سرد ہے اور جو ہوا باہر نکلتی ہے وہ گرم ہے پھر جیسے ہوائیں صاف بھی ہوتی ہیں اور متعفن بھی۔ ایسے ہی انسان میں ذکار آتی ہے تو خوشبودار ہوتی ہے اور خروج ریاح ہوتا ہے تو بدبودار۔ پھر جیسے زمین پر حبس اور گھٹن ہونے سے انسان کا دل گھبراتا ہے اور پریشان ہوتا ہے۔ ایسے ہی ریاح بند ہونے کے وقت حالت ہوتی ہے۔ پھر جیسے زمین کے خلاؤں میں سے اگر ہوا کھینچ لی جائے تو سارا عالم ختم ہو جائے ایسے ہی انسانی بدن میں سانس کھینچ لی جائے تو اقلیم تن بھی ختم ہو جائے۔ غرض ہوا کی جملہ انواع انسان میں موجود ہیں۔

انواع جمادات..... جمادات میں ہڈیوں کا سلسلہ گویا پہاڑ ہیں۔ جن میں سے پہاڑوں کی طرح کوئی چھوٹی ہے کوئی بڑی۔ پھر جس طرح پہاڑوں پر مٹی جمتی ہے ایسے ہی اقلیم بدن پر گوشت چڑھا ہے۔ پھر پہاڑوں کے بعض خطے گرم ہیں، بعض سرد، ایسے ہی انسانی بدن کے مستور حصے گرم ہیں اور سطح بدن کے تمام نمایاں حصے سرد۔ پھر پہاڑوں کے مقامات مقدسہ کی زیارت کی جاتی ہے اور بعض سے کراہت کی جاتی ہے۔ ایسے ہی انسانی بدن میں چہرہ مہرہ کی ادب سے پیشانی چومی جاتی ہے اور بعض حصوں کو دیکھنا شرعاً وعقلاً ننگ وعار سمجھا جاتا ہے۔ پھر زمین کے بعض حصوں کو دیکھنے کی قوت ہے۔ لیکن ایسا کرنا عیب سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ہی بدن انسانی کے بعض حصوں کو دیکھنا (مثلاً پیٹھ وغیرہ) حماقت ہے۔ پھر جیسے پہاڑ پر نباتات اگتے ہیں، ایسے ہی انسان بدن پر بال اگتے ہیں۔ پھر جس طرح زمین پر کہیں گھنا جنگل ہے، کہیں جھنڈ، ایسے ہی انسانی بدن کے چہرہ اور سر پر گھنے بال ہیں اور عام بشرہ بدن پر چھدرے ہیں۔

پھر جس طرح زمین پر بعض نباتات برابر بڑھتے اور نشوونما پاتے رہتے ہیں اور بعض یکساں حالت پر قائم رہتے ہیں۔ لیکن بقیہ جلد بدن کا رواں یکساں رہتا ہے۔ پھر بعض جگہ زمین کے جھاڑ جھنکار کے صاف کئے بغیر زمین پر رونق نہیں آتی۔ ایسے بدن انسانی کے موئے بغل اور موئے زہار ہیں۔

پھر زمین کے بعض حصے قائم رکھنے سے زمین کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے اور بعض حصوں کی تراش خراش سے زمین کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی بدن انسانی میں موئے ریش ہیں جن کے رکھنے سے انسانی حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ نیز ان کی اصلاح اور موئے شوارب (مونچھوں کے بال) کی تراش سے چہرہ کا حسن قائم ہوتا ہے۔

انواعِ حیوانات...... پھر جس طرح زمین کے مختلف قسم کے حیوانات کی غذا زمین کی رطوبات ہیں۔ ایسے ہی انسانی جہاں میں سر میں جوئیں، پیٹ میں کینچوے، معدے میں ریسمانی کیڑے، بدن کے خون کو چوستے اور بڑھتے ہیں۔

پھر جس طرح زمین کے قعر اور جگر میں مختلف صورتوں کے حشرات الارض ہیں۔ ایسے ہی انسان کے بدن میں مختلف رنگوں کے جراثیم ہیں جو خوردبین سے نظر آتے ہیں۔ پھر جس طرح دنیا کے ہر خطہ کے جانور مختلف قسم کے ہوتے ہیں، ایسے ہی انسانی بدن کے ہر حصہ میں نئی نئی شکل وشائل کے جراثیم ہیں۔ پھر جس طرح زمین کی مخلوقات زمین میں پیدا ہو کر مر کر زمین میں ہی دفن ہو جاتی ہیں، ایسے ہی جراثیم بدن میں پیدا ہو کر مرتے اور بدن میں ہی دفن ہو جاتے ہیں۔

آثارِ زلزلہ...... پھر جس طرح زلزلہ سے ساری زمین حرکت میں آتی ہے ایسے ہی بدن میں جھرجھری آنے سے پورا بدن اچانک متحرک ہو جاتا ہے۔ پھر جس طرح زلزلہ کا سبب آتش فشاں پہاڑ کا پھٹنا کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی اندرونی گرمی، بجز کاہٹ یا پریشانی دل سے انسان کے پورے بدن میں جھرجھری آجاتی ہے۔

پھر جس طرح اقلیم عالم میں عناصر کے غلبہ سے غیر معتدل آثار پیدا ہوتے ہیں مثلاً قحط سالی، آندھیاں، آگ برسنا، ایسے ہی اقلیم بدن پر غیر طبعی آثار مثلاً بخار، زکام، سرسام اور خارش وغیرہ نمودار ہوتے ہیں۔

عقل وحکمت کے آثار...... پھر جس طرح عقل وحکمت کی کمی اور شہوات عضلات کی زیادتی سے انسان، انسان کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی بعض دفعہ بحرانی مرض پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسان اپنے بدن کو نوچنے لگتا ہے۔ پھر جس طرح کسی ملک پر بادشاہ کی حکومت ہوتی ہے اور وزراء جنود وعساکر (افواج) اس کے مددگار ہوتے ہیں، ایسے ہی اقلیم بدن کا بادشاہ قلب ہے۔ دماغ اور حواس خمسہ اس کے وزراء اور مشیر ہیں۔ معدہ خزانچی ہے اور ہاتھ پیر جنود وعساکر ہیں۔ پھر جس طرح علویات میں چاند اور سورج روشن ہیں۔ بعینہ اقلیم بدن میں سر میں دو آنکھیں منور ہیں پھر جس طرح ستاروں سے راستہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں دماغ میں غور وفکر کے نتائج اور نظریے ہیں جن سے انسان کو عمل کی راہیں ملتی ہیں۔

ستاروں کے آثار...... پھر جیسے ستارے مادی تاثیرات پیدا کرتے ہیں، ایسے ہی دماغی فکر غم ومسرت پیدا کرتی ہے۔ پھر جس طرح آسمان کے اوپر غیب میں جنت ہے۔ جس میں سوائے مسرت واطمینان کے غم کا کہیں نشان نہیں۔ بعینہ انسان میں آثار فرحت ومسرت اور بشاشت وطمانیت (خوشی واطمینان) مثل جنت کے ہیں۔ جن میں مگن ہو کر نفس دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ پھر جس طرح غیب میں جہنم ہے۔ جہاں سوائے غم وتردد کے کسی خوشی کا نشان نہیں۔ ایسے ہی انسان کے باطن میں آثار مصائب وغم اور تشویشات، مثل جہنم کے ہیں۔ پھر جیسے آسمانوں میں سب سے برتر اور فوق تر عرش ہے، جہاں حق سبحانہ وتعالیٰ کی تجلیات کا بلاواسطہ دور دورہ ہے ایسے ہی فوقانی اشیاء میں انسان کا لطیفہ قلب ہے جو تجلی گاہ ربانی ہے۔ جس میں بلاواسطہ اسرار الٰہی متجلی اور منکشف ہوتے ہیں۔

ملائکہ وشیاطین...... پھر جس طرح آسمان پر فرشتے محض خدمات انجام دیتے ہیں جن میں عصیان کا کہیں نشان نہیں۔ ایسے ہی دماغ میں حواس خمسہ ملائکہ کی طرح خدمات انجام دیتے ہیں۔ پھر جس طرح نیچی عالم میں آسمان کے نیچے گمراہ شیاطین ہیں جو حکم الٰہی کے سامنے نہیں جھکتے، ایسے ہی انسانی دماغ کے نیچے نفس ظلمانی ہے، جو قلب کے اشاروں پر نہیں چلتا اور فانی لذات میں منہمک ہو کر سارے اقلیم بدن کو تباہی میں ڈالتا ہے۔

عالم غیب سے تشابہ...... دوسرا عالم، عالم غیب ہے جو جسمانیت سے پاک ہے اور صرف دل کی آنکھوں سے نظر آتا ہے، مثلاً ذات وصفات حق، ملائکہ، عالم اسرار غیب وغیرہ، انسان کا عالم غیب روح انسانی ہے۔ جس میں علم کے سرچشمے ہیں اور لطیفہ روح معنویات وروحانیات اور الٰہیات کا مرکز ہے۔ گویا اس روح میں کمالات باطن کے نمونے ہیں جو اس کو ودیعت کئے گئے ہیں۔ جس طرح ذات بابرکات مدبر وحکیم اپنی حکمت وقدرت سے سارے عالم کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ اگر ذرا توجہ ہٹالے تو سارا عالم درہم برہم ہو جائے۔

اسی طرح روح انسانی بدن کی کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اگر ذرا بھی اپنا رخ بدن سے پھیرے تو اقلیم تن گل سڑ جائے، پھر جس طرح وہ مختلف رنگ کے جہانوں کے لئے ایک مدبر ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی طرح روح بھی انسانی بدن میں وحدہ لاشریک ہے۔ پھر جس طرح وہ واحد قہار یقینی اور حتمی ہونے کے باوجود انسانوں سے اوجھل ہے اور ادراک سے قاصر ہے، ایسے ہی روح انسانی ہے۔ پھر جیسے وہ خالق اکبر عالم کے ذرہ ذرہ میں سمایا ہوا ہے اور ہر چیز میں اس کا جلوہ ہونے کے باوجود کوئی اشارے سے نہیں بتلا سکتا کہ ذرا ادھر یا ادھر۔ ویسے ہی روح انسانی رگ رگ میں سمائے ہونے کے باوجود کوئی نہیں بتلا سکتا کہ کس کونے میں بیٹھی ہے۔

پھر جس طرح حق تعالیٰ شانہ کو جو تعلق عرش سے ہے وہ فرش سے نہیں۔ جو بیت اللہ سے ہے وہ عام جہان سے نہیں۔ چنانچہ اگر مقامات مقدسہ پر آنچ آجائے تو سارا عالم زیروزبر ہو جائے۔ ایسے ہی روح انسانی کا سب سے زیادہ تعلق قلب سے ہے۔ پھر جس طرح حق تعالیٰ شانہٗ ملائکہ مقربین کو مامور فرماتے ہیں اور وہ انبیاء علیہم السلام کے پاس حکم الٰہی لے کر اترتے ہیں۔ اسی طرح روح انسانی کی صفت بھی رشد وہدایت ہے۔ پھر جس طرح ہر ادراک اور حواس خمسہ اس کے ملائکہ ہیں، جن کی قوتیں دماغ میں پوشیدہ ہیں اور جن اعضاء کے ذریعے قوتیں نمایاں ہوتی ہیں، وہ آنکھ، کان، ناک وغیرہ بمنزلہ انبیاء علیہم السلام کے ہیں۔

پھر جس طرح حق تعالیٰ کی گوناں گوں صفات وکمالات ہیں۔ کسی نہ کسی خاص غلبہ کے تحت ہر نبی پر تجلی ہوتی ہے۔ ایسے ہی روح بھی کسی نہ کسی صفت سے ان کارکنوں پر متجلی ہوتی ہے اور ہر عضو آنکھ، کان، ناک اس کی اس قوت احساس وادراک کا مظہر ہے۔ پھر حق تعالیٰ شانہٗ کی سب سے زیادہ جامع تجلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں اگلوں اور پچھلوں کے تمام علوم وکمالات جمع کر دیئے گئے ہیں۔ ایسے ہی روح کی سب سے زیادہ تجلی قلب پر ہے اور قلب مجمع العلوم ہے۔ حواس خمسہ میں ادراک وشعور کا فیض قلب ہی کا ہے۔

پھر جس طرح یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ اور انبیاء علیہم السلام کی نبوت ومعرفت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ومعرفت سے مستفاد اور وابستہ ہے۔ ایسے ہی ان اعضاء حواس کا علم قلب کی قوت علم سے مستفاد اور وابستہ ہے اور قلب بالذات مدرک ہے، چناں چہ آنکھ، کان بند کر کے تنہا قلب تدبر وفکر کرتا ہے اور ساری کائنات کے نقشہ کو عالم خیال میں دیکھتا ہے اور حواس خمسہ کا محتاج نہیں۔

پھر جس طرح حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہم السلام کے حاکم اور جملہ ادیان کے ناسخ ہیں۔ ایسے ہی قلب تمام اعضاء رئیسہ مرؤسہ پر حاکم اور ان کے علمی ذخیروں پر ناقد اور متصرف ہے کہ آنکھ نے صحیح دیکھا یا نہیں، کان نے صحیح سنا یا نہیں اور قلب کے علوم پر اختیار نہیں۔ پھر جس طرح کمالات خداوندی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر اولاً اترے۔ اسی طرح روح کا فیضان بھی اولاً قلب پر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ حیات و زندگی بھی پہلے قلب پر اترتی ہے۔

پھر جس طرح حضرات انبیاء علیہم السلام مخلوق کو راہ ہدایت دکھلا کر عمل کے لئے جبر واکراہ نہیں کرتے بلکہ عمل کی استعداد پیدا کر کے عمل کرنا لوگوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے ہی روح انسانی اشیاء کا حسن وقبح دکھلا کر اعضاء بدن میں استعداد عمل کی قوت پیدا کر کے نفس کے ارادے پر چھوڑ دیتی ہے اور عمل کے لئے نفس پر جبر واکراہ نہیں کرتی۔ پھر جس طرح غذا کے اثرات بدن پر نمایاں ہوتے ہیں اسی طرح روح بھی اپنی تربیت سے اس کے (خیر وشر کے) ثمرات بدن پر نمایاں کر دیتی ہے۔

آخر میں بطور تبرک حضرت قاری صاحب (نور اللہ مرقدہ) کے الفاظ نقل کرتا ہوں۔ غرض مبداء ہو یا معاد، نبوات ہوں یا احکام آخرت ہوں یا سزا وجزاء، حق تعالیٰ کے کمالات وصفات ہوں یا افعال، ان سب کے تمام ہی نمونے انسان کے عالم غیب یعنی روح میں موجود ہیں اور یہ واضح ہو گیا کہ انسان ایک ایسی حقیقت جامعہ ہے کہ ساری حقیقتیں اور صورتیں اس میں جمع ہیں۔ الٰہیات اور مخلوقات کے سارے ہی نمونے اس میں موجود ہیں۔ اور ہر انسان گویا ایک مستقل جہان ہے۔ جس میں ظلمانی اور نورانی، شیطانی اور رحمانی، مادی اور روحانی سارے ہی انموذج (نمونے) قائم ہیں۔

آسماں ہاست در ولایت جاں	کارفر فرمائے آسمان جہاں
در رہ روح پست وبالا ہست	کوہ ہائے بلند وصحرا ہست

گویا انسان اس کا مصداق ہے۔

میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں۔ (ماخوذ از ماہنامہ الحق، اکوڑہ خٹک)

افاداتِ علم وحکمت

مختلف مواقع پر کیے گئے سوالات اور حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ العزیز کے علمی جوابات

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، أَرْسَلَهُ اللّٰهُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَّدَاعِيًا إِلَيْهِ بِإِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا. أَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. ﴿اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ، أُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ، لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾ ① صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

قرآن حکیم اور انسانی نفسیات...... ظاہر بات ہے کہ آیت میں ظاہری پاکی و ناپاکی تو مراد نہیں ہے کہ جس کے کپڑے پاک ہوں وہ تو طیبین میں داخل ہو گیا اور جس کے کپڑے ناپاک ہوں وہ خبیثین میں داخل ہو گیا۔ طیبین و خبیثین یعنی عقائد و اعمال اور افکار کے مراد ہیں کہ طیبین وہ ہیں جن کے عقائد بھی درست، اعمال بھی درست اور جن کا فکر بھی درست اور جو اس میں داخل نہیں ہے وہ خبیثین میں داخل ہے۔ اور اگر انبیاء علیہم السلام کی بھی اولاد ہو اور وہ کفر میں مبتلا ہو وہ خبیثین میں شامل ہوگی، طیبین میں شامل نہیں ہوگی۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے بارے میں فرما دیا گیا: ﴿إِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ﴾ ② وہ آپ کے اہل میں سے نہیں آپ کا اہل وہ ہے جو آپ کا مطیع ہو۔ جیسے کہ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مَنْ أَطَاعَنِيْ فَهُوَ آلِيْ." جو میری اطاعت کرے گا وہ میری آل اولاد میں داخل ہے، جو اطاعت نہیں کرے گا وہ آل اولاد سے خارج ہے۔ یہاں پر نسبی اولاد مراد نہیں، روحانی اولاد مراد ہے جو میرے دین پر ہو اور اس دین پر چلے وہ میری اولاد ہے۔

---

① پارہ: ۱۸، سورۃ النور، الآیۃ: ۲۶ ② پارہ: ۱۲، سورۃ ہود، الآیۃ: ۴۶.

اور بعض روایات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا بھی ہے کہ: ''اَنَا لَکُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ.'' ① ''میں تمہارے حق میں بمنزلہ باپ کے ہوں''۔ اس سے بھی نسبی باپ مراد نہیں۔ بلکہ نسبتی اور روحانی باپ کی طرف اشارہ ہے کہ جس کو میرا دین پہنچا اور وہ اس پر چلا تو میں اس کے حق میں باپ ہوں اور وہ میرے حق میں اولاد ہے اور جو اس سے نکل گیا نہ میں اس کے حق میں باپ ہوں اور نہ وہ میرے حق میں اولاد ہے۔ یہی معنی طیب وخبیث کے ہیں کہ جو اس فکر وعقیدے اور عمل سے خارج ہے وہ خبیثین میں داخل ہے۔ جو اس میں داخل ہے وہ طیبین میں داخل ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ جو طیبین میں داخل ہیں۔ وہ دین پسند ہیں۔ وہ طیبات ہی کو پسند کریں گے کہ ان میں بھی دین ہو۔ کوئی نیک صالح یہ پسند نہیں کرے گا کہ اس کی بیوی فاحشہ آجائے یا بدکردار آجائے۔ بخلاف خبیثین کے جو خبث میں مبتلا ہیں انہیں عورتیں بھی وہی پسند ہوں گی جو خبث میں مبتلا ہوں۔ پاک صاف اور طاہرات ہوں تو ان کی طبیعت کبھی رجوع نہیں کرے گی۔ اس لئے کہ دلوں کے اندر خبث بھرا ہوا ہے تو یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جس کو قرآن نے اٹھایا ہے کہ نیک آدمی نیک چیزوں کی طرف توجہ کرے گا اور بدآدمی بد چیزوں کی طرف۔ وہ چیزیں عورتیں ہوں یا اشیاء ہوں جب دل میں بدی ہے تو بدی ہی پسند آئے گی۔ دل میں پاکی ہے تو پاکی ہی پسند آئے گی۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی شان یہ ہے کہ ان کی طبائع ہی پاک پیدا کی گئیں ہیں بالطبع جب نبی علیہ السلام کی طبیعت چلے گی خیر کی طرف چلے گی۔ شر کی طرف کبھی نہیں جائے گی۔ اس لئے کہ بنیاد پاک ہے۔ اسی طرح سے اگر ان کے طفیل سے کسی کی بنیاد پاک ہے۔

یا ریاضت ومجاہدہ سے اپنی طبیعت پاک کرلی تو وہ پاک ہی چیزوں کو پسند کرے گا، ناپاک چیزوں کو بھی نہیں پسند کرے گا۔ غذا بھی ہو، تو پاک غذا پسند کرے گا ناپاک نہیں، لباس ہو تو جائز لباس پسند کرے گا، ناجائز نہیں، ہر چیز میں یہ اصول چلے گا کیوں کہ یہ ایک نفسیاتی اصول ہے۔

یورپ کے ایک ریفارمر نے لکھا ہے کہ قرآن کریم دنیا کی پہلی کتاب ہے جس نے نفسیات سے بحث کی ہے اور کتابوں میں احکام دیئے گئے ہیں یہ ناجائز ہے یہ حلال ہے یہ حرام ہے اور قرآن کریم نے صرف حلال وحرام بیان نہیں کیا، حلال تک پہنچنے کا جو نفسیاتی طریقہ ہے ادھر بھی توجہ دلائی ہے، حرام تک پہنچنے کے جو نفسیاتی اصول ہیں ان کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔

انسان میں خرابی کے نفسیاتی درجات...... جیسے مثلاً ایک حدیث ہے جو قرآن کریم کی شرح ہے۔ اس میں فرمایا گیا صحابہ رضی اللہ عنہ کا مجمع تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**کَیْفَ بِکُمْ اِذَا فَسَقَ فِتْیَانُکُمْ وَطَغٰی نِسَآئُکُمْ**'' لوگو! اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہارے نوجوان فاسق وفاجر بن جائیں گے اور عورتیں آزاد ہو

① السنن لابی داؤد، کتاب الطهارة، باب کراهیة استقبال القبلة عند قضاء الحاجة، ج: ۱، ص: ۲، حدیث حسن ہے دیکھئے: صحیح وضعیف سنن ابی داؤد، ج: ۱ ص: ۸۶.

جائیں گی اور تمہارے کہنے میں نہیں رہیں گی۔"

صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین تو خیر القرون میں ہیں، ان کے تو تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی۔ حیران ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا یہ ہوجائے گا؟" قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ "" یہ بھی ہوگا اور اس سے زیادہ سخت بات ہوگی"۔ "کَیْفَ بِکُمْ اِذَا لَمْ تَأْمُرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَلَمْ تَنْهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ." اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب اچھی باتوں کی نصیحت چھوٹ جائے گی اور بری باتوں سے روکنا چھوٹ جائے گا۔ تو صحابہ میں حیرانی پیدا ہوئی کہ یہ کیسے ہوگا۔ وہ تو پاک زمانہ ہے، رات دن معروفات میں ہیں، بدی کا تو ان کے ذہنوں میں تصور بھی نہیں آتا۔ تو حیران ہوئے اور عرض کیا: "وَاِنَّ ذٰلِکَ لَکَائِنٌ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟" "یارسول اللہ! کیا ایسا ہوجائے گا؟" "قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ." "یہ بھی ہوگا اور اس سے بھی زیادہ سخت ہوگا"۔ "کَیْفَ بِکُمْ اِذَا اَمَرْتُمْ بِالْمُنْکَرِ وَنَهَیْتُمْ عَنِ الْمَعْرُوْفِ." اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب منکرات کی تو ہدایت کرنے بیٹھ جاؤ گے اور معروفات کے روکنے کے لیے کھڑے ہوجاؤ گے، اب تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا پہلے سے بھی زیادہ تحیر بڑھا اور عرض کیا: "وَاِنَّ ذٰلِکَ لَکَائِنٌ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟" "یارسول اللہ! کیا ایسا ہوجائے گا؟" "قَالَ نَعَمْ وَاَشَدُّ." "بھی ہوگا "کَیْفَ بِکُمْ اِذَا رَاَیْتُمُ الْمَعْرُوْفَ مُنْکَرًا وَالْمُنْکَرَ مَعْرُوْفًا" ① "اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا کہ اچھی چیزوں کو تم برا جاننے لگو گے یعنی فہم ہی الٹ جائے گا کہ اچھی چیزیں بری نظر پڑیں گی اور بری چیزیں دلوں کے اندر اچھائی بن جائیں گی۔ اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا۔"

تو اس حدیث میں درجات بتلائے گئے ہیں کہ سب سے پہلے عمل سے ابتداء ہوتی ہے کہ عملی طور پر آدمی فسق و فجور اور تعدی و زیادتی کے اندر مبتلا ہوتا ہے۔ عقیدے میں کوئی خرابی نہیں ہوتی بلکہ عمل خراب ہوتا ہے۔ نوجوان فاسق و فاجر ہوگئے، عورتیں سرکش اور آزاد بن گئیں۔ خاوند کی سنتی ہیں نہ باپ کی سنتی ہیں نہ اولاد کی سنتی ہیں، جو ان کے جی میں آتا ہے کرتی ہیں۔ تو عملی خرابی ہے۔

عملی خرابی جب جڑ پکڑ جاتی ہے تو نصیحت کا کارخانہ رک جاتا ہے۔ نصیحت کرنے والے کے دل میں خطرہ ہوتا ہے کہ اگر اس نے کہہ دیا تمہارا عمل نہیں ہے تم کس منہ سے نصیحت کررہے ہو۔ تو نصیحت کا کیا منہ رہے گا۔ تو نصیحت رک جائے گی تو یہ دوسرا درجہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک ہوگیا۔

اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ اچھی باتوں سے روکنے کے لئے کھڑے ہوجاؤ گے اور بری باتوں کی ہدایت کرنے کے لئے کھڑے ہوجاؤ گے اور چوتھا مقام فہم کے الٹ جانے کا ہے کہ جو اچھائی کی چیزیں ہیں، وہ بری بن جائیں اور جو بری چیزیں ہیں وہ اچھی نظر آنے لگیں۔

① مسند ابی یعلی الموصلی، شهر بن حوشب عن ابی هریرةؓ ج:۱۲، ص:۱۸۴۔ علامہ ہیثمیؒ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، دیکھئے: مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، باب فی أیام الصبر وفیمن یتمسک ج:۳ ص:۲۱۲۔

یہاں آ کر فہم کا الٹا پن ظاہر ہوتا ہے، غرض خرابی پہلے عمل سے شروع ہوتی ہے، پھر عقیدے پر، پھر نصیحت پر، پھر عقل وفہم پر اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے، انجام کار آدمی الٹا چلنے لگتا ہے قلب میں زیغ اور کجی پیدا ہو جاتی ہے۔

اب یہ نفسیاتی اصول ہے کہ عمل اول بگڑے گا فکر بعد میں بگڑے گی، عقیدہ اس کے بعد بگڑے گا اور پھر فہم الٹ جائے گا۔ تو فقط یہ نہیں فرمایا کہ برائی سے بچو۔ برائی سے بچنے کا نفسیاتی راستہ بھی بتلا دیا کہ عمل کی حفاظت کرو تا کہ فکر محفوظ رہے فکر کی حفاظت کرو تا کہ عقیدہ محفوظ رہے۔ عقیدے کی حفاظت کرو تا کہ فہم میں کجی نہ پیدا ہو۔ تو یہ ایک سلسلہ ظاہر فرمایا۔

تو یورپ کے ریفارمر نے یہی کہا کہ دنیا کی ساری کتابوں میں احکام موجود ہیں، قرآن کریم میں احکام کے ساتھ نفسیات سے بحث کی گئی ہے۔ جو کسی کتاب میں نہیں کی گئی۔ فطرت کے راستے دکھلائے گئے۔

اب جب قرآن کریم کی تعلیم ہی چھوٹ جائے تو احکام کیسے معلوم ہوں۔ احکام نہ معلوم ہوں تو عقائد کیسے درست رہیں۔ عقائد درست نہ ہوں تو فکر کیسے صحیح رہے اور جب فکر صحیح نہیں رہے گی۔ الٹی ہو جائے گی۔ تو دل ہی الٹ جائیں گے۔

اسی کو فرمایا گیا ﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾ ① ''بہت سے وہ لوگ ہیں جو مؤمن ہونے کے مدعی ہیں۔ حقیقت میں مشرک ہیں''۔ شرک میں مبتلا ہیں یہی تو وہ مقام ہے یہ

گائے علامت حیات ہے...... حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ گائے ذبح کر کے اس میت سے ملاؤ، وہ زندہ ہوگا۔ بنی اسرائیل نے کہا کہ آپ مذاق کر رہے ہو۔ فرمایا۔ ﴿اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ﴾ ② ''مذاق مسخرہ ہم نہیں کیا کرتے۔ میں تو وحی الٰہی سے کہہ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا اس کی شان کیا ہوگی؟ فرمایا: ''وہ نہ بوڑھی ہو نہ بن بیاہی بلکہ جوانی اور بڑھاپے کے درمیان ہو''۔ انہوں نے کہا رنگ کیا ہوگا؟ ﴿صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ﴾ ③ نہایت زرد خوش رنگ جو نگاہوں کو خوش کرتی ہو اور یہ کہ وہ نہ کسی کھیتی میں جڑی ہوئی ہو نہ کسی محنت میں لگی ہوئی ہو۔ یہ ساری شانیں ایک ہی گائے میں پائی جاتی تھیں۔ وہ ایک صالح آدمی کی ملک تھی، اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے یتیم بچے تھے، کھانے کو کچھ نہیں تھا، بس یہی ایک گائے تھی۔ سارے بنی اسرائیل جمع ہو کر وہاں پہنچے اور کہا کہ اس گائے کی کیا قیمت ہے؟ اس نے کہا اس کو ذبح کر کے اس کھال بچھائے دیتا ہوں، اس میں سونا بھر دو، تو لاکھوں روپے کا سونا ان کو ملا اس کو ذبح کر کے اس کو میت سے ملایا گیا وہ زندہ ہوا اس نے قاتل کا پتہ دیا، غرض گائے علامت حیات ہے۔

سامری نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ دریائے نیل میں فرعونی غرق ہوئے۔ پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام مع بنی اسرائیل کے پار ہو گئے، پانی کی دیواریں کھڑی ہو گئیں اور پانی رک کر بارہ راستے بن گئے۔ اور بارہ قبیلے اس

① پارہ: ۱۳، سورۃ یوسف، الآیۃ: ۱۰۶۔ ② پارہ: ۱، سورۃ البقرہ، الآیۃ: ۶۷۔ ③ پارہ: ۱، سورۃ البقرہ، الآیۃ: ۶۹۔

سے گزرے جو ایک دوسرے کو دیکھتے جاتے تھے۔ فرعون جب نکلا تو ہامان نے کہا کہ آپ کے اقبال سے دریا میں راستے ہوئے ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ میرا اقبال کیا۔ یہ تو موسیٰ (علیہ السلام) کا معجزہ ہے۔

مگر وہ گھوڑے پر سوار تھا اور دوسرا وزیر گھوڑی یعنی مادہ پر سوار تھا، وہ گھوڑی جوتھی آگے بڑھی۔ گھوڑا ابھی لپک کے اس کے پیچھے پڑا، اور وہ دریا میں کود گئے، تو یہ سارے قبطی کودے اور وہاں غرق ہو گئے اس کے بعد سامری نے دیکھا کہ حضرت جبریل علیہ السلام جس گھوڑے پر سوار تھے اس گھوڑے کے سم کے نیچے اگر خاک بھی ہوتی تو سبزہ اُگ آتا تھا اس نے سمجھا کہ اس میں حیات کا مادہ ہے۔ اس نے چٹکی اٹھا کے رکھ لی اور بنی اسرائیل سے کہا کہ اپنے زیوارت جمع کرو، سونے چاندی کے زیوارات جمع کر کے اس کا بچھڑا بنایا۔ اس میں وہ خاک پھونکی تو کودنے لگا اور اس میں آواز بھی نکلی۔ اس نے کہا موسیٰ (علیہ السلام) خدا کو دیکھنے وہاں گئے۔ خدا تو معاذ اللہ یہاں آ گیا۔ وہاں سے گؤ (گائے) کی پوجا شروع ہوئی۔

ہندوستان میں جو گاؤ پرستی کی وبا آئی ہے تو مؤرخین لکھتے ہیں کہ چند بنی اسرائیل جو مرتد ہو گئے تھے، بھاگ کر ہندوستان آئے ہیں، تو جو کلمات حقہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان سے سنے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ اپنی چیزیں مل ملا کر لوگوں کو سمجھایا تو وہاں سے گوسالہ پرستی شروع ہو گئی۔ بہر حال اتنی بات معلوم ہوئی گائے جو ہے اسے حیات سے مناسبت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ماں کا دودھ نہیں ہوتا تو بچوں کو گائے کا دودھ پلواتے ہیں۔ اس کے اندر وہی مادہ ہے یعنی حیات آفرینی جو ماں کے دودھ کے اندر ہوتی ہے۔ اس لئے خواب میں گائے وغیرہ دیکھنا انشاء اللہ حیات کی علامت ہے۔

تعبیر خواب میں حدیث فہمی کی ضرورت...... تعبیر خواب کا تعلق کچھ موسموں سے بھی ہوتا ہے۔ کچھ دیکھنے والے کی صفات سے بھی تعلق ہوتا ہے۔ اعداد و شمار کا بھی تعلق ہوتا ہے تو معبر (تعبیر دینے والا) اگر صحیح ہے تو وہ قواعد کی رو سے تعبیر دے گا۔ اسی لئے حکم ہے کہ ہر ایک سے خواب مت کہو جو پہلے تعبیر دے دے گا وہی واقعہ ہو جائے گا۔ اسی لئے سمجھدار اور خیر خواہ سے خواب کہو تا کہ وہ اچھی تعبیر دے۔

مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے خواب دیکھا کہ وہ صبح کی نماز کے لئے گھر سے نکلے۔ ایک بہت بڑا دنبہ جو گائے کے برابر ہوان کے مدمقابل آیا، تو مولانا نے اس کے سینگ پکڑ لئے اب بھی وہ ریلتا ہے تو یہ پیچھے ہٹتے ہیں اور کبھی یہ ریلتے ہیں تو وہ پیچھے ہٹتا ہے۔ اسی مقابلہ میں اس نے مولانا کے سینگ مارا تو مولانا کی بائیں ران میں لگا اور ایک قطرہ خون کا نکلا۔ یہ خواب دیکھا۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ صبح کو خواب کی تعبیریں دیا کرتے تھے، وہ بھی حاضر ہوئے اور کہا کہ بھائی صاحب! میں نے یہ خواب دیکھا۔ تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اصول کے مطابق فرمایا۔ ''موت کو دنبے کی شکل (قیامت میں) دی جائے گی موت سے آپ کا مقابلہ ہوا۔ کبھی تم اسے ہٹا دیتے ہو کبھی وہ تمہیں ہٹا دیتا ہے۔

جو سینگ بائیں ران پر لگا اور قطرہ خون کا نکلا۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ عرب کا محاورہ ہے، کہ جدی رشتوں کو بطن سے تعبیر کرتے ہیں، کہ یہ بطون کا اور پیٹ کا رشتہ ہے اور بنی اعمام جو چچا تائے کی اولاد ہے ان کو افخاذ سے تعبیر کرتے ہیں کہ یہ ران کی اولاد ہے، یہ عرب کا ایک محاورہ ہے۔ فرمایا کہ بائیں ران میں جو سینگ لگا تو "ران" سے میں یہ سمجھا کہ بنی اعمام میں کوئی حادثہ پیش آئے گا چوں کہ ایک قطرہ خون کا نکلا تو آپ کی چچا تائے کی اولاد میں چھوٹی عمر کا بچہ گزر جائے گا اور چونکہ عورت بائیں پسلی کی پیدائش ہے اور بائیں جانب خون لگا تو وہ لڑکی ہوگی اور چوں کہ ایک قطرہ خون ہے تو لڑکی چھوٹی عمر کی ہوگی"۔ جب وہ تعبیر دی تو تھوڑی دیر میں ایک عورت روتی ہوئی آئی کہ پرسوں جو آپ کے چچا زاد بھائیوں میں بچی پیدا ہوئی تھی وہ گزر گئی۔ فرمایا تعبیر آ گئی۔

تو تعبیر میں گویا احادیث کا بھی دخل ہوا۔ جیسا کہ حدیث شریف سے انہوں نے استنباط کیا۔ اس لئے تعبیر دینا بھی ہر ایک کا کام نہیں۔ اسی طرح تعبیر خواب میں اختلاف موسم کو بھی دخل ہے تو معبر پہچانے گا اور موسم کے لحاظ سے تعبیر دے گا۔

تعبیر خواب میں اعداد و شمار کا دخل...... اسی طرح اعداد و شمار کا بھی دخل ہے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جب مرض وفات میں گرفتار ہوئے تو مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور تمام علماء کا حلقہ بہت پریشان تھے، مگر مولانا نے اطمینان دلایا کہ اس مرض میں انتقال نہیں ہوگا، اب مطمئن تو ہو گئے مگر انتقال ہو گیا رحمۃ اللہ علیہ۔ لوگوں نے عرض کیا حضرت! آپ نے تو فرمایا تھا کہ انتقال نہیں ہوگا اور انتقال ہو گیا۔ فرمایا:

"میاں! کشف تو صحیح تھا۔ تعبیر میں غلطی ہوئی۔ فرمایا جب میں نے مراقبہ کیا تو لفظ "مہدی" میرے سامنے نمایاں ہوا اور مہدی کے جو اعداد و شمار ہیں وہ ساٹھ سے بھی اوپر پہنچتے ہیں اور مولانا کو جو مرض لاحق ہوا تو عمر انچاس سال کی تھی۔ تو میں نے کہا۔ ابھی عمر کافی باقی ہے۔ لیکن اس سے مراد لفظ مہدی نہیں تھا بلکہ مہدی کی ذات مراد تھی چنانچہ حضرت مہدی رضوان اللہ علیہ کی عمر ۴۹ سال کی ہوگی۔ غرض ذات مراد تھی، نام مراد نہیں تھا۔ اس لئے تعبیر میں غلطی ہوئی ہے۔ کشف میں غلطی نہیں تھی"۔

اس سے معلوم ہوا کہ تعبیر کشف میں اعداد و شمار کو بھی دخل ہے۔ اس لئے معبر کو بہت سی چیزیں دیکھنی ہوتی ہیں، آیات و احادیث سے استدلال، موسمی اختلاف کو سامنے رکھنا، اعداد و شمار کا خیال رکھنا۔ بہرحال یہ ایک مستقل فن ہے جو معبر ہی جانتا ہے۔ اس لئے خواب ہمیشہ کسی ایسے آدمی سے ذکر کرنا چاہئے جس کو اس عالم شہادت سے بھی مناسبت ہو اور عالم مثال سے بھی ہو، تو وہ مطابقت اور تطبیق دے کر صحیح تعبیر دے سکتا ہے۔

روحانی لحاظ سے رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمگیر آثار...... حضور سرکار کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمت عامہ ہونے کی بڑی دلیل تو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں ارشاد فرمایا: اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ. ① "اللہ نے سب سے پہلے میری حقیقت پیدا فرمائی"۔

① حدیث کی تخریج گذر چکی ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ "نور" سے مراد حسی نور تو نہیں ہو سکتا جو آنکھوں سے نظر آتا ہے جیسے چاند اور سورج کا نور، اس حسی نور کی نور معنوی کے سامنے کوئی حقیقت نہیں۔ اس لئے کہ آفتاب اپنے نور اور روشنی سے صورتیں اور شکلیں دکھاتا ہے اور نور علم سے اشیاء کی حقیقتیں اور ماہیتیں کھلتی ہیں، اس لئے علم کا نور آفتاب و ماہتاب کے نور سے بہت زیادہ وسیع ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ حق تعالیٰ نے اول میرے نور کو پیدا کیا۔ کہ وہ "نور علمی" ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں علم کوندھ دیا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو "مجسم علم" بنایا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ آپ کی شریعت کے ہر ہر حکم کے پیچھے حکمت ہے۔ ہر حکمت کے پیچھے حقیقت ہے ہر حقیقت کے پیچھے علت ہے جس پر حکم کا مدار ہے۔ اس طرح پوری شریعت علم سے لبریز ہے۔ حتیٰ کہ معجزہ بھی آپ کو علمی دیا گیا۔ جہاں ہزاروں معجزات دیئے گئے جن کا اثر آسمانوں میں بھی ظاہر ہوا۔ زمین میں بھی ظاہر ہوا۔ حجر وشجر اور حیوانات میں بھی ظاہر ہوا۔ اسی لئے حیوانات نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی شہادت دی۔ چاند کے دو ٹکڑے ہونے کے معجزات کا اثر آسمانوں تک پہنچا، غرض یہ معجزات تو ایک طرف ہیں۔ لیکن سب سے بڑا معجزہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطاء کیا گیا یہ علمی اور کلامی معجزہ ہے جو قرآن کریم ہے، جو اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اپنی جامعیت احکام کے لحاظ سے غرض ہر اعتبار سے ایک عظیم معجزہ ہے۔ تو حقیقت میں علم کوندھ دیا گیا اور معجزہ علمی دیا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سراپا علم ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ علم ہی سے دنیا چل رہی ہے۔ حق تعالیٰ کے علم و حکمت اور مشیت ہی پر یہ سارے کاروبار اور کارخانے چل رہے ہیں۔ اس لئے علم اللہ کی سب سے اونچی صفت ہے۔ ویسے تو ساری صفات ان کی بلند ہیں مگر علم سب سے اونچی صفت ہے۔ اس واسطے کہ ہر صفت اپنی کارگزاری میں علم کی محتاج ہے۔ مثلاً ارادہ ہے تو اس وقت تک نہیں کریں گے، جب تک مراد معلوم نہ ہو۔ قدرت ہے جب تک مقدور معلوم نہ ہو اس پر قدرت کیسے حاصل ہوگی؟ تو ارادہ و قدرت علم کا محتاج ہوا۔ فعل ہے جب تک علم نہ ہو وہ سرزد نہیں ہو سکتا۔ لیکن علم اپنا کام کرنے میں کسی صفت کا محتاج نہیں۔ نہ ارادے کا نہ قدرت کا۔ مثلاً آپ ریل میں جا رہے ہیں اور ایک بڑا دریا نظر پڑے۔ تو ارادہ کریں تب معلوم ہو کہ یہ دریا ہے۔ ارادہ نہ کریں تب معلوم نہ ہو یہ دریا ہے۔ وہ تو خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ اس لئے علم اپنا کام کرنے میں ارادے کا محتاج نہیں۔ اسی طرح سے قدرت کا محتاج نہیں کہ اس تالاب پر آپ کو قدرت ہو جائے۔ تو معلوم ہو کہ یہ تالاب ہے۔ ورنہ معلوم نہ ہو۔ قدرت ہو نہ ہو جب سامنے آئے گا تو علم ہو جائے گا۔

غرض ہر صفت علم کی محتاج ہے کہ وہ علم کے بغیر کام نہیں کر سکتی۔ علم کسی صفت کا محتاج نہیں بلکہ غنی ہے۔ اس لئے ساری صفات اور سارے کمالات علم ہی کے تابع ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں علم کوندھ دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر نبوت اور ولایت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محتاج ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اللہ تعالیٰ نے علمی اور عملی کمالات دیئے ہیں۔ اگر ایک بھی ولی دنیا میں نہ ہو

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات بدستور ہیں۔ اگر ایک بھی صحابی رضی اللہ عنہ نہ ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات بدستور تھے۔ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علمی کمالات کسی چیز کے محتاج نہیں۔ آپ کے اندر غناء ہے جبکہ ہر چیز علم کی محتاج ہے۔ جب آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ یہ جائز ہے یا ناجائز، حلال ہے یا حرام، تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے بتلانے سے پتہ چلے گا۔ غرض ساری دنیا محتاج ہوئی حتیٰ کہ نبوتیں بھی محتاج ہوئیں۔

گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت جو ہے وہ ذاتی ہے اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی نبوتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے تابع ہیں جو درحقیقت آپ ہی کا فیضان ہے، تو آپ کے فیضان سے پچھلوں میں تو نبوتیں پیدا ہوئیں اور اگلوں میں ولایتیں پیدا ہوئیں۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ انبیاء علیہم السلام بھی محتاج اور اولیاء بھی محتاج۔

یہی وجہ ہے کہ لیلۃ المعراج میں تمام انبیاء علیہم السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو امام بنایا گیا۔ اور اس میں انبیاء علیہم السلام نے تقریریں کیں۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ مجھے اللہ نے "صفی اللہ" بنایا اور مجھے اپنی قدرت سے پیدا کیا۔ مجھے اولاد دی تو دنیا اولاد سے بھر دی۔ یہ میرے فضائل ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھ سے اللہ نے کلام کیا۔ مجھے مکلم (بات کرنے والا) بنایا، کلام کی توفیق دی اور طور پر مجھ سے بات چیت ہوئی، مجھے اور میرے ماننے والوں کو بحر قلزم میں نجات دی اور فرعون کو غرق کیا۔ غرض انہوں نے یہ اپنے فضائل بیان کئے۔

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے فضائل بیان کئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا ملک دیا کہ کسی کو ویسا ملک نہیں ملا۔ ہواؤں پر مجھے قدرت دی جانوروں پر مجھے قدرت دی، سب میری رعایا میں داخل ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے فضائل بیان کئے کہ مجھے اللہ نے "روح اللہ" بنایا مجھے بلا باپ کے قدرت سے پیدا فرمایا۔ جب یہ سب بیان کر چکے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فضائل بیان فرمائے کہ مجھے "رحمۃ للعالمین" بنایا، مجھے "شفیع المذنبین" بنایا۔ مجھے "خاتم النبیین" بنایا۔ میری نبوت کو اصلی بنایا اور نبوتیں تابع کیں، تو سب نے کہا کہ یہی وجہ ہے اور بنیاد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سارے انبیاء علیہم السلام پر افضل ہیں۔

غرض پہلی رحمت تو یہی ہے کہ دنیا میں ہر کمال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کی وساطت سے پیدا کیا گیا، دنیا میں جو کچھ ہے وہ کمال ہی سے چل رہا ہے، نقصان اور عیب سے دنیا نہیں چل رہی اور کمالات سارے علم کے تابع ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم سے ازل سے لے کر ابد تک روشنی پھیلی۔ تو پہلی رحمت تو یہی ہوئی۔

مادی لحاظ سے رحمتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمگیر آثار...... دوسرے یہ کہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ محدث نے روایت نقل کی ہے کہ: ﴿لَوْلَاکَ یَا مُحَمَّدُ لَمَا خَلَقْتُ اٰدَمَ﴾ ① اے محمد! (صلی اللہ علیہ

① علامہ عجلونی اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: قال الصغانی موضوع، وأقول لکن معناہ صحیح وإن لم یکن حدیثا، دیکھئے: کشف الخفاء ج:۲ ص:۱۶۴.

وسلم) اگر آپ کو پیدا نہ کرتا تو میں آدم کو بھی پیدا نہ کرتا۔ گویا پیدائش اور وجود در حقیقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ہوا۔ تو وجود اور زندگی کی نعمت اتنی بڑی نعمت ہے کہ دنیا کی کوئی نعمت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

تو جب وجود سب سے بڑی نعمت ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحمۃ للعالمین ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔ غرض مادی اعتبار سے دیکھا جائے تو وجود کی دولت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں ملی۔ روحانی نعمتوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو کمالات بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں پیدا ہوئے۔ تو مادی لحاظ سے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔ روحانی طور پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔

عالم آخرت میں رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمگیر آثار...... پھر یہ کہ قیامت کے دن شفاعت کبریٰ کا مقام آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو دیا جائے گا۔ تمام امتوں کے صلحاء کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت کریں گے۔ میدان محشر میں سب لوگ کھڑے ہوں گے اور زمین پر ساری مخلوق اس طرح سے ہوگی کہ نہ جھک سکتے ہیں، نہ بیٹھ سکتے ہیں، اور نہ لیٹ سکتے ہیں۔ اور آفتاب کی گرمی انتہا کو پہنچی ہوئی ہوگی۔ لوگ پسینے میں غرق ہوں گے۔ اور اس طرح چالیس برس کا عرصہ گزر جائے گا۔ اس وقت لوگوں کے دلوں میں آئے گا کہ کسی سے شفاعت کراؤ۔ تو حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور عرض کریں گے کہ:

''اللہ نے آپ کو ہم سب کے لئے باپ بنایا۔ باپ کی شفقت والفت معلوم ومتعین ہے۔ آپ علیہ السلام ہماری سفارش کریں کہ اس مصیبت سے نجات ملے''۔

وہ فرمائیں گے: ''لَسْتُ لَهَا''۔ ''میں اس کا اہل نہیں ہوں'' میں نے ایک غلطی کی تھی۔ گو وہ معصیت تو نہیں کی تھی مگر ایک لغزش تھی، جس درخت کی ممانعت کی گئی تھی وہ کھالیا تھا۔ اور معصیت نہیں تھی کہ معصیت حکم کی خلاف ورزی کرنے کو کہتے ہیں۔ حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔ شیطان نے اس میں تاویل سکھائی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس درخت کے کھانے سے اس لئے روکا ہے کہ اس کے کھانے سے آدمی کو دوامی زندگی ملتی ہے۔ تو یہ ممانعت جو تھی وقتی تھی۔ آپ میں اس وقت تک اتنی استعداد نہیں تھی۔ اب جنت میں رہتے رہتے استعداد پیدا ہوگئی، اب کھالینے میں کوئی حرج نہیں۔

تو تاویل کے راستے سے کھایا اور تاویل کے راستے سے کوئی کام کرنا معصیت نہیں ہوتا، خطاء فکری اور خطاء اجتہادی ہوتی ہے اور خطاء اجتہادی معصیت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ مجتہد اگر صواب کرے تو دوہرا اجر ملتا ہے، خطا پر ایک اجر ملتا ہے۔ تو معصیت پر اجر تھوڑا ہی مل سکتا ہے؟ اس لئے معصیت تو نہیں تھی۔ خطاء فکری واجتہادی تھی۔ وہ مجھ سے سرزد ہوگئی۔ تو اسے پیش کریں گے کہ میرا منہ اس قابل نہیں ہے، کہ میں اللہ سے جا کر تمہاری سفارش کروں۔ میں اس کا اہل نہیں تم حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ پھر لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس حاضر ہوں گے وہ بھی عذر کر دیں گے کہ:

"لَسْتُ لَهَا:" "میں اس کا اہل نہیں"۔ میں نے طوفان کے وقت اپنے بیٹے کو بلا لیا تھا اور حق تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ.﴾ ① "جب یہ کفر میں مبتلا ہے تو تمہاری اولاد نہیں رہا"۔ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ جاہلوں کی سی باتیں مت کرو، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں۔ تو حضرت نوح علیہ السلام نے اسی وقت استغفار کیا۔ تو حضرت نوح علیہ السلام فرمائیں گے کہ مجھ سے یہ خطاء سرزد ہوئی تھی۔ میرا منہ نہیں ہے کہ میں سفارشی بن کر جاؤں اگر مجھے کہا تم نے تو غلطی کی تھی تمہاری شفاعت کا کیا منہ ہے، تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ۔

وہ بھی عذر کر دیں گے کہ "لَسْتُ لَهَا" میرے سے فلاں لغزش ہوگئی تھی"۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے تو وہ کہیں گے میں نے ایک قبطی کو تھپڑ مارا تھا۔ اس کی گردن اڑ گئی حالانکہ وہ خطاء عمداً نہیں کی تھی کہ اسے قتل کیا ہو مگر نبی کا ہاتھ اتنا قوی ہوتا ہے کہ وہ تلوار سے زیادہ کام کرتا ہے۔ اس لئے اس کی گردن اڑ گئی۔ اس لئے میرا منہ نہیں ہے کہ میں جا کر سفارش کے سلسلہ میں کچھ عرض کروں۔

حق تعالیٰ فرمائیں گے تم نے قتل کیا تھا۔ تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ وہ انبیاء بنی اسرائیل کے خاتم ہیں۔ مگر جب لوگ ان کے پاس آئیں گے تو وہ فرمائیں گے۔ "لَسْتُ لَهَا" "میں اس قابل نہیں ہوں"۔ میری قوم نے مجھے خدا اور اس کا بیٹا کہا۔ اگر یہ فرما دیا گیا کہ اچھا آپ وہی ہیں جنہیں ہماری مسند پر خدا بنا کر بٹھایا گیا تھا؟ کیا وہ آپ ہی ہیں جنہیں خدا کا بیٹا کہا گیا تھا؟ حالانکہ اللہ بیٹے اور باپ سے بری ہے۔

تو میرا منہ اس قابل نہیں کہ میں سامنے ہوں۔ اس لئے تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ کہ وہ خاتم الانبیاء ہیں، تو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں کہ "اَنَا لَهَا اَنَا لَهَا" "میں اس کا اہل ہوں" میں سفارش کروں گا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مقام محمود پر فائز کئے جائیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سات دن رات کی لمبی مدت تک میں سجدے میں پڑا رہوں گا اور اللہ کی وہ حمد و ثناء بیان کروں گا کہ عالم میں کسی نے نہیں کی ہوگی اور اب میرے دل میں بھی نہیں ہے۔ اسی وقت القاء کی جائے گی۔

مگر اس قدر رعنا کا دن ہوگا کہ سات دن آپ سجدے میں رہیں گے اور کچھ نہیں کہا جائے گا۔ سات دن کے بعد اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمائیں گے کہ:

"يَا مُحَمَّدُ! اِرْفَعْ رَاْسَكَ سَلْ تُعْطَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ" ② "سر اٹھاؤ۔ سوال کرو ہم عطا کریں گے۔ شفاعت کرو تو ہم قبول کریں گے"۔ غرض پورے عالم میں صلحاء کے لئے خواہ وہ کسی بھی امت کے ہوں آپ شفاعت فرمائیں گے۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم اب حساب شروع کرتے ہیں اور جس کا جو ٹھکانہ ہوگا۔ وہ وہاں پہنچ جائے

① پارہ: ۱۲، سورۃ ھود، الآیۃ: ۴۶۔ ② الصحیح للبخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: لما خلقت بیدی، ج: ۲۲، ص: ۱۸۳۔

گا۔ غرض یہ شفاعت کبریٰ کا مقام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوگا۔ اس دن آخرت میں سب اولین وآخرین پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اور آپ کی سیادت پورے عالم پر ظاہر ہوگی۔ اس وقت جو منکر کفار ہوں گے وہ حسرت میں پڑیں گے کہ کیوں نہ ہم ایمان لائے۔ تو یہ تیسری ''رحمت عامہ'' ہے جو پورے عالم پر متوجہ ہوگی۔

رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ابدی آثار...... اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سب سے پہلا میں ہوں گا جو جا کر جنت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا اور کہوں گا کہ دروازہ کھولو۔ پھر امتیں داخل ہونا شروع ہوں گی۔ گویا جنت میں داخلہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے طفیل ہوگا، اسی طرح ابد تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت پہنچی ہوئی ہے۔

رحمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ازلی آثار...... اور ازل سے رحمت یہ ہے کہ جب ''عہد اَلَسْتُ'' کیا گیا اور حق تعالیٰ نے فرمایا ''اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ'' ۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ ساری مخلوق کو آدم علیہ السلام کی کمر سے نکالا اور جمع کیا اور فرمایا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ کیا جواب دیں۔ اس لئے کہ آدم کی کمر سے نکلے ہوئے اس وقت کوئی عقل و شعور نہیں تھا اور صفت ربوبیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو حیرانی پیدا ہوگئی تو سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی جواب دیا کہ۔ ''بَلٰی'''' کیوں نہیں، بیشک آپ ہمارے رب ہیں''۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب دیتے ہی تمام انبیاء علیہم السلام کی زبان پر جاری ہوگیا ''بَلٰی بَلٰی'' بے شک آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ اس کے بعد ساری مخلوق نے زبان سے کہا ''بلٰی'' آپ ہی ہمارے رب ہیں۔

حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہیں اور تمہارے باپ کو گواہ کرتا ہوں کہ تم نے میری ربوبیت کا اقرار کرلیا اس آسمان و زمین کو گواہ بناتا ہوں کہ تم نے میری ربوبیت کا اقرار کرلیا۔ اور اس ساری مخلوق کو گواہ بناتا ہوں کہ تم نے اقرار کیا۔ جب تم دنیا میں پہنچو تو اس اقرار کو یاد رکھنا اور میرے رب ہونے کو ماننا اور میری تقدیر پر راضی رہنا۔ غرض اس وقت سب نے بلٰی کا لفظ اختیار کیا اور سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے اختیار کیا۔

تو رحمۃ للعالمین ہونے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کے جواب دینے کے قابل جب ہوئے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب سکھلایا۔ تو حق تعالیٰ نے تو تعلیم کے ذریعے سے ربوبیت کا اقرار کرایا۔ اس لئے رحمت عامہ ہونے کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوسکتی ہے؟۔ غرض ازل میں بھی رحمت، دنیا میں تشریف لائے تب رحمت، برزخ میں پہنچیں گے تب رحمت۔ شب معراج میں پہنچے تب رحمت، قیامت کے دن شفاعت کبریٰ ہوگی تب رحمت اور ''اَوَّلُ مَنْ یَدُقُّ بَابَ الْجَنَّةِ'' ۔① ''کہ سب سے پہلے آپ جنت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے''۔ تب رحمت، غرض اول سے لے کر آخر تک رحمت ہی رحمت ثابت ہے۔

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم...... اسی واسطے یہ نہیں فرمایا کہ آپ رحمت عالم ہیں بلکہ فرمایا کہ آپ''

① کنز العمال، ج: ۱۱، ص: ۴۰۳، رقم: ۳۱۸۸۶. (ابن النجار عن انس.)

رحمۃ للعالمین'' ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ملائکہ کے لئے بھی رحمت، عالم جنات کے لئے بھی رحمت، عالم حیوانات کے لیے بھی رحمت، عالم بشر کے لیے بھی رحمت، غرض جتنے عالم اللہ نے بنائے ہیں سب کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت ہیں۔ جب وجود ہی ہر چیز کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں ہوا تو ہر چیز مرہون منت اور مرہون احسان ہے، اس واسطے آپ کی رحمۃ للعالمینی ازل سے چلی اور ابد تک چلتی رہے گی۔ قیامت پر ختم نہیں ہوگی بلکہ جنتوں میں بھی چلے گی۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ حافظ قرآن سے کہا جائے گا۔ رَتِّـلْ وَارْتَـقِ۔ ① ''تلاوت کرتا جا اور جنت کے درجات طے کرتا جا''۔ ظاہر بات ہے کہ قرآن کریم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی لے کر تشریف لائے۔ تو مدارج کی ترقی قرآن کریم کے ذریعے ہوئی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے دنیا کو پہنچا۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ قرآن کریم کی جتنی آیات ہیں، جنت کے اتنے ہی درجات ہیں۔ اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ جو آیتیں ہیں یہی بعینہٖ جنت میں درجات کی صورت میں منکشف ہو جائیں گی۔ یہاں یہ آیتیں علمی شکل میں ہیں، وہاں جا کر باغ و بہار کی شکل اختیار کریں گی۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ اور قوموں تو جنت میں داخل کی جائیں گی اور مسلم حفاظ کے سینوں میں خود جنت آئی ہوئی ہے۔ جو یہ قرآن کریم ہے۔ اس کی آیات ہی جنت بنیں گی۔

تو یہ سب رحمۃ للعالمین ہی کی شان کا ظہور ہے۔ غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت قلوب سے لے کر قوالب تک (ڈھانچہ) ازل سے لے کر ابد تک، دنیا سے لے کر برزخ تک پھیلی ہوئی ہے، اسی لئے رحمۃ للعالمین کہا گیا، رحمۃ للعوالم نہیں کہا گیا۔ اس میں تمام عالم داخل ہیں۔

اللہ نے سب سے بڑا احسان جو مخلوق کو دیا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مسعود ہے جو عطا کیا گیا۔ اور اسی لئے فرمایا کہ جب کسی کے اوپر کوئی مصیبت آئے یا کوئی غم طاری ہو تو وہ میری وفات کو یاد کرے، کہ اس سے بڑا صدمہ عالم کے لئے نہیں ہے۔

حقیقت توسل......توسل کا ایک تو مطلب یہ ہے جو دنیا میں ہوتا ہے کہ جو شفاعت کے طور پر کسی کا وسیلہ پکڑتے ہیں تو وہ جانتے ہیں کہ حاکم پر اس کا اثر ہے۔ حاکم اس کی بات کو مان لے گا۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ معنی تو نہیں ہو سکتے۔ یہ شرک میں بھی داخل ہے۔ حق تعالیٰ پر کس کا اثر ہو سکتا ہے؟ وہ خود موثر بالذات ہیں ان پر کون موثر ہو سکتا ہے۔ اس لئے وسیلہ کا یہ مطلب تو نہیں ہوگا۔ یہاں تو توسل کا مطلب یہ ہوگا کہ جس رحمت سے آپ نے ان لوگوں کو نوازا ہے، اس میں مجھے بھی حصہ عطا فرما دیجئے کہ میں بھی اس رحمت سے نوازا جاؤں۔ وسیلے کے یہاں یہ معنی ہیں تو یہ معنی کہ وہ وسیلے والا حق تعالیٰ پر اثر رکھتا ہے، اس کے دربار میں تو سب بندے ہیں اور سب محتاج ہیں۔

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام جو سب سے زیادہ مقدس طبقہ اور حق تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ مقرب ہیں۔

---

① السنن للترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فیمن قرأ حرفاً من القرآن، ج: ۱۰، ص: ۱۵۶۔

لیکن قیامت کے دن صورت یہ ہوگی کہ انبیاء کرام علیہم السلام اس طرح تھرتھرائے ہوئے ہوں گے جیسے میدان میں پڑا ہوا پتہ۔

حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ تورات کہاں ہے؟ وہ عرض کریں گے میں نے تو موسیٰ علیہ السلام کو پہنچادی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا جائے گا کہ آپ کو تورات پہنچی؟ وہ عرض کریں گے، جی ہاں پہنچی۔ پھر آپ نے کیا کیا؟ عرض کریں گے۔ میں نے امت کو پہنچادی۔ غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب طلب کیا جائے گا تو کیفیت یہ ہوگی کہ اس طرح تھراتھرائے ہوں گے جیسے میدان میں پڑا ہوا پتہ تھرتھرکانپتا ہے۔ یہی صورتحال اور انبیا علیہم السلام کی بھی ہوگی۔

اسی طرح سے قرآن کریم کے بارے میں بھی حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ قرآن کریم کہاں ہے؟ عرض کریں گے میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر پہنچادیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم طلب کئے جائیں گے اور پوچھا جائے گا آپ تک قرآن کریم پہنچا؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم عرض کریں گے، جی ہاں پہنچا۔ فرمایا جائے گا، آپ نے کیا کیا؟ عرض کریں گے، میں نے امت کو پہنچادیا۔ فرمایا جائے گا کہ اب بیٹھ کر سناؤ۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عرش کے نیچے منبر بچھایا جائے گا۔ سارے اولین وآخرین کے مجمع میں، آپ پورا قرآن کریم تلاوت فرمائیں گے۔

اب ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے اندر ایک تو لفظ ہیں، لفظوں کے نیچے ان کے معانی ہیں۔ معانی کے نیچے ان کے حقائق ہیں۔ حقائق کے نیچے اسرار ومصالح اور حکمتیں ہیں۔ یہ سب چیزیں مجسم کرکے نمایاں کی جائیں گی اور قرآن کریم ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک باغ وبہار کھڑا ہوا ہے۔ ہزاروں رنگ کے پھول اس میں کھلے ہوئے ہیں۔ ہزاروں خوشبوؤں سے معطر ہے۔ تو لوگ کہیں گے یہ قرآن تو آج تک ہم نے سنا ہی نہیں، یہ تو عجیب وغریب قرآن ہے۔ اس لئے کہ جب حق تعالیٰ شانہ، موجود حضرات انبیاء علیہم السلام موجود، اور ملائکہ علیہم السلام موجود تو روحانیت کی کیا انتہا ہوگی؟ پڑھنے والے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے تو روحانیت کا کیا مقام ہوگا؟ غرض جو ساری چیزیں علمی طور پر قلوب میں تھیں مجسم ہوکر سامنے آئیں گے۔ تو ایک عظیم باغ وبہار کی صورت میں قرآن نمایاں ہوگا۔ تو صحابہ رضی اللہ عنہ بھی کہیں گے کہ یہ قرآن تو ہم نے آج تک سنا ہی نہیں تھا۔

بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس وقت انبیاء علیہم السلام کی شان بھی یہ ہوگی کہ وہ مصیبت کی وجہ سے تھرتھرائے ہوئے ہوں گے تو پھر میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے؟ اس واسطے توسل کے یہ معنی نہیں ہوسکتے کہ صاحب وسیلہ کا اثر اللہ تعالیٰ پر پڑے گا۔ یہ تو دنیا کی حکومتوں میں ایسا ہوتا ہے۔ وہاں تو صرف، توسل کے یہ معنی ہوں گے کہ جس رحمت وبرکت سے آپ نے ان بزرگوں کو نوازا ہے، اس میں ہم غریبوں کو بھی شامل فرمالیجئے، کچھ حصہ ہمیں بھی مل جائے نہ یہ معنی کہ ہم اثر ڈالتے ہیں اور حق تعالیٰ ہماری سفارش سے مجبور ہوجائیں گے۔ حق تعالیٰ

جابر ہیں مجبور نہیں ہیں۔ قاہر ہیں مقہور نہیں ہیں۔

مقہور و مجبور تو بندے ہیں۔ اس لئے توسل کے یہ معنی کہ اللہ پر اثر ہو یہ تو شرک ہے اور ایک یہ کہ اس توسل کی نعمت میں ہمیں داخل فرما لیجئے، یہ دعا اور استدعاء ہے یہ عبدیت اور بندگی میں داخل ہے۔ اس توسل میں کوئی حرج نہیں ہے اس کی شریعت نے اجازت دی ہے توسل کے اس معنی کے لحاظ سے آپ یہاں بیٹھ کر دعا مانگیں، خواہ کسی قبر پر جا کر مانگیں وہ جائز ہے یہاں بھی جائز ہے، قبر پر بھی جائز ہے۔ قبر والے کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ میرا یہ کام کر دیں اس کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن یہ کہ حق تعالیٰ سے مانگے کہ جس نعمت سے آپ نے انہیں نوازا ہے اس نعمت سے مجھے بھی نواز دیجئے۔ اس توسل کی اجازت دی گئی ہے۔

میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلوس؟...... عید میلاد النبی پر جلوس اور مجلس وغیرہ یہ سارے مظاہرات ہیں جیسے دنیا میں نمائشی مظاہرے ہوتے ہیں۔ اسلام کے مزاج میں یہ چیزیں داخل نہیں ہیں۔ اگر یہ چیزیں اسلامی مزاج کے مطابق ہوتیں، تو سب سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کرتے، تابعین رحمہم اللہ کرتے، آئمہ مجتہدین کرتے۔

لیکن کسی سے منقول نہیں بلکہ چند صدیوں کے بعد یہ مظاہرے شروع ہوئے۔ ان مظاہروں میں بھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ بھائی! کر لیں۔ لیکن یہ جو نمائشی صورتیں ہیں اور غلو ہے یہ اسلامی مزاج نہیں ہے۔ یہ دوسری اقوام سے لیا گیا ہے جیسے ہندوؤں میں جلوس نکلتے ہیں۔ ان کے جو مقتدی ہیں ان کی صورتیں بنا بنا کر اونٹوں پر اور ہاتھیوں پر رکھتے ہیں اور مظاہرے کرتے ہیں۔ اسلام تو حقائق لے کر آیا ہے، صورتوں اور شکلوں کی نمائش لے کر نہیں آیا۔ اپنے اندر حقیقت پیدا کرو۔ نمائش خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اسلام کا موضوع تو یہ ہے کہ جو خدا کی بنائی ہوئی صورتیں ہیں ان میں بھی زیادہ مت الجھو۔ اسی لئے بعض علماء لکھتے ہیں اگر صورتوں کے عشق و محبت میں مبتلا ہوا تو حسن خاتمہ کے اندر فرق پڑ جائے گا۔ اس لئے کہ وہ حقیقت تک پہنچنے کا وقت ہے اور آپ صورتوں میں الجھے ہوئے ہیں تو صورتیں حقیقت سے روکیں گی۔ اس واسطے اسلام کا موضوع یہ ہے کہ صورتوں کی طرف التفات مت کرو۔ حقائق کی طرف التفات کرو جو دائمی اور ابدی ہیں۔

اکمالِ دین کا طریق...... سوال اوّل...... ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾۔ ① یہ آیت قرآن میں اپنی جگہ سب سے آخر میں چاہتی ہے، ورنہ اس کی موجودہ جگہ قرآن کے غیر مرتب ہونے پر دال ہوگی؟

جواب اَلْيَوْمَ سے خاص یوم نزول آیت مراد نہیں، بلکہ مطلقاً دورِ حاضر مراد ہے اور وہ عام ہے، وقت نزول کو بھی اور نزول آیت کے ماقبل و مابعد کے زمانے کو بھی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کہا کرتے ہیں کہ "آج بڑا نازک زمانہ ہے" یا "آج لوگوں کو بھلا کام کرنا دشوار ہو گیا ہے"۔ "یا آج کا دن تو وہ ہے کہ بھیڑیوں نے بھی انسانوں سے پناہ مانگی ہے"۔ ظاہر ہے کہ اس سے یوم تکلم کی تاریخ مراد نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ دور مراد ہوتا ہے جس سے متکلم اور

① پارہ: ٦، سورة المائدة، الآية: ٣.

مخاطب گزر رہے ہوتے ہیں۔ پس یہاں بھی ''الیوم'' سے مراد وہ دورِ حاضر ہے جس سے مخاطبین قرآن گزر رہے تھے، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا آخری حصہ نہ کہ خاص یوم نزول آیت۔ چناں چہ اس آیت کے نزول کے تقریباً ۹۰ دن بعد حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ اس صورت میں اگر اس آیت کے نزول کے بعد اور بھی کچھ آیتیں اتریں تو وہ اکمال دین کے منافی ثابت نہیں ہوسکتیں، ورنہ ہی دائرہ اکمال سے خارج ہوسکتی ہیں۔ اس لئے یوم نزولِ آیت سے پہلا اور پچھلا سارا دین ''اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ'' میں داخل رہے گا۔ گویہ آیت درمیان میں آجائے اور سب سے اخیر میں نہ رہے۔

تشہیرِ اکمالِ دین...... رہا یہ کہ اس آیت کے نزول کا وقت کلیتہً آخر میں، بلکہ یوم وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کیوں نہ رکھا گیا کہ ظاہر طور پر بھی اس آیت سے پورے دین کی تکمیل کا اعلان ہوجاتا اور ''الیـــوم'' کے معنی مطلقاً دورِ حاضر کے نہ لینے پڑتے؟ جواب یہ ہے کہ اس آیت سے فقط اکمال دین کی کوئی علمی یا اعتقادی خبر ہی دینی مقصود نہ تھی۔ بلکہ اکمال دین کا پورا پورا اشتہار بھی مقصود تھا اور اس کے لئے یوم نزول سے بڑھ کر دوسرا کوئی وقت موزوں نہیں ہوسکتا تھا، کیوں کہ یہ یوم عرفہ تھا جس میں حج کے لئے اطراف سے لوگ جمع ہوئے تھے، پھر اوپر سے یوم جمعہ بھی تھا۔ جو خود یوم جامع ہے اور اس پر مزید یہ کہ حج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا دن تھا جس میں ایک لاکھ سے اوپر صحابہ رضی اللہ عنہم کے عدد کی اکثریت حج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے شریک حج ہوئی۔

پس اس یوم جامع میں تمام جمع شدہ مسلمانوں کے روبرو ہیئت اجتماعی کے ساتھ عین وقت اجتماع میں ذات جامع پر یہ آیت اتار دی گئی، تاکہ بیک دم تمام مسلمین اولین اکمال دین کی اطلاع بھی پالیں اور اس کے نزول کا مشاہدہ کرکے ان کے دلوں میں یہ چیز اتر جائے کہ اب جبکہ یہ دین کامل ہوچکا ہے، تو اس کے بعد نہ دنیا میں کوئی نیا نبی و دین آنے والا ہے اور نہ آئے ہوئے دین میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی یا ترمیم و تنسیخ ہونے والی ہے۔ پس یہ اکمال دین کی اطلاع ہی نہیں تھی بلکہ اس کی تشہیر و دعایت اور نزول آیت کا مشاہدہ کرا کر اور ''عَــلٰـى رُؤُوْسِ الْاَشْهَـادِ'' مراد (واضح ثبوت) اسے نازل فرما کر یہ خبر شائع بھی کرنی تھی کہ اب نجات کا انحصار اسی دین میں ہے اور بس۔ ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ ①

اکمالِ دین کے بارے میں ازالہ تشکیک...... اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ اگر اسلام کا یہ بنیادی دعویٰ (اکمال دین) عین یوم وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سب سے آخر میں نازل کیا جاتا، تو قطع نظر اس کے بروقت اعلان عام نہ ہوسکنے کا ایک مفسدہ یہ بھی محتمل تھا کہ اگر اس دعویٰ کے اعلان میں کسی کو شبہ پیش آتا اور اس کی وہ شرح سامنے نہ آتی جو نزول آیت کے ۹۰ دن بعد تک ہوتی رہی، تو اس شبہ کے حل ہونے کی کوئی صورت نہ ہوتی اور ہوسکتا تھا کہ خود غرض تکمیل دین کے بارے میں شبہات ڈال کر دین کے اتمام و کمال کو مشتبہ بنا

① پارہ: ۳، سورۃ آل عمران، الآیۃ: ۸۵

دیتے اور بعد میں آنے والے تیس دجال جو بہ نص حدیث ادعاء نبوت کے ساتھ آنے والے تھے اپنا مطلب یہ کہہ کر نکال لیتے کہ دین کے آخری اور کامل ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ بعد میں کوئی نبی نہ آسکے یا اس دین کے بارے میں کوئی بیان اور شرح بھی نازل نہ ہو سکے۔ لیکن جب کہ اس آیت کے نزول کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹۰ دن اس دنیا میں قیام فرمایا اور اکمال دین کی حقیقت بعد کے کلمات سے اور زیادہ واضح فرمادی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اس کا آخری اور مکمل ہونا شرح صدر کے ساتھ سمجھ گئے اور گویا اس کی گنجائش دے دی گئی کہ اگر کسی کو اس اکمال میں شبہ یا شک ہو تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابھی دنیا میں موجود ہیں اور ان پر وحی بھی آرہی ہے۔ وہ اس شبہ کو رفع کر سکتا ہے۔ اس چیز نے دعوئے اکمال کو ہر قسم کے احتمالی شک وشبہ سے بھی پاک کر دیا۔ ورنہ جیسے حدیث قرطاس یوم وفات نبوی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے صادر ہوئی، اور اس کے بارہ میں بعد کے بیان سے لوگ تشنہ رہ گئے۔ بلکہ اس سلسلہ میں کچھ اختلاف رائے بھی ہو گیا جس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر روافض نے اسے ملعبہ اور ایجاد فتنہ کا حیلہ بنالیا۔ محض اس لئے کہ قرب وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے اس کا کوئی بیان یا کوئی شرح سامنے نہ آسکی جو عوام کی زبان بندی کر سکے۔

ایسے ہی اگر یہ آیت بھی جس میں اسلام کی تکمیل اور مدار نجات ہونے کا بنیادی دعویٰ تھا۔ عین وفات کے دن آخری ساعتوں میں نازل ہوتی اور بعد کی شرح سامنے نہ آتی تو ممکن تھا کہ اکمال دین کے بارہ میں احتمالات اور تشکیک پیدا کر کے عوام کو فتنے میں مبتلا کیا جاتا اور دجالین وقت اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے۔ جبکہ نزول کے تقریباً ۹۰ دن بعد تک حضور کو دنیا میں رکھا گیا۔ وحی اترتی رہی اور اس مقصد کی شرح حد تکمیل کو پہنچتی رہی۔ تو اس قسم کے احتمالات اور شکوک کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

بہر حال آیت کا نزول تو حجۃ الوداع کے موقع پر رکھا گیا تا کہ ایک وقت میں "ایک مکان میں مسلمانوں کے تمام خواص وعوام کے جمع شدہ مجمع میں اکمال دین کا اعلان ہو جائے کہ اس اجتماع کے بعد حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پھر ایسا اجتماع ہونے والا نہ تھا۔ پھر بعد نزول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ عرصہ دنیا میں قائم رکھ کر متعلقہ شکوک وشبہات کے تمام احتمالات کو قطع کرنا منظور تھا، کہ عین یوم وفات میں نزول ہونے سے ایسے محتمل شبہات قطع نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر "الیـــوم" سے یوم خاص نہیں بلکہ دور حاضر مراد لیا گیا تا کہ بعد کی اترنے والی بھی ساری آیتیں اس دائرہ اکمال میں داخل رہیں اور دین پورے کا پورا اپنے اجزاء وسمیت کامل پکارا جائے، اندریں صورت قرآن کی ترتیب میں خواہ وہ نزول کی ترتیب ہو یا تدوین کی ترتیب ہو، کوئی رخنہ نہیں پڑتا۔

خلق وکسب...... سوال دوم...... ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ﴾ ① آیت سے بندہ کے جبر اور اس کے مجرم نہ ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا کفر خدا کی طرف سے ہے۔ جواب۔ اس آیت سے بندہ مجبور محض

① پارہ: ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۷.

ثابت نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ یہ ختم اور مہر زدگی اگر چہ خدا کی طرف سے ہے اور اسی کی تخلیق وایجاد سے عمل میں آئی ہے۔ مگر اس کا یہ خلق مرتب ہوا ہے بندہ کے کسب پر یعنی بندہ نے کفریہ حرکات کرتے کرتے اپنی استعداد قبول حق فنا کر لی، تو خدا کا آخری فعل اس پر بصورت ختم مرتب ہوا۔ پس بندہ اس فناء استعداد کا سبب ہے اور خدا خالق ہے، پھر نہ صرف اس آخری فعل پر بلکہ ابتداء سے لے کر انتہا تک یہ کسب وخلق جمع چلے آ رہے ہیں۔ جب بھی بندہ کسی ایمانی یا کفری حرکت کا اکتساب کرتا ہے حق تعالیٰ اس کے فعل کو وجود دے دیتے ہیں یعنی پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ ارادہ کرتا ہے تو اسکے ارادے کو وجود دیدیتے ہیں، ارادے کے بعد وہ فعل کرتا ہے تو اس کے فعل کو پیدا کر دیتے ہیں۔ گویا بندہ جیسے اپنے افعال میں آزاد ہے، ایسے ہی اس کے افعال قلب وقالب کے ظہور اور وجود پر بھی حق تعالیٰ نے کوئی پابندی عائد نہیں فرمائی۔ ورنہ اگر بندہ کے کسب پر اللہ کا خلق وایجاد اور وجود بخشی مرتب نہ ہو تو بندہ مجبور محض ٹھہر جائے اور وہ کچھ کر ہی نہ سکے۔

اور اسی طرح اس کے اندر جو خلقی جوہر اور مادے رکھے گئے تھے وہ نمایاں نہ ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ بخل بھی ہے اور خلاف عدل ایک ظلم بھی ہے کہ ایک شئے میں خدا تعالیٰ اچھے برے مادے تو رکھ دے مگر انہیں نمایاں ہونے کا موقع نہ دے۔ حالاں کہ اس کی بارگاہ بخل اور ظلم سے پاک اور بری ہے۔ پس بندہ کی مجبوری اس میں تو نکل سکتی ہے کہ وہ کسی فعل کا قصد کرے اور وہ فعل نمایاں نہ ہو، نہ اس میں کہ وہ جب بھی کوئی فعل کرنا چاہے تو اس کے ظاہری وباطنی قویٰ پر کوئی پابندی عائد نہ ہو، بلکہ قدرت ہر وقت اس کی مدد کے لئے تیار ہے کہ ادھر اس نے عزم فعل کیا اور ادھر اچانک وہ فعل اس سے نمایاں ہو گیا۔ یعنی بندہ کے کسب اور خدا کے خلق میں کوئی فاصلہ یا وقفہ درمیان میں حائل نہیں ہوتا، ادھر کسب عبد ہوا ادھر معاً خلق ظاہر ہو گیا۔ اس کی مثال ایسی سمجھئے جیسے بجلی کی روشنی میں سوئچ اور قمقمہ کی نسبت ہے کہ جیسے ہی سوئچ ہلایا ویسے ہی معاً آن کی آن میں قمقمہ روشن ہو گیا۔

پس حرکت سوئچ کسب عبد کی مثال ہے اور قمقمہ میں روشنی خلق الٰہی کی مثال ہے۔ یعنی جیسے سوئچ ہلانے والے کا روشنی بنانے یا پاور ہاؤس سے اس قمقمہ میں لا کر جلوہ گر کرنے میں کوئی ادنیٰ دخل نہیں۔ ایسے کسب افعال کرنے والے بندے کو ظہور افعال اور وجود نتائج میں کوئی دخل نہیں۔ اس کا کام صرف کسب ارادہ وفعل یعنی اکتسابی حرکت کرنا ہے، اس ارادے کی تخلیق وایجاد اور اس فعل کو وجود دینا خود بندے کا کام نہیں بلکہ خدا کا کام ہے۔

پس ایک بدعمل نے خالصانہ اور کافرانہ حرکات کا کسب شروع کیا تو خدا نے ان حرکات کو وجود بخشنا شروع فرمایا اور جب وہ اکتساب کفر کرتے کرتے اس حد پر آ گیا کہ اس کی قبول حق کی صلاحیت واستعداد ہی فنا ہو گئی۔ تو خدا نے اس فنا اور بطلان استعداد کو بھی وجود دے دیا اور پیدا کر دیا۔ بس اسی فناء استعداد کے فعل وایجاد کا نام ختم ہے کہ خدا نے اس پر مہر لگا دی کہ اب اس میں ایمان داخل نہ ہوگا۔

پس ایمان کے دروازے بندے نے خود اپنے اوپر اپنے کسب سے بند کئے۔ خدا تو اس کی حرکات کو وجود بخشتا

رہا نہ کہ خدا اس پر ایمان کے دروازے بند فرما تا رہا اور ظاہر ہے کہ جرم اور معصیت کسب شرور ہے نہ کہ خلق شرور کیوں کہ خلق کے معنی صرف وجود بخشنے اور عطاء وجود کے ہیں اور عطاء وجود کسی حالت میں بھی جرم یا برا نہیں ہوسکتا، ہاں خود شئے وجود یافتہ کبھی اپنی ذات سے بری ہوگی کبھی اچھی۔ مگر اسے وجود دینا کسی حال میں بھی برا نہ ہوگا کیوں کہ عطاء وجود احسان ہی احسان ہے، کہ وجود جیسی نعمت کسی شئے کو بخشی جائے، اور عدل ہی عدل ہے کہ ہر شئے کو اپنے چھپے ہوئے خلقی جوہر دکھلانے کا موقع دیا گیا ہے اور اس کی خاصیتوں کے ظہور پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ پس مجرم اگر ٹھہرتا ہے تو یہ کسب شرور کرنے والا بندہ ٹھہرتا ہے نہ کہ اس کسب کو وجود بخشنے والا خدا۔ حاصل یہ کہ اس بندہ کا کفر بلاشبہ خدا کی طرف سے ہے مگر تخلیقانہ کہ اکتساباً اور مجرم کاسب ہوتا ہے نہ کہ خالق اور معطی وجود۔

قرآن کریم کی ابتداء بالتسمیہ والحمد کی وجہ..... سوال سوم..... قرآن مجید حمد اور تسمیہ (بسم اللہ) سے شروع کیا گیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کلام باری نہیں لوگ اس کو تعلیم پر محمول کرتے ہیں مگر چوں کہ اس تاویل کے لئے کوئی دلیل نہیں۔ اس وجہ سے مخالف اس کو تسلیم نہیں کرسکتا اور نہ دل کو طمانیت حاصل ہوتی ہے۔

جواب..... تقریر اعتراض کو واضح نہیں کیا گیا کہ اس کے مطابق جواب دیا جائے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معترض خود بھی اپنے اعتراض کو سمجھتے ہوئے نہیں ہیں۔ بظاہر تقریر شبہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بھلا کوئی خود ہی اپنے کلام کو اپنے نام سے شروع کیا کرتا ہے یا اپنے نام سے خود ہی برکت حاصل کیا کرتا ہے یا مدد چاہا کرتا ہے؟ یعنی یہ انداز کلام عرف عام کے خلاف ہے۔

اول تو شبہ یوں بے اصل ہے کہ عرف ہر جگہ کا ہر قوم کا الگ ہوتا ہے، اگر ایک جگہ ایک دستور نہ ہو تو دوسری جگہ ممکن ہے کہ وہ ہو۔ پس ہوسکتا ہے کہ یہ قرآن کا عرف ہو کہ اپنے نام سے کلام کا آغاز کیا جائے۔

پھر یہ کہ شروع میں بسا اوقات متکلم اپنا نام ذکر کرتا ہے تا کہ بعد کے کلام کا تعارف اور نسبت مخاطبوں پر واضح ہو جائے جیسے اکثر خطوط اپنے نام سے شروع کئے جاتے ہیں، تا کہ بادّل وہلہ مخاطب سمجھ لے کہ یہ فلاں کا مضمون ہے۔ اس الجھن میں نہ رہے کہ لکھنے والا یا کہنے والا کون ہے؟

اس لئے آغاز کلام بہ تسمیہ الٰہی اس اصول پر قابل اعتراض نہ ہوا۔ مزید غور کیا جائے تو حقیقت یہ نظر آتی ہے کہ کسی عظیم یا مہم کام کا کسی بڑے نام یا بڑی نسبت یا بڑی صفت سے شروع کرنا عقلاً مستحسن ہی نہیں، بلکہ مطلوب سمجھا گیا ہے اور ایک فطری امر ہے چناں چہ اس پر آپ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بلکہ آپ اسے مستحسن اور معقول جانتے ہوں گے کہ بندے اپنے کلام کو خدا کے نام اور خدا کی ثناء وصفت سے شروع کریں جس سے اس امر کا فطری اور معقول ہونا واضح ہے۔

اور ظاہر ہے کہ فطرت اللہ کی ہے جس پر بندوں کو مفطور کیا گیا ہے۔ پس بندوں میں ہر فطرت خود اللہ ہی سے آئی ہے اس لئے اصل میں یہ ڈھنگ کہ آغاز کلام کسی بڑے نام یا بڑی نسبت وصفت سے ہو، اولاً خدا کے کلام کا ہونا چاہئے، بندے تو محض اس کی نقل اتاریں گے کیوں کہ نہ خود اصل ہیں نہ ان کا وجود ہی اصلی ہے۔ نہ ان کی ذات وصفات اور افعال

ہی اصل ہیں۔ اصل ہر چیز کی اللہ ہے۔ اسی کی ذات وصفات وافعال اصل ہیں۔ اس کے سوا ہر چیز مجاز اور اس کا ظل محض ہے۔ اس لئے آغاز کلام کا یہ ڈھنگ اگر مستحسن ہے اور بلاشبہ ہے تو اولاً یہ ڈھنگ کلام الٰہی ہی میں مستعمل ہونا چاہئے بندوں میں یہ ڈھنگ محض ظلی اور مجازی طور پر خدا سے آئے گا وہ ناقل محض ہوں گے نہ کہ اصل۔

پس ادھر تو یہ اصول معقول کہ کلام کا آغاز کسی بڑے نام یا بڑی صفت وتوصیف سے ہونا چاہئے اور ادھر یہ مسلم کہ نہ خدا سے کوئی بڑا، نہ خدا کے نام سے کسی کا نام بڑا۔ نہ اس کے صفات وافعال سے کسی کے افعال وصفات بڑے اور نہ ہی اس کی توصیف وتعریف سے کوئی ثناء وصفت بڑی۔

اس لئے کلام الٰہی میں اس امر مستحسن کے استعمال کی اس کے سوا دوسری صورت نہیں ہو سکتی کہ خدا اپنے کلام کو اپنی ہی صفات اور اپنے ہی نام اور اپنی ہی توصیف سے شروع فرمائے، بلکہ اگر آپ غور کریں تو بندے بھی اپنے کلام کو خدا کے نام اور ثناء وصفت سے اسی لئے شروع کرتے ہیں کہ اس کے نام سے بڑی اور کوئی چیز نہیں اور کلام کا بڑے ہی کے نام سے شروع کیا جانا فطری اور عقلی ہے۔ اس صورت میں بندوں کے لئے بھی اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ اپنے کلام کو بھی اور اپنے کام کو بھی اسی کے نام سے شروع کریں۔ چنانچہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کی تعلیم بھی دی گئی ہے کہ۔

"كُلُّ أَمْرٍ ذِيْ بَالٍ لَمْ يُبْدَأْ بِاسْمِ اللّٰهِ تَعَالٰى فَهُوَ أَقْطَعُ." ①..... "جو اہم کام اللہ کے نام سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت ہے"۔

پس بڑے نام سے آغاز کلام عقلی بھی ہوا شرعی بھی ہوا اور عرفی بھی ہوا۔ اس لئے آغاز کلام خداوندی بنام خداوندی اسی فطرت کے ماتحت ہے کہ امر مہم کو بڑے نام اور بڑی ثناء سے شروع کیا جانا ہی فطرت ہے اور اس کے نام سے بڑا نہ کسی کا نام ہے اور نہ اس کی شان سے بڑھ کر کسی کی شان ہے۔ تو پھر آغاز کلام میں خواہ خود اس کا کلام ہو یا اس کے بندوں کا ہو اس کے نام کے سوا اور کس کا نام لیا جائے؟

فرق اتنا ہوگا کہ بندے اپنے کلام میں خدا کا نام لے کر برکت حاصل کریں گے اور خدا اپنے کلام میں اپنا نام لے کر برکت ظاہر فرمائے گا۔ وہاں حصول برکت کا سوال یوں نہیں، کہ وہ خود سرچشمہ خیر وبرکت ہے اور یہاں اظہار برکت کا یوں سوال نہیں کہ بندے اپنی ذات میں کوئی خیر وبرکت نہیں رکھتے جسے ظاہر کریں۔ اس لئے ہم بسم اللہ کہیں گے تو مقصد برکت ومدد کا حاصل کرنا ہوگا اور خدا بسم اللہ فرمائے گا تو مقصد برکت ومدد کا اظہار اور پھیلانا ہوگا۔ اس لئے تو ہم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو محض تعلیم پر محمول نہیں کرتے، بلکہ عملاً اس فطرت پر محمول کرتے ہیں کہ آغاز کلام کسی پرعظمت نام یا لفظ سے کیا جانا ہی عقل سلیم اور طبع مستقیم کی خواہش ہے اور یہی عین فطرت ہے۔

﴿فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ ②

---

① تخریج گذر چکی ہے۔ ② پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۳۰.

چونکہ سوال میں اعتراض کی کوئی تقریر اور بنا ظاہر نہیں کی گئی اس لئے یہ اجمالی تحقیق عرض کر دی گئی، اعتراض کا کوئی موجیہ پہلو سامنے آتا تو اس پر کچھ اور عرض کیا جاتا۔

سوالِ چہارم..... ﴿الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى.﴾ ① خدا کی مکانیت اور اس کے احتیاج الی الارکان کو بتاتا ہے اور یہ جسم و حدوث کا خاصہ ہے، لوگ اس کو متشابہات میں سے کہتے ہیں۔ ﴿وَيَقُوْلُوْنَ: اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ.﴾ عقیدت مند دل تو اس کو مان لے گا مگر عقل حجت طلب کو کیوں کر سمجھائیں کہ متکلم ہی اس کے مطلب کو جانتا ہے کہ ایسی صورت میں مخاطب ہی اس کا بے کار ہو گا؛ ورنہ ترجمہ بھی اس کا صاف ہے، یہ ضروری مسائل ہیں جن کے حل و انشراح کی جناب کو تکلیف دیتا ہوں امید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔

تعیینِ مراد میں احوالِ متکلم کا دخل..... جواب: ہر شخص کے کلام کا مطلب اس کی مجموعی زندگی اور اس کی حیثیت عرفی کے مطابق لیا جاتا ہے۔ پس کلام کا مقصد سمجھنے کے لئے محض متکلم کے الفاظ ہی سامنے نہیں رکھے جاتے، بلکہ اس کے احوال و اوصاف اور شؤون کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے، فرعون نے بھی اَنَا الرَّبُّ کہا اور منصور رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اَنَا الْحَقُّ کہا۔ دعویٰ دونوں کا ایک ہے۔

لیکن ایک کو اس دعویٰ کے سبب آپ ملعون قرار دیتے ہیں اور ایک کو اس دعویٰ کی بناء پر مقبول بتاتے ہیں۔ یہ فرق دعویٰ و کلام کے فرق سے نہیں جب کہ وہ دونوں کا ایک ہے بلکہ احوال کے فرق سے ہے۔ فرعون کے مجموعی احوال کفر و جحود اور اللہ و رسول علیہ السلام (موسیٰ) کی تکذیب و تردید کے ہیں۔ اس لئے اس کا اَنَا الرَّبُّ کہنا بمقابلہ خدا اپنا استقلالِ وجود ثابت کرنا ہے یعنی خدا کا کفار (انکار) اور اپنا اثبات (ثابت کرنا) ہے، گویا فرعون کے متمردانہ احوال سے تو اس کے دعوے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ میں از خود ہوں کسی اور کا محتاج نہیں، میں اپنے اندر بھی خود ہوں اور اپنے سے باہر بھی میں ہی میں ہوں۔ نہ میرے اندر ہی کسی اور کا وجود ہے اور نہ میرے سے باہر ہی ہے اور منصور کے مطیعانہ احوال سے، جن کا حاصل خدا اور رسول کی تصدیق و محبت ہے، ان کے دعوے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ میں فانی محض اور بے ثبات ہوں، باہر تو باہر خود اپنے اندر بھی میرا اپنا کچھ نہیں، وجود ہے تو اس کا ہے اور بقاء ہے تو اس کی ہے۔ گویا میں اندر بھی خود نہیں ہوں وہ ہے۔ تو فرعون کے انا سے اثبات باطل اور نفی حق نکلتی ہے اور منصور کے انا سے اثبات حق اور نفی باطل نکلتی ہے۔ مگر دونوں کے کلاموں کے معنی کا یہ عظیم فرق، الفاظ اور دعویٰ کے فرق سے نہیں بلکہ صرف احوال کے فرق سے ہے۔ جن کو پیش نظر رکھ کر ہی ان کے کلاموں کا مطلب لیا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلم و کافر کے افعال بالخصوص معاشی افعال یکساں اور بالکل ایک ہوتے ہیں وہ بھی کھاتے پیتے ہیں، وہ بھی رہن سہن کے وہی سامان فراہم کرتے ہیں جو یہ کرتے ہیں۔ مگر ایک کے تمام افعال مقبول اور موجب زیادت اجر اور ایک کے تمام افعال مردود اور موجب زیادت وزر۔ فرق اگر ہے تو صرف احوال کا ہے۔

---

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵۔

پس کسی کے افعال ہوں یا اقوال ان کا مطلب ان کے احوال کو پیش نظر رکھ کر ہی لیا جاتا ہے۔ ایک نیک آدمی، جس کے عام احوال نیکی وتقویٰ کے ہوں، اگر اتفاقاً کوئی غلطی بھی کر گزرے تو اس کی بھی تاویل حسن کرتے ہیں اور ایک بدآدمی جس پر بدی اور فجور کا غلبہ ہو اتفاقاً کوئی نیک حرکت بھی کرے تو اسے بھی خود غرضی اور بدی پر محمول کرتے ہیں۔ بناوہی نکلتی ہے کہ کسی کے کام اور کلام کا مطلب اس کے احوال وشؤن اور اوصاف کو سامنے رکھ کر لیا جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح سمجھئے کہ خدا کی شان یہ ہے کہ وہ از خود ہے یعنی کسی کے بنائے سے وہ نہیں ہوا، بلکہ خود سے ہے، وجود صرف اس کا ہے اور کسی کا نہیں۔ اس لئے کہیں بھی کوئی ہو، وہ اسی کے دائرہ میں ہوگا۔ باہر نہیں ہوگا اور اس لئے لامحالہ اس کا وجود لامحدود بھی ہوگا۔ اگر محدود ہو، جس کی کوئی حد ہو تو حد سے باہر دوسروں کا وجود ہوگا۔ تو وجود صرف خدا کا نہ رہا اور معطی وجود صرف وہ نہ رہا، دوسرے بھی بن سکیں گے اور اس سے خالقوں کا تعدد نکلے گا۔

اس لئے اگر وجود اصلی صرف اس کا ہوگا تو اسے لامحدود بھی ماننا پڑے گا اور ہر شئے کو اس کے وجود سے موجود اور اس کے احاطہ وجود میں تسلیم کرنا پڑے گا، پھر اس سے دوسروں کا وجود اس شان سے نہ ہوگا کہ اس کے وجود کے ٹکڑے کر کر کے دوسروں کو بانٹے جائیں، ورنہ ٹکڑے ہونے کے بعد اس میں حد بندیاں ہو جائیں گی اور وہ لامحدودیت باقی نہ رہے گی جو اس کی خودی کے لئے لازم تھی۔ بلکہ دوسرے جب اس سے وجود پائیں گے تو بالکل اسی طرح جیسے سورج کی روشنی سے جہان والے روشنی پاتے ہیں کہ خود سورج کی روشنی کے ٹکڑے نہیں ہوتے اور ہر چیز اس سے روشنی حاصل کرتی ہے، یعنی اس کی روشنی کے صرف پرتووں ہی سے منور ہو جاتی ہے۔ خود اس کا نور اسی کی ذات میں قائم رہتا ہے۔

پس خدا از خود ہی ہے کسی کے بنائے نہیں بنا ہے۔ اس کا وجود اصلی ہے، کسی کا بخشا ہوا نہیں ہے اور وجود اصلی جب سب پر محیط ہے تو وہ ہر زمان ومکان میں ہے یعنی لامحدود ہے اس سے موجودات وجود پاتے ہیں۔ تو خود اس کے وجود کے ٹکڑے نہیں ہوتے، جو اس کے جسم اور جسمانیت سے بری ہونے کی علامت ہے۔ کیوں کہ وجود خود لطیف ترین شے ہے، جو خود آنکھوں سے بھی نظر نہیں آتا۔

پس خدا کا از خود ہونا، محیط الکل ہونا اور جسم نہ ہونا اس کی اصلی شان اور صفت ہے۔ اگر "اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ" کا کلام سامنے آئے گا تو اسی سابقہ قاعدے سے، اس کلام کا مطلب اس کے الفاظ محض سے نہیں، بلکہ ساری شانوں کو سامنے رکھ کر ہی لیا جائے گا اور شان اس کی یہ ہے کہ نہ وہ محدود ہے نہ جسیم (جسم والا) ہے نہ کسی کے احاطہ میں ہے نہ کسی کی گرفت میں ہے، بلکہ سب اس کے احاطہ میں اور اس کی گرفت میں ہیں۔ تو "اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی" ① سے آخر اس کی جسمانیت کیسے ثابت ہو جائے گی اور اس کا حدوث کیسے مفہوم [illegible]؟ ہاں! جب ہوگا کہ اس پاک متکلم کے کلام کے صرف یہی الفاظ سامنے رکھ کر اور اس کی ساری ثابت شدہ شا[illegible]

① پارہ: ۱۶، سورۃ طٰہٰ، الآیۃ: ۵۔

صفات سے قطع نظر کرکے "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" کے معنی لئے جاویں۔ لیکن اگر الفاظ کے ساتھ احوال بھی ملائے جاویں جو عرض کردہ قاعدہ کے مطابق ضروری ہیں تو "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" کا جسمانیت اور حدوث سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں رہتا۔

عرش رحمت خاصہ کا مظروف ہے ...... بلکہ غور کیا جائے، تو عرش سے اگر ثابت ہوتی ہے تو اللہ کی صرف ایک ہی صفت یعنی صفت رحمت کا تعلق خاص ثابت ہوتا ہے نہ کہ ذات کا اور وہ بھی مظروفیت کا کیوں کہ "اَللّٰهُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" نہیں فرمایا گیا، بلکہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى جس کا حاصل یہ ہے کہ عرش پر اللہ کی صفت رحمت پھیلی ہوئی ہے اور وہاں اس کی اسی خاص شان کا ظہور اور تجلی ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ عرش محل تدبیر ہے اور تخت شاہی ہے۔ جس سے سلطنت الٰہی کے کاروبار چلتے ہیں اور جہانوں کی تدبیر کی جاتی ہے۔

پس بتلانا یہ ہے کہ ساری سلطنت رحمانیہ ہے، رحم و کرم اور رافت و ترحم پر مبنی ہے۔ غضب پر یا کورے قانونی داؤ پیچ پر مبنی نہیں ہے اور بالفاظ دیگر کائنات کی ہر چیز ہمارے رحم و کرم پر ہے۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے حسی طور پر نمایاں اس طرح فرمایا ہے کہ عرش کو تو ساری کائنات پر محیط بنا دیا، کہ اس سے باہر کوئی جہان میں نہیں اور عرش پر صفت رحمت کو محیط کر دیا، تو گویا رحمت سارے جہانوں پر محیط نکلی۔ جس سے واضح ہو گیا کہ ہماری سلطنت قہر و سیاست پر مبنی نہیں، بلکہ رحمت و کرم پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ بندے رات دن اور ہمہ وقت کفر و معصیت بھی کرتے ہیں مگر رزق اور بارانِ رحمت بند نہیں ہوتا۔ گو کسی خاص وقت جبکہ اقوام کا ظلم و ستم انتہاء کو پہنچ جائے، تو بطور تنبیہ سزا بھی دلائی جاتی ہے۔ سو اس کا منشاء بھی رحم و شفقت ہی ہوتا ہے۔

بہر حال کلمہ عرش پر استواء کے معنی جسمانی تمکن کے نہ ہوئے جو شُئُوْنِ اِلٰهِيَّه کا مقتضٰی ہے اور وہ استواء معنوی بھی ذات کا نہ ہوا، بلکہ صفت رحمت کا ہوا۔ تو اس سے خدا کی جسمانیت یا محدودیت یا حدوث کا کیا تحقق کہ یہ شبہات آیت پر وارد کئے جائیں۔

کیفیت استواء غیر معلوم ہے ...... ہاں! اس شان رحمت کے عرش پر چھائے ہونے کی کیفیت لا معلوم ہے کہ اس کا کیا انداز ہے اور کیا نوعیت ہے اور کیفیت ہی کی لاعلمی کی بناء پر "اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ" کہا جاتا ہے، نہ یہ کہ "اِسْتِوَآء عَلَى الْعَرْشِ" کا مفہوم نامعلوم ہے، "اِسْتِوَآء عَلَى الْعَرْشِ" صفت رحمت کا ہے اور یہ استواء محیط الکل ہے۔ کیوں کہ جسمانیت میں عرش تمام اجسام پر محیط ہے، تو صفت رحمت محیط الکل ثابت ہوتی ہے۔ مگر اس انداز سے جیسے ہماری روح ہمارے بدن کو محیط ہوتی ہے اور بدن کا کوئی ایک جز بھی روح کی گرفت سے باہر نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں اس کیفیت کا پتہ نہیں جس کیفیت سے روح بدن پر چھائی ہوئی ہے اور اس نے اس ساری کائنات بدن کو گھیر رکھا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم روح کے احاطہ کو نہیں جانتے یا اس کو یقینی نہیں سمجھتے ہیں۔ روح کے تعلق اور احاطہ کو یقینی جان کر اگر لاعلمی ظاہر کرتے تو اس کی کیفیت اور نوعیت

احاطہ سے، نہ کہ اصل تعلق کے علم سے۔

پس ہم یقیناً جانتے اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ شانِ رحمت عرش پر اور بواسطہ عرش ساری کائنات اجسام اور ارواح پر محیط ہے۔ مگر ہم اس احاطہ کی کیفیت اور نوعیت کو نہیں جانتے۔ اللہ اعلم کہہ کر بحوالہ خدا کر دیتے ہیں۔

پس جتنا ہم جانتے ہیں اور جان سکتے ہیں۔ اسی کے اعتبار سے ہم سے اس آیت میں تخاطب کیا گیا ہے اور اس پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے اور جتنا نہیں جانتے اتنا سپردِ خدا کر دینے ہی کے مکلّف بنا دیئے گئے ہیں۔ یہ ہم پر لازم نہیں ہے کہ ہم اس نوعیت کی بھی کھود کرید کر کے اصلیت کا سراغ لگائیں کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ پس خدا کی بھی یہ شانِ رحمت ہے کہ بقدرِ استطاعت تو ہمیں تکلیف دی اور بغیر استطاعت ہمیں مکلّف نہیں بنایا۔

"فَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ"

پس منظر...... جناب محترم و مکرم زید! اسلام مسنون، نیاز مقرون۔ مکرمت نامہ موصولہ ۲۴ محرم الحرام ۱۳۷۳ھ باعث شرف ہوا۔ آپ کے سلسلہ تالیفات میں "داستانِ عمل" اور "اخلاق و آداب" جیسی مفید اور قیمتی کتابوں کے اضافے سے بے حد مسرت ہوئی۔ ان دونوں کتابوں پر دو جلیل القدر عالموں کے دیباچہ کا اضافہ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ اور مستفیدوں کے لئے سرور فوق سرور کا مصداق ہے۔ آں محترم نے احقر کے چند فقرے نقل کر کے ان پر اضافہ و تشریح کا ایماء فرمایا ہے۔ جس میں حضرت مخدومی مولانا خیر محمد صاحب دام مجدہ کا ارشاد بھی شامل ہے۔ آپ کا ہی ایماء کیا کم تھا کہ اس میں ایک اور بھاری اشارہ کے بوجھ کا اضافہ بھی ہو گیا ہے۔ تو اسے ضعیف کندھوں پر لادے پھرنے کی ناقابل برداشت کیفیت سے یہ بوجھ ہلکا نظر آیا کہ فوراً ہی تعمیل کروں۔ پھر بھی جو تاخیر ہوئی وہ میرے سفروں کی وجہ سے ہوئی۔ جناب کا والا نامہ دیوبند اس وقت پہنچا جبکہ میں بمبئی گیا ہوا تھا۔ وہاں سے واپس آیا تو فوراً ہی لکھنؤ کا سفر پیش آ گیا۔ وہاں سے واپسی ہوئی تو مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند کا سالانہ جلسہ سر پر آ گیا۔ اس سے فراغت ہوئی تو علی گڑھ کانپور کا سفر درپیش ہو گیا۔

اس لئے آج واپس ہو کر شب میں بعد عشاء جو کچھ بن پڑا بطورِ تعمیل ارشاد سطورِ ذیل قلمبند کیں اور بلا نظرِ ثانی ہی ارسال ہیں۔ مناسب ہو کہ جناب یا حضرت مولانا خیر محمد صاحب دام مجدہ ان پر ایک اصلاحی نظر فرمائیں۔

یہ مضمون فی الحقیقت احقر کے ان تین ہی جملوں کی شرح ہے جو جناب نے نقل فرما کر بھیجے ہیں۔ اس لئے مضمون کا آغاز انہی سے کیا گیا ہے جو حسبِ ذیل ہیں۔

علم کی غایت عمل ہے۔ اس کا جوہر تقویٰ ہے۔ اس کا زیور ادب ہے شعراء کا ادب لفظی میدانوں میں دوڑنے والے شاعروں کے یہاں ادب کے معنی شستہ کلامی اور بلاغت بیانی کے ہیں۔ حفظِ اشعار، حفظِ لغات اور حفظِ اسماء واصطلاحات اس ادب کو پونجی ہے۔ شاعری یا مرصع نثر گوئی اور جملوں کے جوڑ بند کی صنعت گری اس ادب کے میدان کی مساعی جمیلہ ہیں۔ خیال آفرینی اور تخیل کے میدانوں کی نقشہ سازی اس ادب کا جوہر ہے۔ معنویت یا

واقعیت براہِ راست شاعر کا مقصود نہیں ہوتا بلکہ صرف تخیل کی کارگزاری اور خیال آفرینی مطمحِ نظر ہوتی ہے۔

اسی لئے اشعار اور شاعرانہ تعبیرات کے ساتھ کبھی واقعیت جمع ہو جاتی ہے اور کبھی نہیں۔ لفظی دنیا میں اسی کو ادب اور اس قسم کے کلام والے کو ادیب کہتے ہیں۔ اس ادب کی غرض وغایت اکثر وبیشتر دادخواہی اور زرطلبی ہوتی ہے۔ سامعین کی تحسین وآفریں اور مدح سرائیوں پر ممدوحوں کی داد ودہش اس ادب کی انتہائی معراج ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ادب وہ ادب نہیں ہو سکتا جسے علم کا زیور کہا گیا ہے۔ ایک پرلے درجہ کا بے ادب اور علم سے بے بہرہ حتیٰ کہ فاسق وفاجر بھی اپنی طبعی ذہانت وذکاوت اور موزوں طبیعت سے شستہ کلامی پر قادر ہو سکتا ہے۔ اس حال میں کہ اس میں علم کا کوئی بھی جوہر نہ ہو۔ جہلاءِ عرب بلند پایہ شاعر، پرگو، برجستہ کلام اور فصاحت بیانی کے پتلے تھے۔ اس وقت کی دنیا میں ان کی بلاغت بیانی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس لئے انہوں نے اپنے سوا ساری دنیا کے لئے عجم (گونگا) کا لقب تجویز کیا تھا۔ مگر بایں ہمہ تھے وہ جہلاء ہی، حتیٰ کہ ان کی بے مثال جہالت کی بناء پر ہی ان کے زمانے کا نام تک زمانۂ جاہلیت ہوا کہ انہیں علم سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ رہا تھا۔

تا ادب و تقویٰ چہ رسد

اس ادب کے ہزارہا ادیب امراء وسلاطین کے درباروں میں نظر آتے تھے جو اپنی قصیدہ خوانی ہی کی بدولت معاش پیدا کرتے تھے۔ زبان اور زبان کے لفظوں کی بدولت ان کی گزر بسر ہوتی تھی۔ آج کی دنیا میں جب کہ دربار نہ رہے صرف بازار رہ گئے، شاہیت نہیں صرف عوامیت ہے، تو قومی انجمنوں اور عوامی نشرگاہوں سے اسی ادب کے باربردار سینکڑوں ادیب، مرثیہ گوئی یا قومی مدح سرائی سے معاش کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ یہ ادب علم کی آرائش اور اس کا زیور نہیں کیوں کہ اس ادب کے لئے سرے سے علم ہی ضروری نہیں، زیورِ علم کا تو سوال کیا پیدا ہو۔ اس ادب کا حاصل خود غرضی اور غیر فریبی یا اپنی خواہش داد اور مخاطب کی رضا جوئی کے سوا کچھ نہیں۔ جس کا خلاصہ قرآنی الفاظ میں صرف یہ ہے ﴿يُرْضُونَكُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ﴾ ① "وہ تمہیں اپنے مونہوں (زبانوں اور زبانی لفظوں) سے راضی کرنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ ان کے دل اس سے انکاری ہیں اور اکثر ان میں فاسق ہیں"۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس ادب اور اس کے سرچشمہ (شاعری) کو اپنے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے الگ اور دور رکھا اور فرمادیا کہ یہ شاعری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے زیبا بھی نہ تھی کہ اس ادب کا حاصل خیال آرائی تھا اور پیغمبروں کا موضوع حقیقت آرائی اور حقیقت الحقائق تک رہنمائی تھی۔ عارف وکامل شعراء جیسے عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ، سعدی رحمۃ اللہ علیہ، عطار رحمۃ اللہ علیہ اور سلف وخلف کے دوسرے شعر گو اکابر دلوں میں اگر باعظمت ہیں تو شاعری کی بدولت نہیں، بلکہ معرفت کی بدولت، یعنی بحیثیت شاعر کے مقدس نہیں مانے گئے بلکہ بحیثیت کمالِ باطن کے۔ اس لئے اس قسم کا اکابر سے مذکورہ بالا

---

① پارہ: ۱۰، سورۃ التوبۃ، الآیۃ: ۸۔

نظریہ پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

عوام کا ادب...... عوام الناس کے عرف میں ادب کے معنی احترام و تعظیم کے ہیں۔ مگر انہی کے مروجہ اقوال و افعال اور بندھی جڑی رسموں اور ہیئتوں کے ساتھ۔ ان ہی رسوم تعظیم کے ساتھ جب کوئی ان سے پیش آتا ہے تو وہ اسے بااد ب اور مہذب کہتے ہیں۔ ورنہ بے ادب اور گستاخ کہہ کر خشمگیں (غضب ناک) ہو جاتے ہیں۔

برادریوں کے اجتماعات اور قبائلی تقریبات یا عام میل جول میں کسی چھوٹے کا جھک کر ہاتھوں سے سلام کرنا یا منڈی گود میں ڈال دینا یا اصطلاحی الفاظ میں تعظیمات و تسلیمات اور آداب بجالانا یا نیم جھکاؤ کے ساتھ سامنے کھڑے ہو کر جھک جانا یا ہاتھ جوڑ کر سرو قد کھڑے ہونا یا چچا جان یا بھائی جان کے خطاب سے مخاطبوں کو متوجہ کرنا ان کے یہاں ادب اور ان الفاظ و ہیئات کو من وعن ادا کر دینے والا مؤدب اور ادیب کہلاتا ہے۔ خواہ اس کے دل میں مخاطبوں کی طرف سے کتنا ہی غبار بھرا ہوا ہو اور وہ برادری کی اونچ نیچ کے کتنے ہی مناقشات اور عصبیاتی جذبات دل میں لئے ہوئے ہو، جو اپنے وقت پر کافی جوش و خروش سے ابھرتے ہوں۔ اور محبت کی بجائے عداوت کے جذبات دل کے تمام گوشوں میں چھپے پڑے ہوں، جو اپنے وقت پر پھوٹ پڑیں مگر برادری یا شہری رسم کے مطابق اسے مؤدب ہی کہا جائیگا۔

ظاہر ہے کہ یہ ادب بھی وہ ادب نہیں ہو سکتا جسے علم کا زیور کہا گیا ہے۔ ان رسم پرستیوں کے لئے نہ صرف یہی کہ علم ضروری نہیں ایک حد تک جہل ضروری ہے۔ اس ادب کا حاصل دنیا سازی اور ظاہر داری ہے۔ جس کے نیچے حقیقت و معنویت کا کوئی نشان نہیں ہوتا۔ اس ادب کی روح خود غرضی نفس اور رضا جوئی غیر تو نہیں ہوتی، بلکہ برادری کی عام ملامت سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے برادری میں اپنی شمولیت کو باور کرانے کی کوشش اور رسوم اہل زمانہ کے مطابق تصنع اور بناوٹ سے اپنے کو بھاری بھرکم ظاہر کرنا ہوتا ہے۔

مخاطب کی حقیقی عظمت و توقیر کا اکثر و بیشتر یہاں کوئی سوال نہیں ہوتا۔ جبکہ برادرانہ مناقشات کے تحت دل اکثر برائیوں سے بھرپور رہتا ہے۔ اس رسمی شائستگی اور ظاہر داری کی حقیقت قرآنی تعبیر سے یوں بیان کی جاسکتی ہے۔ ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ.﴾ ① ''یہ لوگ دنیا کی زندگی کی صرف ظاہرداریوں کو جانتے ہیں اور انجام و عاقبت سے یکسر غفلت میں ہیں''۔

تلبیس ادب...... مدعیان علم کے یہاں جن کی زبانیں تو علم سے آراستہ ہوں مگر قلوب خشوع سے خالی ہوں۔ ادب کے معنی یقیناً لفظی صنعت گری یا عرف عام کی مروجہ رسموں کی پابندی کے تو نہیں۔ بلکہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابرین دین و دنیا کے احترام کے لئے شریعت ہی کے بخشے ہوئے افعال و ہیئات اور صریح حکم فرمودہ اعمال کی پابندی کے ہیں۔ بشرطیکہ ان کے بارے میں انہیں صراحۃً لفظوں میں کوئی حکم مل جائے اور کوئی شبہ نہیں کہ ادب کا

---

① پارہ: ۲۱، سورۃ الروم، الآیۃ: ۷۔

یہ بہت پاکیزہ اور اعلیٰ ترین معیار ہے جس میں شرعی ہیئتوں کی پابندی پائی جارہی ہو۔لیکن جب کہ اس قسم کے مدعیان علم نے علم کے محض الفاظ ہی یاد کئے ہیں۔مگر اس کی حقیقی کیفیات سے ان کے قلوب باکیف نہیں اور ساتھ ہی ریاضت نفس سے بے پرواہ رہنے کے سبب قلب میں جبلت کے غیر معتدل اخلاق اور ہوا وہوس کا غلبہ ہے۔

نیز جذبات نفسانی بیدار ہیں تو قدرتی طور پر ان شرعی ہیئتوں کی پابندیوں میں بھی ان کے قلوب کی وہ ظلمانی کیفیت جھلکنی ناگزیر ہیں جو ان کا جوہر نفس بنی ہوئی ہیں۔وہ بظاہر شرعی آداب کی پابندی کرتے ہوئے بھی مخاطب کی طرف سے کینہ وحسد اور کدورت رکھ سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں جذبات نفس اور جبلی کدورتوں کی آمیزش کے ساتھ شعری رسوم کی پابندی ان ہی رواجی رسوم کی پابندی کی طرح محض رسمی اور نمائشی ہوکر رہ جائے گی جن کے خوگر عوام تھے۔فرق اتنا ہوگا کہ عوام رواجی رسوم کے پابند ہوں گے اور یہ عوام اہل علم یعنی مدعیان علم شرعی رسوم کے پابند۔

(گو اس رسم کے درجہ میں وہ عوام سے فائق اور قابل تحسین بھی ہوں) مگر جیسے دنیادار لوگ فساد باطن کے ساتھ مخاطب کا ظاہری ادب کرتے ہوئے بھی قلباً اس کے حق میں بے ادب اور گستاخ ہوتے ہیں۔ایسے ہی یہ مدعیان علم بھی بلاخشوع باطن شرعی صورت کا ادب برتتے ہوئے بھی مخاطب کے حق میں گستاخ اور بے ادب کہائے جانے کے مستحق ہوں گے،چناں چہ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ اس قسم کے اہل علم قلبی عقیدت وانقیاد جذبہ عشق وگرویدگی اور حقیقی نیازمندی سے خالی رہ جانے کے سبب گو بظاہر لفظی ادب واحترام اور رسمی آداب وتعظیمات سے گریز نہیں کرتے۔مگر ان کے ادب کی رسوم میں ذاتی فخر وغرور کی کیفیات ضرور شامل ہوتی ہیں۔جس سے کبھی تو ان کی زبان تو ان پر فعلی شیخی اور اپنے علم وادب پر گھمنڈ کے کلمات آتے ہیں۔گویا وہ خدا اور رسول پر اور ان کے نام لیواؤں پر احسان جتا رہے ہیں کہ وہ ان کا کتنا ادب کرتے ہیں اور کبھی وہ ان ہی مخاطبوں کے بارے میں جن کے ادب کے وہ زبانی اور رسوم ادب سے مدعی تھے بے ادبی گستاخی اور بے باکی کے لب ولہجہ بلکہ گستاخانہ کلمات سے بھی نہیں چوکتے۔

پس بظاہر تو وہ ادب ہوتا ہے اور بباطن بے ادبی،کیوں کہ بظاہر تو وہ اتباع رسوم شریعت ہوتا ہے مگر رنگ بے ادبی شامل ہو جانے سے وہ درحقیقت اتباع نہیں ابتداع بن جاتا ہے۔کیوں کہ صاحب شریعت نے اس رنگ کے ساتھ انہیں اتباع نہیں بتلایا تھا بلکہ جیسے احکام کی تعلیم دی تھی۔ویسے ہی ان کے برتنے کا رنگ ڈھنگ بھی خود ہی دیا تھا جسے انہوں نے بدل کر اس میں اپنا جدید رنگ بھر دیا جو اگر چہ حکم کی بدعت نہیں مگر رنگ حکم کی بدعت ضرور ہے۔

بہرحال اس رنگ تعلی وکبر اور عجب وریا کے ڈھنگ کی رسوم شرعیہ کی پابندی حقیقی ادب وتعظیم نہیں۔بلکہ تکبر بصورت تواضع اور فسق بصورت تقویٰ ہوتا ہے جسے وہ دھوکہ میں رہ کر ادب وتقویٰ ہی سمجھتے رہتے ہیں۔مگر وہ تقویٰ کے آس پاس بھی نہیں ہوتے۔پس یہ ادب بجائے خود ایک مستقل دھوکہ اور تلبیس بلکہ ایک مستقل فساد ہوتا ہے جس سے ہزارہا بے بصر عوام الناس کی راہ ماری جاتی ہے۔

صاحب ہدایہ نے ایسے ہی عوام اہل علم کے لئے فرمایا ہے:

"فَسَادٌ كَبِيرٌ عَالِمٌ مُتَهَتِّكٌ وَاَكْبَرُ مِنْهُ جَاهِلٌ مُتَنَسِّكٌ هُمَا فِتْنَةٌ فِي الْعٰلَمِيْنَ كَبِيْرَةٌ لِمَنْ بِهِمَا فِيْ دِيْنِهٖ يَتَمَسَّكُ." "دنیا میں وہ عالم فسادِ عظیم ہے جو پردہ دری کرے اور بے ادب ہو اور اس سے بڑھ کر وہ جاہل ہے جو بلا علم کے عبادت کرے (من گھڑت بدعات میں مبتلا) یہ دونوں کے دونوں دنیا میں ایک عظیم فتنہ ہیں ہر اس شخص کے لئے جو دین میں ان سے رہبری حاصل کرے اور حجت پکڑے"۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے "اِحْذَرُوْا مِنَ النَّاسِ صِنْفَيْنِ عَالِمٌ قَدْ فَتَنَهٗ هَوَاهُ وَصَاحِبُ دُنْيَا قَدْ اَعْمَتْهُ دُنْيَاهُ." "دو قسم کے آدمیوں سے بچو ایک اس عالم سے جو ہوا وہوس میں مبتلا ہو اور ایک اس دنیا دار سے جسے دنیا نے اندھا کر دیا ہو"۔ ظاہر ہے کہ اس ادب کو اس ادب سے کوئی واسطہ نہیں جو علم کا زیور کہلاتا ہے کیوں کہ اس ادب میں صورت تقویٰ تو بنی رہتی ہے مگر تقویٰ باطن ندارد ہوتا ہے۔ کیوں کہ تقویٰ باطن کے ساتھ دعویٰ، شیخی، کبر نفس، غرور اور علم پر گھمنڈ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ فنائیت، محویت، کمال تواضع، اپنی حقارت اور مخاطب کی عظمت وتوقیر کے جذبات نفس میں جمع ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ ادب تو ہے مگر رنگ ادب سے خالی ہے اور ذوق ادب سے مبرا، یعنی صورت ادب ہے، ادب نہیں، حالانکہ صورت ادب کے ساتھ ذوق ادب اور رسم ادب کے ساتھ کیف ادب کی بھی ضرورت ہے۔

کمال ادب...... لیکن اگر ادب کی شرعی رسوم کے ساتھ ان کی حقیقی کیفیت بھی قلب میں موجود ہو اور یہ صورت ادب، بے روح ڈھانچہ نہ ہو، بلکہ با کیف رسم ہو تو یہ حقیقی ادب کہلائے گا اور ادب کی اس کیفیت کے غلبہ کے بعد متادب اور ادیب نہ صرف مخاطب کے اوامر واحکام ہی کو پیش نظر رکھے گا۔ بلکہ اس کے منشاء اور اشارۂ خم ابرو کو بھی دیکھے گا اور ایسا متادب مخاطب کے صرف منصب ہی کو نہیں دیکھتا، بلکہ اس کی ذاتی عظمت وبرگزیدگی کو بھی پیش نظر رکھتا ہے جس سے اس کے ادب کی ذمہ داریاں رسوم سے گزر کر حقائق تک پہنچ جاتی ہیں اور وہ صرف زبان یا ہیئت بدن ہی سے ادب دان نہیں رہتا، بلکہ دل ودماغ اور نفس وروح سے بھی ادب وتوقیر کا ثبوت دیتا ہے۔ نیز اس مقام کے لحاظ سے اس پر ادب وعظمت کے وہ دقیق دقیق معارف کھل جاتے ہیں جو عوام اور مدعیان علم کو محض لفظوں میں نظر نہیں آ سکتے۔ بلکہ اس صاحب معرفت پر ہی روشن ہوتے ہیں۔ اندریں صورت عظمت والا مخاطب اگر اس متادب سے ایک پھول چاہے گا تو وہ باغ دینے کو تیار ہو جائے گا۔

وہ اگر بدن کا ادب مانگے تو یہ روح سے بھی ادب کرے گا۔ وہ افعال کا ادب چاہے گا تو یہ طبیعت اور اخلاق تک کے ادب کے نمونے پیش کر دے گا، یعنی ظاہر وباطن سے اس حد تک ادب دان ہو جائے گا کہ اس کا ذوق تک ادب کے سانچوں میں ڈھل جائے گا۔ یہی وہ کمال ادب کا مقام ہے جو خواص کو نصیب ہوتا ہے۔ اسی کو ہم اہل تدین اور عاملوں کا ادب کہیں گے۔ مدعیان علم کا ادب نہیں۔

پس عاملوں اور دین داروں کے یہاں ادب کی حقیقت لفظی یا نقشی یا الفاظ وہیئت کی صنعت گری نہیں بلکہ نیاز

مندی، باطنی اور فدویت روح وطبیعت کے ساتھ شرعی آداب کے ڈھانچوں کو سنبھالنا اور پابندی احکام کے ساتھ ساتھ احکام کی آخری اور قدرتی حدود کو جو ذوق سلیم اور مشق شریعت سے سامنے آتی ہیں۔ ہمہ وقت زیر نظر رکھنا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ نہ اس میں ادعاء ہو، نہ گھمنڈ، نہ شیخی، نہ اتراہٹ، نہ اپنی توقیر ہو، نہ دوسروں کی تحقیر، نہ روایت ہو، نہ حکایت، بلکہ محویت وگرویدگی ہو اور فنائے نفس کے ساتھ رضائے حق کے جذبات کام کر رہے ہوں۔

پس یہی وہ ادب ہے جسے علم کا زیور کہا گیا ہے پس جس طرح ایک خوبصورت پیکر کا حسن وجمال زیور سے آراستہ ہو کر دوگنا تگنا ہو جاتا ہے اسی طرح علم حقیقی کا جمال زیور ادب سے آراستہ ہو کر ہزاروں گنا بڑھ جاتا ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ ادب ان احتیاطی افعال اور تقوائے اعمال کا نام ہے جو اعمال شرعیہ کی حفاظتی اور اجتہادی حدود سے متعلق ہوں۔ پس ادب کا ابتدائی درجہ تو یہ نصوص شرعیہ کی عبارت پر عمل کرتا ہے اور اس کا آخری درجہ وہ ہے جو اس عمل کی مشق وتکرار سے ان ہی نصوص کی دلالت واشارت اور اقتضاء سے ذہن پر منکشف ہو اور اگر ظواہر نصوص کے تعبیری حکم کو فتوی کہا جائے گا تو اس اقتضائی، دلالتی اور اشارتی حکم کو تقویٰ کہا جائے گا۔ پس صحیح معنی میں ایک متادب اسی وقت ادب داں بنتا ہے، جبکہ عملی طور پر اسکے سامنے ادب کے یہ تمام ظاہری وباطنی اور فتویٰ وتقویٰ کی احکام اور حدود موجود ہوں اور دل کی آمادگی اور امنگ سے ان پر عمل پیرا ہو۔ یہاں تک کہ انجام کار ادب کی ذوقی حدود بھی اس پر منکشف ہو جائیں۔

زیورِ علم...... یعنی وہ نصوص کے دقیق اور بعید سے بعید محتملات تک کو بھی اپنے ادبی پروگرام میں شامل رکھنے کا خوگر ہو جائے گویا فنافی الادب ہو جائے۔ یہی وہ ادب ہے جس کو علم کا زیور اور تقویٰ کا جوہر کہا گیا ہے۔ کسی نیک عمل میں اس وقت تک نور نہیں آسکتا جب تک کہ اس کا ادب اس میں شامل نہ ہو اور وہ احتیاطی اور تقوی حدود زیر عمل نہ ہوں جس سے اس عمل کی حقیقی جامعیت اور اس کا واقعی کمال وجمال وابستہ ہے۔ پس ادب ہی فی الحقیقت علم کا زیور اور جوہر ہے۔ اس کے بغیر عمل ایک بے لباس اور بے زینہ پیکر ہے جس کی طرف رغبت وشوق کی نگاہیں نہیں اٹھ سکتیں۔ اس سے بہ سہولت اندازہ ہو سکتا ہے کہ اعمال بغیر آداب کے قبولیت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتے اور ان کا حقیقی ثمرہ اور صلہ بغیر آداب کے سامنے نہیں آسکتا۔ پس جیسا کہ ہر صنعت کے تجربہ کار پر بالآخر اس صنعت کے وہ دقائق بھی بقدر استعداد کھلنے لگتے ہیں جو دوران تعلیم میں کتابوں سے اس کے سامنے نہ آئے تھے۔

ایسے ہی آداب شرعیہ کی ابتدائی عملی حدود تو نصوص شرعیہ کی لفظی تعبیرات اور عبارات میں موجود ہوتی ہیں لیکن ان پر مستمرا عملدرآمد کی مشق سے جبکہ ذوق اور نیازمندی اور فدویت کا ملکہ راسخہ باطن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ تو ادب کی سی وہ ذوقی راہیں بھی قلب پر کھل جاتی ہیں جو ان نصوص کی عبارات سے گزر کر ان کی دلالات واشارات میں پنہاں ہوتی ہیں اور پھر آدمی ادب کو استعمال نہیں کرتا بلکہ ادب اسے استعمال کرنے لگتا ہے۔ جس سے وہ ادب میں غرق اور فنا ہو کر سراپا ادب بن جاتا ہے اور پھر اس سے آداب کے وہ نقشے سرزد ہوتے ہیں جو عام نگاہوں کے

سامنے نہیں ہو یہ آداب کسی ایک آدھ شرعی حکم کے لئے نہیں، بلکہ پوری شریعت کی حد بندی ان ہی آداب سے کی گئی ہے۔ اگر ان آداب کی حدود کو توڑ دیا جائے تو نظام شریعت کی بنیادیں استوار نہیں رہ سکتیں۔ کیوں کہ افعال شرعیہ میں ایک حصہ مامورات (احکام) کا ہے جن کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ایک حصہ منہیات (نواہی) کا ہے جن سے بچنے کا حکم کیا گیا ہے۔ ان مامورات پر جماؤ اور منہیات سے بچاؤ کے لئے کچھ احتیاطی حدود رکھی گئی ہیں جن کے دائرہ میں محدود ہو جانے ہی سے اصل مامور و نہی محفوظ رہتے ہیں اور ان ہی احتیاطی حدود کا نام "آدابِ شرعیہ" ہے۔ اس لئے یہی آداب درحقیقت امر و نہی کے شرعی نظام کو باقی اور محفوظ رکھنے کے کفیل اور ضمانت دار ہیں جب تک ان آداب پر جماؤ اور استقرار رہے گا۔ اصل احکام پر آنچ نہ آئے گی اور جوں ہی ان آداب کے کنارے ٹوٹ جائیں گے۔ وہیں اصل مقاصد احکام کا قلعہ مسمار ہو جائے گا۔

حدودِ ادب...... البتہ یہ حدود آداب کچھ تو منصوص ہیں جو تعبیرات شرعیہ کی عبارت ہی سے سمجھ میں آجاتی ہیں اور کچھ ذوقی ہیں جو وجدانِ صحیح سے سامنے آتی ہیں۔ لیکن ذوقی بمعنی اختراعی نہیں بلکہ بواسطہ ذوق ہو۔ ان ہی نصوص کتاب وسنت کی دلالت واشارات یا اقتضاء سے مفہوم ہوتی ہیں۔ البتہ ان کے فہم کے لئے مطلق ذوق کافی نہیں بلکہ ذوقِ سلیم اور وجدانِ صحیح کی ضرورت ہے، جو ایک طرف تو فطرۃً سلامتی وصحت لئے ہوئے ہو اور دوسری طرف شرعی اتباع، پیروی، سنت اور محبت نبوی اور عشق خداوندی نے اسے مانجھ کر اور زیادہ صاف کر دیا ہو۔ جس کے صیقل شدہ آئینہ میں یہ دقیق آداب منعکس ہونے لگیں۔

پس یہ دقیق آداب بھی شرعی ہی ہوئے ہیں مگر شریعت میں سے ان کا نکال لانا ہر ایک کا کام نہیں ہوتا، بلکہ صرف ان ہی مصفا قلوب کا جو فطرۃً تشریعی ذوق سے مناسبت وقرب رکھتے ہیں۔ اس لئے قدرتاً نادانوں اور کم فہموں یا عوام اہل علم کو یہ آداب ان راسخین فی العلم کے اتباع کے بغیر نصیب نہیں ہوتے۔ پس ان آداب اور ان کی حدود کو ایک راسخ فی العلم اپنے ذوق اجتہاد سے اور ایک عامی اپنے ذوق انقیاد سے پاتا ہے اور پھر ان ہی کے ذریعے اپنے دینی نظم کی حفاظت کرتا ہے۔

مثلاً منہیات شریعت میں اگر زنا حرام قرار دیا گیا ہے تو شریعت نے محض فعل زنا ہی سے روک دینے پر قناعت نہیں کی بلکہ اسباب ودواعی زنا سے بھی رک جانے کا حکم دیا ہے۔ جو فی نفسہ چاہے ممنوع نہ ہوں، مگر اسباب زنا ہونے کے سبب وہ بھی زنا کے حکم میں آ کر ممنوع ٹھہر گئے۔ جیسے نامحرم عورت پر نگاہ ڈالنا، اس کی آواز پر کان دھرنا، اس کی خوشبو پر ناک رکھنا، اس کی طرف چل کر جانا، اس کو چھونے کے لئے ہاتھ بڑھانا وغیرہ کہ یہ احتیاطی حدود ترکِ زنا کے آداب کہلائیں گی اور اگر فعل زنا کبیرہ گناہ کہلائے گا تو زنا کے یہ اسباب ودواعی صغیرہ گناہ کہلائیں گے، ان میں گناہ ہونے کی شان زنا ہی کی نسبت سے آتی ہے، ورنہ فی نفسہ افعال ممنوع نہیں تھے۔

اب ظاہر ہے کہ ان احتیاطی حدود پر سختی سے عمل کرتے رہنے سے نہ صرف یہی کہ آدمی زنا سے بچا رہے گا بلکہ

اس کے قلب میں ایک ایسا احتیاطی ذوق پیدا ہو جائے گا جو اس شخص کو نامحرم عورت کے تصور سے بھی بچالے گا اور آدمی سمجھ لے گا کہ میرے لئے اس نامحرم کے جمال کی طرف فکر ودھیان دوڑانا بھی جائز نہیں، بلکہ مجھے ان ظاہری حدود کا پابند ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اس ظاہر اثر سے متاثر ہو کر میرا باطن زنا سے پاک رہے۔

اور جبکہ باطن کا عمل فکر وتصور ہے تو باطن کا زنا دراصل اجنبیہ کا دھیان اور خیالی زنا ہے جو میرے لئے یقیناً ممنوع ہے۔ ظاہر ہے کہ شریعت نے صراحۃً اسے زنا کے تصور ودھیان سے روکنے کا کوئی فتوی نہیں دیا تھا اور جبکہ احکام شرعیہ ظاہر پر لگائے جاتے ہیں تو احوال قلب پر ظاہری حکم لگائے جانے کے کوئی معنی بھی نہ تھے۔ مگر ذوقِ احتیاط اور ظاہری حدود کی مسلسل پابندی کا یہ قدرتی ثمرہ ہے کہ ظاہر سے زیادہ آدمی باطن سے عمل کرنے کا خوگر ہو جاتا ہے جب کہ ظواہر اعمال کی مشق وتکرار سے اس کے باطن میں عمل کا ملکہ اور مادہ جڑ پکڑ جاتا ہے اور وہ اسے گناہ ہی سے نہیں خیالِ گناہ سے بھی باز رکھنے لگتا ہے۔ اندریں صورت باطن کے اس ذہنی عمل کو کہ آدمی زنا کے تخیل (خیال) سے بھی باز آجائے عمل یا شریعت یا شریعت کی حدود سے بے متعلق نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ اسی سلسلۂ عمل کا ایک باطنی کنارہ تصور کیا جائے گا۔

اور جب کہ اسی باطنی جڑ ہی سے ظاہر کی یہ ساری تعمیر اٹھتی ہے تو اسے اس شرعی ممنوع کی اساس وبنیاد کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ ممنوع کہا جانا ضروری ہوگا۔ پس آدابِ شرعیہ کہیں باہر سے لا کر شریعت کے سر نہیں تھوپے جاتے۔ بلکہ شریعت ہی کے اندر سے نکال کر شرعی نظام میں اپنے موقع پر چسپاں کر دیئے جاتے ہیں۔

تحفظِ دین کا طبعی نظام...... اسی طرح مثلاً شراب بلاشبہ حرام ہے لیکن اس سے بچنے کے لئے وہ برتن بھی ممنوع الاستعمال قرار دیئے، جو شراب خوری کے لئے مخصوص ہوں اور جن کے استعمال سے خواہ مخواہ ہی شراب کا دھیان آئے۔ تا کہ ان کے سامنے نہ رہنے سے شراب کا دھیان ہی نہ آنے پائے۔ پس ان ذرائع کے استعمال کو قطع کر کے شریعت نے اصل مقصد (ترکِ شراب) کو محفوظ اور مستحکم کر دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان ذرائع سے بچتے رہنے کا خوگر انسان شراب خوری ہی سے نہیں بچے گا بلکہ اس کے تخیل پر بھی لاحول پڑھے گا۔ حالانکہ بظاہر یہ تخیل ممنوع یا گناہ نظر نہیں آتا، لیکن جب وہ اصل ممنوع اور معصیتِ کبیرہ تک پہنچ دینے کا طبعی راستہ اور ذریعہ ہے اس لئے اس ذوقی حکم (ترکِ تخیل) کو بھی راہِ شریعت سے بے تعلق نہیں کہا جائے گا بلکہ انتظامِ شریعت کی ذاتوں پر اسے احتیاطی حکم کہا جائے گا۔ جس کے لئے فتوی کا لفظ استعمال نہیں کر سکیں گے تقوی کا کلمہ استعمال کریں گے۔ سطح پرست نگاہوں میں تقوی کی یہ حدود خواہ وہم پرستی دکھائی دیں یا تنگ خیالی نظر آئیں مگر دوربین نگاہوں میں یہ احتیاطی حدود تحفظِ دین کا ایک طبعی اور سائنٹیفک نظام ہی نظر آئیں گی جو لوازمِ شریعت ... ہی چراگاہ کے لئے ڈول بندی کا حکم رکھتی ہیں، تا کہ غیر محتاط چرنے والے ان ڈول بندیوں سے بھی باہر نہ باہر رہیں اور اصل چراگاہ تک نہ پہنچنے پائیں۔ پس مثلاً ایک مبصر کے نزدیک کسی ممنوع مقصد سے روکنے کا طریقہ

اس کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا کہ اس کے تمام وسائل اور بعید سے بعید ذرائع سے بھی روک دیا جائے ورنہ اصل مقصد سے بچائے جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس لئے یہ دقیق حدود عمل بھی جو بظاہر کتاب وسنت کے الفاظ میں صراحۃً نظر نہ آئیں معانی کتاب وسنت کا جزبن کر ماموراتِ ومنہیات کا ہی جز کہلائیں گی۔

ذوقِ ادب کا نتیجہ...... فقہاء ومجتہدین رحمہ اللہ علیہم نے ان ہی مخفی حدود کو اپنے نورِ اجتہاد سے کھول دیا ہے جس پر وہ مخترع کہلائے۔ حالانکہ ان سے زیادہ متبع دوسرا نہیں کہ ظاہری حدود کے ساتھ باطنی حدود تک کو بھی شریعت ہی کے اندر سے نکال کر ان کا اتباع کیا اور کرایا۔ مثلاً اسی زنا وشراب کے جزئیہ میں فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر ایک شخص اپنی بیوی سے مجامعت کرتے وقت کسی اجنبی عورت کا دھیان باندھ لے تو یہ فعلِ مباشرت اس کے حق میں ناجائز ہو جائے گا۔ کیوں کہ اس نے اگرچہ عمل سے زنا نہیں کیا لیکن تخیل سے زنا کرلیا۔

پس اگر نصوص کتاب وسنت میں لفظوں میں اس خیالی زنا کی ممانعت وارد نہ بھی ہو تب بھی اس حکم کو فقہاء کا اختراع نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ ممانعت زنا کی ان ہی مخفی حدود کے سلسلہ کی ایک ناگزیر کڑی کہا جائے گا جو آداب کے عمل پیہم سے ذوقِ ادب اور ذوقِ تقویٰ کا ایک طبعی نتیجہ ہے۔ جسے فقہاء نے بصورت حکم ظاہر کردیا ہے۔ گویا یہ اسی ممانعت زنا کا ایک انتہائی مخفی کنارہ ہے جو احکام کے طویل اور مرتب سلسلہ کے ساتھ درجہ بدرجہ جڑا ہوا ہے۔ جسے عام نگاہیں نہ دیکھ سکیں مگر مبصر نگاہوں نے اسے پالیا۔

یا جیسے فقہاء ہی کی تصریح ہے کہ اگر کوئی شخص رنگین شربت پیتے ہوئے (جو بلا شبہ حلال ہے) شراب پینے کا دھیان باندھ لے کہ گویا وہ شراب کا جام چڑھا رہا ہے تو شربت نوشی اس کے حق میں خیالی شراب نوشی ہونے کے سبب ناجائز ہو جائے گی کیوں کہ اس نے فعلاً گو شراب نہیں پی مگر خیالاً ضرور پی لی اور اگر اس پر قضاءً ظاہر شریعت کی رو سے شراب خوری کا حکم نہیں لگایا جائے گا تو دیانتاً شارع حقیقی (رب العزت) کی طرف سے اس کے باطن کو ضرور شراب خور کہا جائے گا۔

مخفی گناہوں پر مخفی تعزیرات...... ہاں پھر جیسے افعال زنا وشراب پر حد شرعی اور تعزیرات جاری ہوں گی، ایسے ہی ان باطنی حدود کی خلاف ورزی پر بھی آدمی مواخذہ سے نہیں بچ سکتا، قضاءً نہ سہی تو دیانۃً ہی سہی۔ اگر آفاقی سزائیں نہ دی جائیں تو انفسی (ذاتی) ہی سہی یعنی فعل زنا وشراب پر اگر سنگساری اور درّہ زنی کی حد جاری ہوتی، تو اس ذہنی زنا کاری اور شراب خوری پر انفسی بیماریاں، آفاتِ غم والم تشویش وپراگندگی، فتنے اور پریشانیاں باطن پر ہجوم کر آئیں گی۔

اور پھر اس سے بھی بڑھ کر سزا یہ کہ قلب کی نورانیت زائل ہو کر اس میں ظلمت وکدورت کے بادل امنڈ آئیں گے جو اس کے سکون کو زائل کر کے قلب کی بڑی سے بڑی بیماری کا دروازہ کھول دیں گے۔

”نیست بیماری چو بیماری دل“

پس یہ تشریعی رنگ کی سزائیں نہ ہوں گی تو تکوینی رنگ کی ہوں گی۔ ظاہری آلات سے نہ دی جائیں گی تو

باطنی وسائل سے دی جائیں گی کیوں کہ یہ جرائم ہی باطن اور باطنی آلات (فکر وخیال) سے عمل میں آئے تھے۔ وہ کھلی سزائیں بھی من اللہ تھیں اور یہ مخفی سزائیں بھی جن کا تعزیر ہونا مخفی ہے، من اللہ ہی ہیں۔ بہر حال ظاہر و باطن میں سے جس سے بھی شراب خوری وزنا کاری کا صدور ہوگا اور ان میں سے کسی پر بھی آدمی مؤاخذۂ خداوندی سے بری نہیں رہ سکتا۔ ﴿وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللَّهُ ۖ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ ① ”اور جو باتیں نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم زبان وغیرہ سے ظاہر کرو گے یا دل میں پوشیدہ رکھو گے، حق تعالیٰ دونوں حالتوں میں تم سے حساب لیں گے، پھر بجز کفر و شرک کے جس کے لئے بخشنا ہوگا بخش دیں گے اور جس کو منظور ہوگا سزا دیں گے اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں“۔ حاصل یہ نکلا کہ: قانون الٰہی دنیوی سلطنتوں کے قوانین کی طرح فقط آدمی کے ظاہر اور جسم پر ہی نہیں چلتا بلکہ بدن سے لے کر قلوب وارواح اور نیات پر لاگو ہوتا ہے۔ پس ظاہری شریعت کی رو سے تو شراب وزنا کبیرہ گناہ تھے اور ان کے ظاہری وسائل صغیرہ گناہ جن پر ظاہری حدود وتعزیرات جاری ہوتی تھیں۔ لیکن حاکم حقیقی حق تعالیٰ شانہ، کی عظمت وجلال اور ظاہر وباطن میں اس کے حاضر وناضر ہونے کی حیثیت سے یہ خیالی زنا وشراب بھی اہل باطن کے نزدیک اکبر الکبائر کہلائے گا جس پر باطنی سزا مرتب ہوگی۔

وسائل عبادت پر اجر وثواب ...... آداب کے سلسلہ میں دو مثالیں منہیات کی عرض کی گئیں، یہی صورت مامورات کی بھی ہے کہ ان میں بھی آداب کا ایک سلسلہ ہے جو اصل مقاصد اعمال کے تحفظ کا ضمانت دار ہے، مثلاً نماز کا فعل مقصود اصلی ہے جو حقیقی عبادت ہے۔ لیکن اس کی تسہیل اور تحفظ کے وسائل بلکہ دواعی میں مثلاً جماعت ہے جو موجب پابندیٔ نماز اور باعث ترقی اجر وقرب ہے تو وہ سنت مؤکدہ قرار دی گئی، پھر جماعت کی تیاری کے لئے اذان کی نوا اور اجابت مؤذن (یعنی کلمات اذان سننا اور مؤذن کی آواز کے ساتھ ساتھ اپنی زبان سے انہیں دہرانا مستحب قرار دیا گیا) جس سے شرکت جماعت کا اہتمام پیدا ہوتا ہے۔

پھر اس اجابت اذان کے لئے مستعد ہونے کا ذریعہ طہارت اور ضروریات سے فراغت ہے تاکہ نشاط کے ساتھ اجابت مؤذن اور حاضری مسجد کی توفیق ہو تو اس کی بھی ترغیب وتاکید کی گئی۔

غرض درجہ بدرجہ اہتمام طہارت وسیلہ ہے اجابت مؤذن کا اور اجابت مؤذن وسیلہ ہے مسجد کی طرف توجہ کرنے کا اور توجہ مسجد وسیلہ ہے اقدام جماعت کا اور یہ اقدام جماعت وسیلہ ہے پابندی صلوٰۃ کا جو اصل مقصود ہے، اس لئے نماز کے اجر کے ساتھ ساتھ ہی ان وسائل کا اجر بھی وابستہ فرمایا گیا۔

طہارت کو نصف ایمان اور مزیل معاصی قرار دیا گیا اور اجابت مؤذن کے اختتام پر قبولیت دعاء کا وعدہ دیا گیا، حاضری مسجد کے اقدام پر قدم قدم پر ایک نیکی لکھے جانے اور ایک ایک بدی مٹا دیئے جانے کا وعدہ فرمایا گیا۔

① پارہ: ۳، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۲۸۴۔

حاضریٔ مسجد اور انتظارِ صلوٰۃ کو حکم میں صلوٰۃ کے رکھا گیا، شرکت جماعت پر ستائیس درجہ اجر وثواب کے اضافہ کا وعدہ فرمایا گیا اور اصل نماز کو نور اور دستاویز ایمان کہہ کر اسے فحش ومنکر سے بچاؤ کا ذریعہ بتلایا گیا ہے جس سے نفس انسانی پاک اور مہذب ہو جائے۔

پس مقصود تو نماز کا فعل ہے مگر یہ تمام امور چونکہ اس کی تحصیل وتکمیل کے وسائل اور حدود ہیں، اس لئے یہ سب نماز کے آداب کہلائیں گے۔ اگر اس کا اہتمام کیا گیا تو نماز قائم رہے گی ورنہ ضائع ہو جائے گی اور آدمی کو اس کی پابندی نصیب نہ ہوگی۔

تارک آداب تارک شریعت ہے...... پس ادب کا حاصل یہ نکلا کہ وہ سلسلہ ماموراتِ میں تو محافظ فرائض ہے اور سلسلہ منہیات میں مدافع محرمات ہے، فرائض کے آداب امتثالی حدود کہلائیں گے اور محرمات کے آداب کو احترازی حدود کہا جائے گا۔

محرمات کے آداب بجالانے سے تو محرمات سے بچاؤ میسر آئے گا اور فرائض کے آداب بجالانے سے فرائض میں جماؤ میسر آئے گا، فرائض کے آداب کی پابندی فرائض کی محبت دل میں جاگزیں کرے گی اور محرمات کے آداب کی پابندی محرمات سے نفرت دل میں بٹھائے گی۔ اس لئے فرائض کے آداب تو درحقیقت تحلیہ کے وسائل ہیں جن سے نفس انسانی آراستہ ہوتا ہے اور محرمات کے آداب تخلیہ کے وسائل ہیں جن سے نفس کے جبلی عیوب ونقائص زائل ہوتے ہیں۔

اور اس طرح آداب کی تزئینی نوع تو نفس کو مانجھتی اور صاف کرتی ہے اور فعلیاتی نوع اس پر قلعی کر کے اسے چمکاتی ہے۔ اندریں صورت ظاہر ہے کہ ان آداب کی محرومی سے نہ فرائض باقی رہ سکتے ہیں نہ محرمات۔ گویا تارک آداب درحقیقت تارک فرائض ومحرمات اور بالفاظ دیگر تارک شریعت ہے، اس لئے کتاب وسنت نے ان آداب اعمال کی طرف خاص توجہ دی ہے اور ہر باب میں آداب کا ایک عظیم ذخیرہ پیش کیا ہے۔ جن میں بعض آداب قرآن وحدیث کی عبارت میں صراحتاً موجود ہیں اور بعض ان کی دلالت واشارت اور اقتضاء میں پنہاں ہیں۔ جو بغیر فقہاء ملت اور حکمائے امت کی مدد کے ہر کس وناکس کے سامنے نہیں آسکتے۔ اسی لئے بطور مثال ہم نے تخیلاتی معاصی کی مثالیں پیش کیں تاکہ آداب کی اس نوع کی طرف بھی قلوب کی توجہ رہے اور یہ بغیر فقہائے امت کا دامن سنبھالے ہوئے میسر نہیں آسکتی۔

فقہاء کا مقام معرفت...... الفاظ پرست اور بے بصر لوگ جو شرعی پابندیوں کا جوا یا سرے سے اپنے کندھوں سے اتار پھینکنا چاہتے ہیں یا شریعت کی الفاظ کی آڑ لے کر کم از کم اپنے باطن کو اس کی باطنی قیدوبند سے آزاد دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ فقہاء کے ان دقائق کو شِرْکٌ فِی النُّبُوَّۃ وغیرہ کے کریہہ الفاظ سے تعبیر کر کے ان کی علمی کاوشوں اور توفیقی ریاضتوں کی بے قدری کریں۔ لیکن حقیقت شناس بصر جوان شرعی حکماء اور دینی فلاسفہ

کے بلند مقام سے کسی حد تک بھی واقفیت رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان فقہاء نے نہ صرف شرعی احکام ہی کو سمجھا ہے۔ بلکہ احکام کے ظاہری و باطنی سلسلوں کو بھی سمجھا ہے اور اس لئے وہ صرف حکم شرعی ہی بیان کر دینے پر قناعت نہیں کرتے۔ بلکہ وہ حکم کے سلسلہ سے جڑے ہوئے تمام ظاہری و باطنی مراتب احکام اور ان کی ان آخری اور احتیاطی حدود کو بھی نمایاں کر دیتے ہیں۔ جو بظاہر نظرِ شرعی تعبیرات میں نظر نہیں آتیں مگر ان کے معانی اور مدلولات میں اس طرح لپٹی ہوئی ہوتی ہیں جیسے الف با، کے بتیس حروف میں ہزار ہا کلمات و عبارات لپٹی ہوئی ہوتی ہیں اور جس طرح الف با، سے گذر جانے والا بصر ہی ان حروف کی ترکیب و تحلیل سے مختلف معانی نمایاں کر دیتا ہے جن کو قاعدہ بغدادی پڑھنے والا سمجھ بھی نہیں سکتا۔ ایسے ہی یہ معانی شرعیہ کے بصر شریعت کی ان ہی جامع تعبیرات سے ان میں لپٹی ہوئی مختلف حدود اور مخفی احکام کو اپنے روشن فہم اور گہرے ذوق سے باہر کھینچ لاتے ہیں جن تک مبتدیوں اور مدعیوں کی نگاہ تک بھی نہیں پہنچ پاتی۔

پس یہ فقہاء امت کسی تمام طب کے اطباء کی طرح کسی مریض کے سامنے آ جانے پر محض دوا بتلا دینے یا زیادہ سے زیادہ علامات مرض سے صورت مرض پہچان کر نسخہ تولی کر دینے تک محدود نہیں رہ جاتے۔ بلکہ امت کے امراض کے ساتھ ان کے اسباب و علل اور پھر آئندہ نتائج سے باخبر رہ کر ہر شرعی دوا کی خاصیت اور اس کے درجہ تاثیر کو بھی جانتے ہیں اور وہ بھی سطحی طور پر نہیں بلکہ امراض کے تجزیہ کے بعد دواؤں کا تجزیہ کر کے مرض کے ہر ہر جزو کی تشخیص اور دوا و مرض کے اجزاء میں تطبیق دینے کی قوت بھی رکھتے ہیں۔ جس سے ان کا مطلب ہمیشہ تیر بہدف ثابت ہوتا رہا اور آج تک دنیا اپنے مختلف امراض کا علاج ان ہی کے اصول و قواعد پر کرتی آ رہی ہے تا آنکہ دوست دشمن کوئی بھی ان کی ان قابل قدر مسائل سے مستغنی بن کر اپنے ایمان کو قائم رکھنے پر قادر نہیں ہے۔

فقہاء کا یہ وضع احکام شارع بننا نہیں کہ تجویزِ احکام کا شبہ کیا جائے بلکہ شارع اور شریعت کی ایک گہری معرفت ہے جس سے ظواہر شریعت کے ساتھ مضمرات شریعت بھی ان کے سامنے روشن ہو جاتے ہیں اور وہ انہیں نمایاں کر دیتے ہیں۔ اس لئے یہ راسخین فی العلم مجوزِ احکام نہیں بلکہ مظہرِ احکام ہیں۔ اختراعِ احکام نہیں کرتے بلکہ استنباط کرتے ہیں اور اس لئے ان کا اتباع ان کی ذوات کا اتباع نہیں بلکہ بالواسطہ شریعت ہی کا اتباع ہے، اس لئے آدابِ شرعیہ کے سلسلے میں کتاب و سنت کے منصوص آداب کے ساتھ اجماع قیاس کے ظاہر کردہ آداب کے ذخیرے بھی پیشِ نظر رکھے جائیں گے، ورنہ ظواہر نصوص کو لے کر باطنِ نصوص کو ترک کر دیا جاتا اور فقہاء کی مسائل سے فائدہ نہ اٹھانا نہ صرف حرمان (محرومی) ہی ہے بلکہ خسران (نقصان) بھی ہے۔

ذوقی آداب ...... پھر ان چاروں شرعی حجتوں کے آداب سے متادب بن کر اور گویا ذوقِ ادب کا خوگر ہو کر خود اس متادب پر ہی ادب کی بہت سی ذوقی راہیں کھلتی ہیں، جو دوسروں کے لئے خواہ حجت نہ ہوں مگر خود اس صاحب ذوق کے لئے حجیت کی کچھ نہ کچھ شان ضرور رکھتی ہیں۔ جو اس صاحب ذوق پر کسی کے قال سے نہیں بلکہ خود اس

کے اپنے حال سے نمایاں ہوتی ہیں اور اب وہ حاکم کے حکم ہی کے آگے ادب سے نہیں جھک جاتا بلکہ منشاء حاکم کے سامنے بھی سرادب خم کر دیتا ہے بلکہ وہ نہ صرف حاکم حقیقی کی ذات اقدس ہی کا ادب کرتا ہے بلکہ جو بھی اس کے نامزد ہو جائے وہ اس کے آگے بھی ادب سے گردن جھکا دیتا ہے۔ اگر کوئی مکان اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نامزد ہو جائے تو وہ اس کا بھی ادب کرتا ہے۔ جیسے بیت اللہ و بیت الرسول یا آثار و مشاہد اہل اللہ۔

اگر کوئی شخص اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لگ جائے تو وہ ان کا بھی ادب کرتا ہے جیسے رسول اللہ اور نائب رسول اللہ۔ اگر کوئی کاغذ یا ورق خدا اور رسول کی طرف منسوب ہو جائے تو وہ اس کا بھی ادب کرتا ہے جیسے کتاب مصحف اور کتب حدیث و دینیات۔ غرض ادب کے شرعی طریقوں کی پابندی کے ثمرہ میں بہت سے ذوقی آداب اس پر منکشف ہوتے ہیں اور وہ اپنے ضمیر کی آواز سے ان پر عمل درآمد کرنے کے لئے بطوع و رغبت جھک جاتا ہے، گو ظواہر شریعت میں ان آداب کے الفاظ دستیاب نہ ہوں۔

ہجرت کے موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے دولت خانہ کے نچلے حصہ میں فروکش ہوئے، بالائی منزل پر وہ اور ان کے اہل و عیال فروکش تھے۔ تمام رات حضرت ابو ایوب مکان کے ایک ایسے کونے میں سکڑ کر بیٹھے رہتے جس کے بارے میں یقین ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی سیدھ میں نیچے نہیں ہوں گے۔ حالانکہ ظاہر شریعت میں نہ انہیں اس کا امر تھا اور نہ ہی وسط مکان میں رہنا ان کے لئے ممنوع تھا۔ مگر ذوق ادب نے اس طرز عمل پر انہیں مجبور کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حدیبیہ کے موقع پر صلح نامہ میں سے اپنے نام مبارک کے ساتھ لکھے ہوئے لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محو کر دینے کا حکم دیا۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صریح حکم کے باوجود اس کی جرأت نہیں کی۔ ① تو یہ ذوق ادب ہی مانع تعمیل ہوا۔ جو ہزار تعمیلوں سے بڑھ کر تعمیل و طاعت تھی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ زیارت مدینہ کے موقعہ پر گیارہ دن مدینۂ منورہ میں قیام پذیر رہے، مگر بول و براز نہ کیا محض اس جذبۂ ادب سے کہ مدینہ کی پاک زمین کو جو مسکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مرقد صحابہ رضی اللہ عنہ ہے، میں کس طرح آلودہ کروں۔

ظاہر ہے کہ یہ شرعاً ممنوع نہ تھا مگر یہ ادب حال تھا رسم مقال نہ تھا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جو امام دارالہجرت ہیں ساری عمر مدینہ میں گزاری اور وہیں کی خاک پاک میں مدفون ہو گئے۔ لیکن اس پورے عرصہ عمر میں مدینہ کی گلیوں میں جوتہ پہن کر کبھی نہیں گھومے، کہ ایسا نہ ہو میری جوتیاں اس مقام پاک پر پڑ جائیں جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدم مبارک پڑا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ محض جوش ادب تھا جو ذوقی طور پر بطور حال کے دل میں جوش زن تھا ظواہر شریعت میں اس کا امر کہیں بھی لفظوں میں ذکر نہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ نے مکہ

① الصحیح للبخاری، کتاب الصلح، باب کیف یکتب ھذا ما صالح فلان بن فلان، ج: ۹، ص: ۲۰۲.

معظّمہ میں ہجرت فرما کر عمر بھر سیاہ رنگ کا جوتا نہیں پہنا کہ یہی رنگ غلاف کعبہ کا ہے، میں اسے پیروں میں کیسے ڈالوں؟ ظاہر ہے کہ یہ شرعاً ممنوع نہ تھا، مگر ادب کا ایک حال تھا جو قال سے بالاتر تھا۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ بانی دارالعلوم دیو بند، حضرت صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے لئے کلیر شریف جاتے تو رڑکی سے پانچ میل پاپیادہ ننگے پیر سفر فرماتے۔ ظاہر ہے کہ شریعت کی نصوص میں اس قسم کا کوئی امر موجود نہیں، مگر تعیین اوامر کا ذوقی اور وجدانی جذبہ ہے، جو ان کی ذات کی حد تک انہیں ان آداب پر مجبور کرتا تھا۔

اعمال شرعیہ کی مشق کا طبعی ثمرہ...... حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کو روضہ اقدس کی گیلری کا جھڑاون (جھاڑو کے ذریعہ جمع شدہ خس وخاشاک اور مٹی وغیرہ) مل گیا تو اسے پسوا کر اپنے سرمہ میں شامل کیا اور عمر بھر اس کی سلائی آنکھوں میں پھیرتے رہے، ظاہر ہے کہ یہ صورتیں شرعی احکام کی نہ تھیں ذوقی جذبات ادب تھے۔ آداب شرعیہ کی مشق سے بطور ملکہ کے دل میں جڑ پکڑ چکے تھے، اور ان مختلف صورتوں سے نمایاں ہوتے تھے۔ بلاشبہ یہ تقلید واتباع یا دعوت دینے کی چیزیں نہیں مگر آداب کا مبصر اور صاحب حال بن جانے پر خود بخود عمل میں آنے کی چیزیں ہیں جن سے روکنے کا بھی کسی کو حق نہیں کیوں کہ یہ ان اعمال شرعیہ کی مشق کا طبعی ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ اس لئے واجب الاحترام اور لائق صد ادب ہی نہیں بلکہ درجہ حال میں قابل اتباع وپیروی بھی ہے۔

حاصل یہ نکل آیا کہ جن آداب کو لے کر علماء اسلام اٹھے تھے اور جن آداب کی دعوت شریعت اسلام نے پیش کی خواہ وہ شرعی عبارات میں نمایاں ہوں یا ان کی دلالت واشارات میں مخفی ہوں یا اہل اللہ کے پاک ذوق وجدان سے نکلیں وہ لفظی آداب اور سطحی رسوم نہیں کہ ان کی اجزاء ترکیبی کلام کی صنعت گری، تزئین بیان، لفظوں کی شائستگی اور برجستہ گوئی یا مروجہ رسوم ادب کی ڈھونگ بندی اور رواجی ڈھنگوں پر لفظ وبیان کے مقررہ کلمات ادا کر دینا یا سر جھکا دینا ہوں۔ بلکہ وہ حقیقی ادب ہے جس کے اجزائے ترکیبی فکر ونظر کے ساتھ نصوص کے بعید محتملات کی تعمیل، احتیاطی حدود پر عمل درآمد، تہذیب عمل کے ساتھ تہذیب خیال وتصور وریاضت نفس مجاہدۂ عمل، تادیب جوارح، تزکیہ باطن وتصفیہ قلب اور لوجہ اللہ ترک شہوات ولذات ہیں۔ یہی ادب ہے جو انبیاء نے اختیار کیا، صلحا نے لیا، صدیقین نے اسے اپنایا اور اسی کے ذریعہ سے اپنے دین ودیانت کو محفوظ اور مضبوط بنایا۔

سرچشمۂ ادب...... اس مقام ادب پر پہنچ کر نہ عبارت آرائی باقی رہتی ہے، نہ تزئین الفاظ وفقرات، نہ شستہ کلامی کے جذبات قائم رہتے ہیں، نہ سلاست بیانی کے، نہ مروجہ رسوم ہیئت وبدن باقی رہتی ہیں، نہ بناوٹی تعظیم وتوقیر بلکہ سادگی وبے تکلفی کے ساتھ حقیقی عظمت وادب اور حقیقی اظہار ضمائر باقی رہ جاتا ہے جس میں زینت کی بجائے خلوص آرائش کی بجائے للہیت ومحویت باقی رہ جاتی ہے۔

بلکہ اس مرحلہ پر پہنچ کر بھرپور کلام وبیان کو حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نفاق سے اور عجز بیان کو (جبکہ حق کی عظمت ورطۂ حیرت میں ڈال کر زبانوں کو گونگ بنادیتی ہے) ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے کہ عشق کے لئے زبان کی

ضرورت نہیں وہ خود اپنے مقصد کا اظہر رہے اور وہاں اعلان ادب کی ضرورت نہیں، کہ وہ خود ہی ایک مستقل ادب اور سرچشمہ ادب ہے۔

پارسی گو گرچہ تازی خوشتر است	عشق را خود صد زبان دیگر است
بوئے او دلبر چو پراں می شود	ایں زبانہا جملہ حیراں می شود

رسمی علم وادب کو حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تجمل اور زینت بدن بتلایا گیا ہے علامات قیامت میں سے ایک بڑی علامت یہ بھی فرمائی گئی ہے کہ لوگ اپنے علم سے تجمل اور زینت حاصل کرنے لگیں۔ اور جیسے وہ خوشنما کپڑوں اور آراستہ مکانوں سے زینت حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح علم وادب بھی محض رونق محفل کا آلہ بن کر رہ جائے، نہ رونق باطن بنے اور نہ باطن نفس میں حقیقی ادب کی جڑیں پھیلیں۔

پس ایسے ادب میں جبکہ جاہلانہ انداز سے محض رسوم شرعیہ کو رواجی اندازوں سے قائم رکھا جاتا ہے، رسوم شرعیہ باقی رہ جاتی ہیں۔ مگر حقائق شرعیہ کلیۃً گم ہو جاتی ہیں، اسلئے الفاظ ورسوم ادب کا یہ بے روح نقشہ، ایک مردار لاشہ کی طرح ہو جاتا ہے جس کا کوئی نفع نہ دنیا میں ظاہر ہوتا ہے نہ آخرت میں۔

ظاہر ہے کہ یہ لفظی ادب اور رسمی توقیر نہ اہل اللہ اور اہل دین کا ادب ہے، اور نہ ان کے شایان شان ہے اور نہ اسے جوہر عمل کہا جا سکتا ہے۔ جس کی شرعی حیثیت سے تحسین کی جاسکے جوہر عمل اور روح تقویٰ وہی ادب ہے جو ان رسمیات سے بالا رہ کر اپنے اندر ادب کی حقیقی روح رکھتا ہو۔ اور شاعرانہ، عامیانہ، رسمیانہ، متکبرانہ اور منافقانہ رسوم آداب سے بچا کر پیغمبرانہ آداب واخلاق اور منکسرانہ حدود ورسوم پر لگادے تا کہ انسان میں فناء نفس اور رضاء حق کے جذبات ابھر جائیں اور نفس انسانی صحیح معنوں میں شائستہ اور ربانی بن جائے۔ جس سے اسے مطلوبہ سعادت حاصل ہو جائے اور شقاوت سے بچ کر حقیقی نجات سے ہمکنار ہو جائے۔

نماز پورے اسلام کی میزان

نماز میں عبادت کا پہلو......شرعاً عبادت کے معنی غایت تذلل یعنی انتہائی ذلت اختیار کرنے کے ہیں جس کے آگے ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔نماز میں دو ہی بنیادی چیزیں ہیں ایک اذکار جو زبان سے متعلق ہیں اور ایک ہیأت جو اعضاء بدن اور جوارح سے متعلق ہیں۔اذکار میں ثناء سے فاتحۂ سورت تک پھر تسبیحات سے لے کر التحیات تشہد تک اپنی عبودیت،غلامی،اور فدویت یا اللہ کی عظمت اور برتری اور لامحدود بزرگی کے سوا کسی اور چیز کا بیان نہیں ہوتا۔اور ہیأت کے لحاظ سے نیازمندانہ سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا،پھر رکوع میں جھکنا اور آخر کار اپنی سب سے زیادہ باعزت چیز پیشانی کو اپنے معبود کے سامنے خاک پر ٹیک دینا اور اس کی عزت کے سامنے اپنی ذلت مطلقہ کا عملاً ہیئۃً اعتراف ہے۔جو عبادت کا اصل مقصود یعنی خدا کے آگے اپنی انتہائی ذلت اور رسوائی ہے۔

نماز تمام کائنات کو جامع ہے......ارشاد ربانی ہے: ﴿كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ.﴾① یعنی ہر ایک نے اپنی نماز اور تسبیح کو جان لیا ہے،حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بعض تصانیف میں تصریح کی ہے کہ ہر ایک چیز کی نماز کی ہیئت اس کی خلقت کے مناسب حال رکھی گئی ہے۔تا کہ اس کی نماز،اس کی خلقی وضع قطع سے طبعاً ادا ہوتی رہے،مثلاً درختوں کی نماز قیام ہے،ان کی صورت نوعیہ ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ گویا اپنی ساق پر کھڑے ہوئے قیام کے ساتھ نماز ادا کر رہے ہیں۔چوپایوں کی نماز رکوع ہے،وہ گویا ہر وقت اللہ کے سامنے رکوع میں جھکے ہوئے ہیں،جس سے انحراف نہیں کر سکتے۔پھر حشرات الارض یعنی رینگنے والے اور پیٹ کے بل سٹک کر چلنے والے کیڑوں مکوڑوں مثلاً سانپ،بچھو،چھپکلی اور کیڑے مکوڑے کی نماز بصورت سجدہ ہے،ان کی خلقی ہیئت سجدہ نما بنائی گئی ہے کہ وہ اوندھے اور سرنگوں رہتے ہیں۔گویا ہر وقت اللہ کے سامنے سربسجود اور سرنگوں رہتے ہیں،پہاڑوں کی نماز تشہد ہے۔

گویا ہر وقت زمین پر دو زانو جے بیٹھے ہیں اور ہمہ وقت التحیات میں ہیں۔پھر اڑنے والے پرندوں کی نماز انتقالات ہیں کہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے منتقل ہوتے ہیں۔جیسے انسان قیام سے قعود اور قعود سے قیام کی طرف منتقل ہوتا ہے،پرندوں کے انتقالات ہی عبادت میں شمار ہوتے ہیں۔پھر سیاروں اور آسمانوں کی نماز دوران اور گردش ہے کہ ایک نقطہ سے گھوم کر پھر اسی نقطہ پر آجاتے ہیں۔جیسے ایک نمازی رکعت پڑھ کر پھر عود کرتا ہے۔پھر

①پارہ:۱۸،سورۃ النور،الآیۃ:۴۱۔

زمین کی نماز تکوینی جمود اور سکون ہے۔ گویا ساکت اور صامت ہو کر اپنے مرکز پر جمی ہے جو انتہائی تذلل اور خشوع ہے۔ پھر جنت و نار کی نماز سوال ہے کہ اے اللہ ہمیں ہمارے مکان کو پر کردے پھر ملائکہ کی نماز اصطفاف یعنی صف بندی ہے کہ وہ قطار در قطار جمع ہو کر یادِ الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔

پھر یہی سب ہیئتیں جوان جمادات ونباتات وحیوانات اور ملائکہ میں منقسم ہیں۔ بنی آدم اور دنیا کی مختلف اقوام میں تقسیم کی گئی ہیں، مثلاً کسی قوم کی نماز محض قیام، کسی قوم کی نماز نیم قیام کہ گھٹنوں کے بل ڈنڈوت کھیلنا، کسی قوم کی نماز محض رکوع، کسی قوم کی نماز اوندھا لیٹ جانا، (یعنی سجدہ) اور کسی قوم کی نماز مجموعۂ صلوٰۃ اقوام ہے۔ نباتات میں درختوں کا سا قیام، چوپایوں کا سا رکوع، فرشتوں کی سی صف بندی، آسمانوں اور سیاروں کی سی گردش اور پہاڑوں کا سا قعود ہے، اذکار میں ہر مخلوق کی تسبیح اور ذکر ان کی خلقت اور استعداد کے مطابق جدا جدا ہے، جس کو دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾ ① یعنی ہر چیز اللہ کی تسبیح وتحمید کرتی ہے لیکن تم نہیں سمجھ سکتے۔ اسی طرح ہر قوم کو اس کے مناسب ہی اذکار تلقین کئے گئے کسی قوم کو تعوذ کا حکم تھا، کسی پر سوال ودعاء کا غلبہ۔ چونکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دین مکمل کر دیا گیا۔ اس لئے مسلم کی نماز تمام اقوام کی جامع کر دی گئی، جو فطرتِ الٰہی نے اقوامِ عالم میں مختلف نمازوں میں منقسم کی تھیں۔

اوقات کی جامعیت...... اوقاتِ نماز بھی جامع ہیں یعنی جو وقت فطری طور پر روح کے طبعی میلان کا ہے یا نفس کے طبعی انحراف کا ہے۔ ان سب اوقات کو نماز نے اپنے اندر مشغول کر لیا ہے۔ صبح کا سہانا وقت روح کے نشاط کا تھا تو نمازِ فجر نے اسے لیا، ظہر کا وقت سہل کا تھا تو ظہر کی نماز نے اس میں چستی پیدا کر دی۔ عصر کا وقت تفریح کا تھا تو عصر نے اس غفلت کو توڑ دیا۔ مغرب کا وقت انقلاب آفتاب کا تھا تو مغرب کی نماز نے مقلب اللیل کی طرف جھکا دیا۔ عشاء کا وقت خاتمہ کا تھا تو نمازِ عشاء نے خاتمہ بالخیر کر دیا، پھر نفل نمازوں نے دوسرے اوقات کی خصوصیت کے ماتحت انہیں عبادت میں مشغول کر دیا۔ گویا اگر ایک انسان تمام اذکار واطاعت کی بجائے صرف ان مقررہ واجب ونفل اوقات میں نماز کا اہتمام کرے تو وہ کبھی غافل نہیں ہوتا۔ نماز میں روزہ، اعتکاف، حج اور زکوٰۃ کی حقیقت موجود ہے۔ روزہ کی حقیقت ہے، صبح صادق سے کھانے پینے اور عورتوں سے متمتع ہونے سے بچنا، یہ چیزیں نماز میں بھی ممنوع ہیں۔ بلکہ نماز میں ان کے علاوہ سلام، کلام، عورتوں کو چھو دینا، ہنسنا، بولنا، چلنا، پھرنا اور عام نقل وحرکت سب ہی ممنوع ہے۔ اس لئے نماز میں روزہ اپنی انتہائی شکل کے ساتھ موجود ہے۔

اعتکاف صوم میں ضروریات بستر پہ پوری کر لینے، سو جانے، لیٹ رہنے اور کھانے پینے کی اجازت ہے لیکن نماز میں یہ سب امور مفسدِ صلوٰۃ ہیں۔ بلکہ مسجد میں ٹہلنے اور نقل وحرکت کی بھی اجازت نہیں اس لئے نماز کا اعتکاف زیادہ مکمل ہے اور نماز اعتکاف کو بھی جامع اور حاوی نکلی۔ حج کی حقیقت تعظیم بیت اللہ اور تعظیم حرم محترم ہے۔

① پارہ: ۱۵، سورۃ بنی اسرائیل، الآیۃ: ۴۴.

نماز میں تعظیم بیت اللہ کا یہ مقام ہے کہ استقبالِ قبلہ شرطِ صحتِ صلوٰۃ ہے کہ اس کے بغیر نماز ہی نہیں ہوسکتی پھر جس طرح طواف میں بیت اللہ کے سامنے رفع یدین کر کے گردش طواف شروع کرتے ہیں، بعینہ نماز میں بیت اللہ کی طرف منہ کر کے تعظیماً رفع یدین کر کے نماز شروع کرتے ہیں، پھر جس طرح طواف اذکار وادعیہ سے بھرپور ہے، نماز بھی ہمہ قسم اذکار (تلاوت، درود شریف، تسبیحات وغیرہ) موجود ہیں۔

پھر جس طرح حج میں حرم محترم کی حدود میں رہ کر تا مسجدِ عرفات یادِ حق میں مصروف رہتے ہیں اسی طرح مسجد کے حرم محترم میں رہ کر ذکر الٰہی اور نوافل میں معروف رہتے ہیں پھر جس طرح حرم محترم میں شیطان کے آثار کو سنگریزوں سے سنگسار کیا جاتا ہے، بعینہ نماز کے ذریعے شیطان کے شر کو معنوی ہتھیار کے ذریعے دفع کیا جاتا ہے، پھر جس طرح حج میں طواف وداع کر کے رخصت چاہی جاتی ہے۔ بعینہ نماز میں سلام ودعاء کر کے دربار الٰہی سے رخصت ہوا جاتا ہے۔ غرض حج کی پوری حقیقت اپنے اہم اجزاء کے ساتھ نماز میں بعینہ یا بشکلہ موجود ہے، زکوٰۃ کی حقیقت تزکیہ نفس ہے، یعنی محبت دنیا سے قلب کو پاک کرنا، نماز میں بھی تزکیہ نفس اور تزکیہ روح ہے کہ نفس ماسوی اللہ سے بیزار ہو کر صرف اللہ جل ذکرہ کا ہورہے۔ زکوٰۃ کی حقیقت اس طرح نماز میں موجود ہے اور زکوٰۃ کی صورت یوں ہے کہ نماز کے لئے مسجد، چٹائی اور حوض پر فی سبیل اللہ مال خرچ کرنا پڑتا ہے، جس طرح زکوٰۃ میں بھی فی سبیل اللہ مصارف لازم ہیں۔

نماز سے انانیتِ نفس کا ازالہ...... نماز سے انانیت اور کبرِ نفس کا ازالہ ہوتا ہے جو ہزار ہا بدخلقیوں اور بداعمالیوں کی اساس ہے کیوں کہ کبرِ نفس جب تک باقی رہ سکتا ہے کہ اپنے سوا کسی دوسرے کی عظمت دل میں نہ ہو، اور نماز سے حق تعالیٰ کی عظمت دل میں آجاتی ہے اور جب کسی کی عظمت قلب میں آجائے تو اس قلب میں کبروغرور پاس بھی نہیں پھٹکتا۔

نماز میں فنِ تصوف کا موضوع...... فنِ تصوف کا موضوع تہذیبِ نفس ہے، یعنی نفس کے رذائل زائل ہوں اور فضائل حاصل ہوں، اور نماز میں دو چیزیں سامنے ہوتی ہیں، نفس اور رب، نماز جب نفس کی تحقیر وتذلیل کرتی ہے تو وہ مرجاتا ہے اور اس کے آثار بھی مٹ جاتے ہیں اور رب کی عظمت مطلقہ نمایاں سامنے کر دیتی ہے۔ تو عنایات رب متوجہ ہوتی ہیں، اور وہ اپنے فضائل سے نوازتا ہے، اس سے واضح ہوگیا کہ نماز تہذیب نفس اور اصلاح نفس کے لئے افضل ترین مجاہدہ اور اعلیٰ ترین ذریعہ ہے۔

روحانی اور اخلاقی مقامات...... نماز چونکہ تزکیہ نفس کر دیتی ہے، اس کے بعد نفسانی احوال ومقامات پاکیزہ اور ارفع واعلیٰ ہوجاتے ہیں جس کا ذریعہ نماز بنتی ہے، لیکن بلاواسطہ بھی نماز میں تمام روحانی اور اخلاقی مقامات موجود ہیں جو نمازی انسان میں راسخ ہوجاتے ہیں، آدمی بلند پایہ ہوجاتا ہے۔ شکر کو لو تو نماز کی روح ہی الحمد ہے، صبر کو لو تو آدمی نماز میں ہر ایک لذت سے صبر کر بیٹھتا ہے کہ نماز کا روزہ دن بھر کے روزے سے زیادہ مکمل ہے، اخلاص کو لو تو نماز کی روح ہی "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" ① ہے جس کی حقیقت ماسوی اللہ سے کٹ کر اللہ کی طرف دوڑنا ہے۔

① پارہ: ۱، سورۃ الفاتحہ، الآیۃ: ۱۔

تواضع کو لو تو جہاں ذلت نفس سامنے ہے وہاں تواضع کی کیا حقیقت ہے، "رِضَا بِالْقَضَاء" کو لو تو نفس اپنی ہر لذت نماز میں دے بیٹھتا اور اس سے صبر کر لیتا ہے۔ شجاعت کو لو تو اس میں سخت ترین مقابلہ اپنے نفس اور ہوائے نفس سے ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ دوسرے سے لڑنا سہل ہے مگر اپنے سے لڑنا مشکل ہے۔

مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق

نزاع کا خاتمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

اجماعی مسلک......اما بعد! برزخ میں انبیاء علیہم السلام کی حیات کا مسئلہ مشہور ومعروف اور جمہور علماء کا اجماعی مسئلہ ہے۔ علماء دیو بند حسب عقیدہ اہل سنّت والجماعت برزخ میں انبیاء کرام کی حیات کے اس تفصیل سے قائل ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام وفات کے بعد اپنی اپنی پاک قبروں میں حیات جسمانی کے ساتھ زندہ ہیں۔ اوران کے اجسام کے ساتھ ان کی ارواح مبارکہ کا ویسا ہی تعلق قائم ہے جیسا کہ دنیوی زندگی میں قائم تھا۔ وہ عبادت میں مشغول ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، انہیں رزق دیا جاتا ہے اور وہ قبور مبارکہ پر حاضر ہونے والوں کا صلوٰۃ وسلام بھی سنتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

علماء دیو بند نے یہ عقیدہ کتاب وسنّت سے پایا ہے اور اس بارے میں ان کے سوچنے کا طرز بھی متوارث ہی رہا ہے۔ حتی کہ بریلوی حلقوں سے ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ برزخ میں حیات انبیاء کرام علیہم السلام کے منکر ہیں اور اس افتراء سے علماء حرمین شریفین کو ان کی طرف سے بدظن بنا کر اور دھوکہ دے کر ان کے خلاف فتویٰ بھی حاصل کرلیا گیا۔ لیکن جب علماء حرمین پر اس دھوکہ دہی کی حقیقت کھلی اور انہوں نے اس قسم کے تمام مسائل کے بارے میں از خود ایک مفصّل استفتاء مرتب کر کے علماء دیو بند سے جواب مانگا جس میں حیات انبیاء کا سوال بھی شامل تھا۔

تو حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہانپوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مفصل جوابی فتویٰ بنام ''اَلْمُهَنَّدُ عَلَى الْمُفَنَّدُ'' مرتب فرما کر علماء حرمین کے پاس ارسال فرمایا۔ جس میں مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حیات انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں بھی علماء دیو بند کا نقطہ نظر غیر مشتبہ اور واضح الفاظ میں تحریر فرمایا۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور برزخ میں ان کی یہ حیات، حیات دنیوی ہے۔ نیز اسی ذیل میں اس نقطۂ نظر کو مزید واضح اور مضبوط تر کرنے کے لئے انہوں نے بانی دارالعلوم دیو بند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے رسالہ'' آب حیات'' کا بھی حوالہ دیا جو اس موضوع پر ایک مستقل اور پُر از حقائق ومعارف کتاب ہے جس کا مقصد اس مسئلہ کی ایک مستحکم تائید کے علاوہ یہ بھی تھا کہ علماء دیو بند کا یہ عقیدہ (حیات انبیاء) انہیں ان کے اسلاف سے بطور توارث کے ملا ہے۔ کوئی انفرادی رائے یا وقتی اور

ہنگامی فتویٰ نہیں ہے جو حوادث کے پیش آنے سے اتفاقاً سامنے آ گیا ہو۔

مفاہمت کی بنیاد...... پھر اس مسئلہ اور اس کے بارے میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ کے حوالہ کی تائید میں اس وقت کے تمام اکابر علماء دیوبند کے توثیقی دستخط بھی اس میں ثبت کرائے۔ جس سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ مسئلہ حیات انبیاء کے بارے میں یہ مذکورہ عقیدہ صرف ان کے سلف ہی کا نہیں بلکہ خلف بھی اس کے اسی طرح قائل ہیں جس طرح سلف قائل تھے اور اسی طرح یہ مسئلہ (اثبات حیات انبیاء) بطرز مذکور سلف سے لے کر خلف تک یکسانی کے ساتھ مسلمہ اور متفق علیہ رہا ہے اور تمام علماء دیوبند کا یہ اجماعی مسلک ہے جس سے کوئی فرد منحرف نہیں ہے۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ بعض علماء دیوبند یا متقدمین میں سے بعض حضرات کی عبارتیں اس بارے میں کچھ مبہم یا موہوم ہوں۔ سو اگر اس مسئلہ میں ان کی کچھ صاف اور واضح عبارتیں بھی پائی جاتی ہوں تو ان کے مبہمات یا مجملات کو واضح عبارتوں کے تابع کر کے مبہمات کی تفسیر کی جا سکتی ہے، لیکن اگر صرف مجملات ہی ہوں جن سے مسئلہ کے دونوں پہلو نکل سکتے ہوں یا واضح ہوں مگر مخالف پہلو صاف اور نمایاں ہو جس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو تو پھر اپنے مفہوم کو سامنے رکھ کر مخالف پہلو اختیار کرنے والوں پر ایسی نکیر کی گنجائش نہ ہوگی۔ جو مخالف پہلو کے ناممکن ہونے کی صورت میں کی جا سکتی تھی۔ کیوں کہ اس صورت میں یہ تفصیلاتی یا کیفیاتی اختلاف ایک علمی اور نظری اختلاف ہوگا جسے مسلکی اختلافات سے تعبیر نہیں کیا جا سکے گا۔ جس کے معنی یہ ہوں گے کہ مسئلہ کی تفصیلات میں ایسے اختلاف کی گنجائش ہے جو علماء میں ہر وقت ہو سکتا ہے۔

البتہ عوام سے ایسے اختلافات کا کوئی تعلق نہیں ہوتا وہ صرف نفس مسئلہ اور اس کی قدر مشترک کے مکلف ٹھہرائے جاتے ہیں جو مسلک کی بنیاد ہوتا ہے۔ اسی لئے مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں زیر نظر مصالحت اور مفاہمت باہمی کی بنیاد تفاصیل مسئلہ کے اختلافی پہلوؤں سے الگ رہ کر نفس مسئلہ کی قدر مشترک پر رکھی گئی جو فریقین کے نزدیک قابل قبول ہوگی جیسا کہ آئندہ مفاہمت کی عبارت کے متن سے واضح ہوگا۔

اجتماعی نقصان...... بخت و اتفاق سے وقت کے بعض فضلاء دیوبند نے اس مسئلہ کی تفصیلات میں کچھ اس قسم کا اختلاف فرمایا جس کا منشی متقدمین کی ایسی ہی عبارتیں یا نصوص کے مدلولات کی اسی قسم کی تعبیرات ہیں۔ جن کے ہوتے ہوئے اختلاف رائے کی گنجائش کلیۃً مسلوب نہیں سمجھی جا سکتی، جس کا ظہور تین چار سال سے ہوا۔ یہ اختلاف رائے مضر، لیکن سوئے اتفاق سے یہ اختلاف اسٹیج پر آ گیا اور اس میں رد و قدح کی صورتیں پیدا ہونے لگیں۔ عوام کو بھی اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور آخر کار اس مسئلہ کی بحث علماء سے گذر کر عوام میں ان کے رنگ سے پھیل گئی جس سے قدرۃً اس اختلاف نے نزاع و جدال کی باہمی صورت اختیار کر لی۔ گروپ بندی شروع ہو گئی اور یہ بحث آخر کار ایک جماعتی فتنہ کی صورت میں آ گئی جس سے مسئلہ تو ایک طرف رہ گیا اور فساد آگے آ گیا، اور خود جماعت دیوبند میں تفریق و تفرق اور تخریب کے آثار نمایاں ہونے لگے، جانبین سے رسالے لکھے گئے، اخباری

بحثیں چھڑ گئیں، جس سے جماعت کی اجتماعی قوت کو نقصان پہنچ گیا۔

مساعی طیبہ...... یہ صورت حال دیکھ کر اور اخبارات و رسائل سے ان مناقشات کی خبریں معلوم کر کے دل زخمی ہوتا رہا، اور جوں جوں یہ فتنہ بڑھتا گیا دوں دوں دل کا غم بھی ترقی کرتا گیا۔ دلی آرزو تھی کہ کسی طرح فتنہ نزاع و جدال کی یہ صورت ختم ہو جائے۔ حسن اتفاق سے ۲۶ اپریل ۱۹۶۲ کو احقر کو پاکستان حاضر ہونے کا اتفاق ہوا اور اسی ماہ میں بزمانہ قیام لاہور، جناب محترم مولانا غلام اللہ خان صاحب اور محترم مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری احقر سے ملاقات کے لئے قیام گاہ پر تشریف لائے، دوران ملاقات احقر نے اس نزاع وجدال کا شکوہ کرتے ہوئے اس صورت حال کے مضر اثرات کی طرف توجہ دلائی، اور عرض کیا کہ یہ صورت بہر نہج ختم ہونی چاہئے جبکہ یہ مسئلہ کوئی اساسی مسئلہ نہیں ہے کہ اسے ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے اسٹیج پر لایا جائے، اور اس کی وجہ سے تفریق و تفرق و تخریب کے ان مضر اثرات کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ یہ مسئلہ یا تو اسٹیج پر آئے ہی نہیں یا اگر اتفاقاً آ جائے تو اس کا عنوان نزاعی نہ رہے۔

اس پر ان دونوں بزرگوں نے نہایت مخلصانہ اور دردانگیز لہجہ میں کہا کہ ہم خود بھی اس صورت حال سے دل گرفتہ ہیں اور دلی تنگی محسوس کرتے ہیں، کاش آپ (احقر) ہی درمیان میں پڑ کر اس نزاع کو ختم کرا دیں۔

اور ہم سمجھتے ہیں کہ آپ کے سوا یہ قصہ کسی دوسرے کے بس کا ہے بھی نہیں۔ اس بارہ میں آپ کی اب تک کی تحریرات نہایت معقول انداز سے سامنے آئی ہیں جن کو دونوں فریقوں نے احترام کی نگاہ سے دیکھا ہے، اب بھی اس بارے میں آپ کی مساعی احترام و قبول کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

احقر کو ان مخلصانہ جملوں سے نزاع کے ختم ہونے کی کافی توقع پیدا ہوگئی اور ارادہ کر لیا گیا کہ فریقین کے ذمہ دار حضرات سے مل کر کوئی مفاہمت کی صورت پیدا کی جائے۔ چناں چہ جواب میں یہی عرض کیا گیا کہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب دام مجدہ، شیخ الحدیث مدرسہ خیر المدارس ملتان سے مل کر اس سلسلے میں کوئی رائے قائم کروں گا۔

کراچی پہنچ کر احقر نے اس سلسلے میں مولانا غلام اللہ خان صاحب سے مراسلت شروع کی تاکہ معاملہ کے ابتدائی مبادی طے ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ کسی دینی مسئلہ میں مفاہمت کے معنی خلاف دیانت رائے تبدیل کر دینے یا مسئلہ کو کم و بیش کر کے کسی اجتماعی نقطہ پر آ جانے کے تو ہو ہی نہیں سکتے۔ اس لئے طریق مفاہمت اور فریقین کے لئے نقطہ اجتماع ذہن میں یہ آیا کہ اولاً یہ مسئلہ عوام میں لایا ہی نہ جائے اور اگر بیان مسئلہ کی نوبت آئے تو اس کا قدر مشترک پیش کر کے اس کی تفصیلات اور اختلافی خصوصیات پر زور نہ دیا جائے بلکہ عوام کو ان کی گہری خصوصیات میں پڑنے سے روکا جائے تو کم از کم عوام میں سے یہ نزاعی صورتیں ختم ہو جائیں گی، جو مضر ثابت ہو رہی ہیں، پھر اگر علماء کی حد تک تفصیلات میں کچھ اختلاف باقی بھی رہ جائے جس کا عوام سے کوئی تعلق نہ ہو تو گروپ بندی کے مضر اثرات ختم ہو جائیں گے جو فتنہ کی اصل بنے ہوئے ہیں۔

اس لئے احقر نے اپنی محدود معلومات کی حد تک اس مسئلہ کے قدرِ مشترک کا ایک عنوان تجویز کر کے مولانا ممدوح کو لکھا کہ وہ اس بارے میں اپنی رائے ظاہر فرمائیں تاکہ دوسرے حضرات کی رائے بھی حاصل کی جاسکے۔

اس عریضہ کا جواب مجھے ملتان پہنچ کر مدرسہ خیر المدارس میں ملا۔ جس میں مولانا غلام اللہ خان صاحب نے احقر کے عنوان کو رد کئے بغیر خود بھی ایک عنوان لکھ کر بھیجا۔ اس موقع پر حضرت مولانا خیر محمد صاحب مولانا محمد علی صاحب جالندھری اور دوسرے معتمد علماء جمع تھے، جن کے سامنے احقر نے اپنا منصوبہ اور یہ دونوں عنوان علیحدہ علیحدہ رکھ کر گفتگو کی۔ طے یہ پایا کہ قیامِ ملتان کی قلیل مدت اس مسئلے کے لئے کافی نہیں ہے اور بعض ضروری افراد بھی یہاں موجود نہیں۔ اس لئے اس مسئلہ پر گفتگو جہلم کے قیام میں رکھی جائے اور وہاں ایک مستقل دن اس کام کے لئے فارغ رکھا جائے اور ساتھ ہی احقر نے ملتان ہی سے اپنی تقریروں میں اس منصوبہ کے لئے فضا ہموار کرنی شروع کر دی۔

ملتان، جہلم، سرگودھا اور راولپنڈی میں خصوصیت کے ساتھ اس بارہ میں اصلاحی عنوانات اختیار کئے گئے۔ احقر نے اس سلسلے میں حضرت مولانا خیر محمد صاحب مدظلہ، حضرت مولانا محمد شفیع صاحب سرگودھوی اور مولانا محمد علی صاحب جالندھری سے جہلم تشریف لے چلنے کے لئے عرض کیا۔ جس کو ان حضرات نے بخوشی منظور فرمالیا، مقررہ تاریخ پر یہ سب حضرات جہلم میں جمع ہو گئے اور مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قدرِ مشترک زیرِ غور آیا، طے یہ پایا کہ قدرِ مشترک کم از کم اتنی تفصیل ضرور لئے ہوئے ہونا چاہئے، جس سے مسئلہ کے تمام بنیادی گوشوں پر روشنی پڑ سکے اور عوام بطورِ عقیدہ کے اسے سمجھ سکیں۔

چنانچہ گفتگو کے بعد ایک جامع تعبیر احقر نے قلمبند کی اور ارادہ کیا گیا کہ راولپنڈی میں ان حضرات ممدوحین کی موجودگی میں دوسری جانب کے ذمہ دار حضرات مولانا غلام اللہ خان صاحب، مولانا قاضی نور محمد صاحب، مولانا قاضی شمس الدین اور مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری کو جمع کر کے اس منصوبہ اور مجوزہ عنوان پر گفتگو کی جائے۔

قدرِ مشترک...... چنانچہ ۲۲ جون ۱۹۶۲ء یوم جمعہ دونوں جانب کے یہ سب بزرگ احقر کی قیام گاہ (مدرسہ حنفیہ عثمانیہ) میں جمع ہو گئے، اس مجلس میں احقر نے اس معاملہ کی اول سے آخر تک ساری روداد بیان کر کے مسئلہ کا دو صفحہ قدرِ مشترک دونوں جانب کے ان ذمہ دار حضرات کے سامنے رکھا۔ گفتگو نہایت دوستانہ اور مخلصانہ ماحول میں ہوئی اور ختمِ مجلس تک الحمد للہ یہی ماحول قائم رہا، نہ اس میں ہار جیت کے جذبات تھے نہ غلبہ و مغلوبیت کے تصورات تھے بلکہ مسئلہ کو سلجھانے اور نمٹانے کے جذبات نمایاں تھے اور آخری نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں حلقوں نے احقر کی پیش کردہ قدرِ مشترک کے عنوان کو قبول کر لیا۔ اور اس قدرِ مشترک تحریری یادداشت پر جو احقر نے اپنے دستخط سے پیش کی، فریقین نے دستخط فرمائے اس یادداشت کا متن بلفظہٖ حسب ذیل ہے:

''عامۂ مسلمین کو فتنۂ نزاع وجدال سے بچانے کے لیے مناسب ہوگا کہ مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے کے ہر دو فریق کے ذمہ دار حضرات عبارت ذیل پر دستخط فرمائیں۔ یہ (عنوان) مسئلہ کا قدرِ مشترک ہوگا،

ضرورت پڑنے پر اسی کو عوام کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، تفصیلات پر زور نہ دیا جائے، عبارت حسب ذیل ہے:
وفات کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر کو برزخ (قبر شریف) میں بہ تعلق روح حیات حاصل ہے اور اس حیات کی وجہ سے روضہ اقدس پر حاضر ہونے والوں کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم صلوۃ وسلام سنتے ہیں"۔

احقر: محمد طیب

وارد حال راولپنڈی ۲۲ جون ۱۹۶۲ء

(مولانا قاضی) نور محمد خطیب جامع مسجد قلعہ دیدار سنگھ

لاشئ (مولانا) غلام اللہ خان..... (مولانا) محمد علی جالندھری

اس مختصر عبارت کی کافی تفصیل چوں کہ قاضی شمس الدین صاحب (برادر مولانا قاضی نور محمد صاحب اپنے مکتوب میں لکھ کر مولانا محمد علی جالندھری صاحب کے پاس بھیج چکے تھے۔ اس لئے یہ عبارت بالا ان کی مسلمہ ہے، بنا بریں اس عبارت پر ان کے دستخط کرانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، عبارت بالا کو ان کا مسلمہ سمجھا جائے۔

حق گوئی اور انصاف پسندی..... چوں کہ اس موقع پر مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری بوجہ علالت راولپنڈی تشریف نہ لا سکے اس لئے احقر کے عرض کرنے پر اور مسودہ پیش کرنے پر حضرت مولانا قاضی نور محمد صاحب اور مولانا غلام اللہ صاحب نے ان کے بارے میں حسب ذیل تحریر دستخط کر کے بندہ کو عنایت فرمائی جس کا متن بلفظہ حسب ذیل ہے:

"ہم (مولانا قاضی نور محمد صاحب اور مولانا غلام اللہ خان صاحب) اس کی پوری کوشش کریں گے کہ سید عنایت اللہ شاہ صاحب سے بھی اس تحریر (مندرجہ بالا) پر دستخط کرائیں جس پر ہم نے دستخط کئے ہیں۔ اگر ممدوح اس پر دستخط نہ کریں گے تو ہم مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس تحریر کی حد تک ان پر برأت کا اعلان کر دیں گے، نیز اپنے جلسوں میں ان سے مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر تقریر نہ کرائیں گے اور اگر اس مسئلہ میں وہ کوئی مناظرہ وغیرہ کریں گے تو ہم اس بارے میں ان کو مدد نہ دیں گے"۔ نور محمد خطیب قلعہ دیدار سنگھ لاشئ غلام اللہ خان (۲۲ جون ۱۹۶۲ء) اس تحریر پر ہر دو دستخط کنندہ بزرگوں کی حق پسندی اور حق گوئی ظاہر ہے۔ باوجود یہ کہ سید عنایت اللہ شاہ صاحب سے ان بزرگوں کے قوی ترین تعلقات اور مخلصانہ روابط ہیں مگر اس بارے میں انہوں نے کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا جس سے ان کی انصاف پسندی اور دین کے بارے میں انہوں نے کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا جس سے ان کی انصاف پسندی اور دین کے بارے میں بے لوثی نمایاں ہے۔

سکوت مصلحت..... تاہم سید صاحب ممدوح کے بارے میں مجھے اپنی معلومات کی حد تک یہ عرض کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ وہ برزخ میں انبیاء کی حیات جسمانی کے کلیۃً منکر نہیں ہیں۔ صرف اس کی کیفیت اور نوعیت میں کلام کرتے ہیں ایسے ہی وہ حاضرین قبر شریف کے درود وسلام کے حضور کے سمع مبارک تک پہنچنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سننے کا بھی علی الاطلاق انکار نہیں کرتے بلکہ اس کے دوام اور ہمہ وقتی ہونے کے قائل

نہیں۔ ان کا یہ ناتمام اقرار چونکہ ان کی مفہومہ حجت سے ہے اس لئے انہیں اس بارے میں منکر نہیں کہا جائے گا بلکہ مئوول سمجھا جائے گا۔ گو ان کی یہ تاویل بمقابلہ جمہور، اس ناچیز اور ہر دو دستخط کنندہ بزرگان ممدوحین بالا کے نزدیک قابل تسلیم نہیں لیکن مذکورہ صورت حال کے ہوتے ہوئے جبکہ ان کا یہ اختلاف حجت سے ہے۔ ان پر زبان طعن وملامت کھولنا یا تشنیع کرنا کسی طرح قرین انصاف وصواب نہیں۔ بالخصوص جبکہ وہ دوسرے مسائل میں بحیثیت مجموعی اہل دیوبند اور اہل السنت والجماعت کے حامی اور خادم بھی ہیں، اس لئے انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر سکوت اختیار کرلیا جانا ہی قریب مصلحت اور جانبین کے لئے مفید ثابت ہوگا۔ ساتھ ہی مجھے اپنے محترم صدر سید صاحب ممدوح سے بھی پوری توقع ہے اور امید رکھنی چاہئے کہ مسئلہ حیات کی ان تفصیلات میں جمہور اہل السنت والجماعت کے مسلک کا احترام قائم رکھنے کے لئے اپنے کسی خصوصی مفہوم کو (خواہ وہ ان کی دانست میں مفہوم اہل السنت والجماعت ہی ہو مگر جمہور علماء کے نزدیک وہ ان کا خصوصی مفہوم شمار کیا جارہا ہے اور خواہ وہ کتنی بھی دیانت پر مبنی ہو) ضروری الاشاعت نہ سمجھتے ہوئے سکوت کو کلام پر ترجیح دیں گے یہ مسئلہ کوئی ایسا اساسی اور بنیادی عقائد کا نہیں ہے کہ اس میں سکوت روا نہ رکھا جائے۔

فروعی اختلاف کی حیثیت...... اس طرح عام مسلمانوں کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ مسائل اور ان میں علماء کے جزوی (معمولی) اختلافات کو مناقشات اور جدال ونزاع (لڑائی جھگڑے) کا ذریعہ نہ بنائیں۔ اس قسم کے اختلافات امت کے لئے آسانیوں کا ذریعہ بنائے گئے ہیں نہ کہ نزاعات اور مناقشات کا۔ اس لئے عملاً واعتقاداً جمہور سلف وخلف کا دامن تھام کر دوسری جانبوں سے مصالحت اختیار کریں اور لڑنے اور لڑانے کی خو پیدا نہ کریں۔

آج امت کے بہت سے اہم اور بنیادی مسائل ہیں جو ان کی ہیئت اجتماعی کی متقاضی ہیں اور یہ ہیئت جب ہی برقرار رہ سکتی ہے کہ اسے اس قسم کے فروعی اختلافات میں بصورت گروہ بندی ضائع نہ کیا جائے۔

خوشی کی لہر...... آخر میں دونوں جانب کے بزرگوں اور بالخصوص فریقین کے نامبردہ اکابر کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کی گذارشات کو پوری توجہ اور التفات خاطر اور سمع قبول کے ساتھ سنا اور ملت کو بہت سے مفاسد اور مہالک سے بچالیا۔

"فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ عَنِّيْ وَعَنْ جَمِيْعِ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرَ الْجَزَآءِ."

اس نئی اصلاحی صورت کا سب سے زیادہ شاندار مظاہرہ راولپنڈی کے اس عظیم الشان جلسہ عام میں ہوا جو احقر کی تقریر کے سلسلے میں مدرسہ حنفیہ عثمانیہ کے زیر اہتمام ایک بڑے میدان میں زیر صدارت حضرت مولانا خیر محمد صاحب شیخ الحدیث مدرسہ خیر المدارس ملتان، منعقد کیا گیا تھا۔

احقر کو منظوم سپاس نامہ دینے سے جلسہ کا آغاز ہوا اور احقر کی تقریر شروع ہوئی جو تقریباً ڈھائی گھنٹے جاری رہی۔ تقریر کے آخر میں احقر نے عوام کو مخاطب کرتے ہوئے اس نزاع کے ختم ہونے کی بشارت تفصیل سے سنائی

جس سے عوام میں خوشی کی اک بے پناہ لہر دوڑ گئی اور ان ہزار ہا انسانوں کے ہجوم نے بے تحاشا تبریک و تہنیت کے نعرے لگانے شروع کر دیئے جس سے فضا گونج اٹھی۔

اعتراف شخصیت...... ختم تقریر پر ایک جانب سے مولانا غلام اللہ خان صاحب نے اور دوسری جانب سے مولانا محمد علی صاحب جالندھری نے اپنی تقریروں سے اس بیان کی توثیق کی اور نہایت فراخدلانہ اور مخلصانہ لب ولہجہ سے فرمایا، کہ ہم نے مہتمم دار العلوم کے درمیان میں پڑ جانے سے اس مسئلہ کی نزاعی صورت حال کو ختم کر دیا ہے اور جو چیز ہمیں ناممکن نظر آ رہی تھی وہ اس شخصیت (احقر ناکارہ) کے درمیان میں آ جانے سے نہ صرف ممکن ہی بن گئی بلکہ واقعہ ہو کر سامنے آ گئی۔ اور ہم کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس مہم کو مہتمم دار العلوم ہی کی شخصیت انجام دے سکتی تھی جس میں ایک طرف دار العلوم دیوبند جیسے علمی و مذہبی مرکز کی سرابراہی کی نسبت موجود ہے جو ہم سب کا مرکز قلوب ہے اور دوسری طرف بانی دار العلوم دیوبند حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ کی دو تامی نسبت موجود ہے جو پوری قاسمی برادری کو اس پر متحد کئے ہوئے ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے سوا دوسرے سے یہ مہم انجام نہیں پا سکتی تھی۔

جذبات مسرت...... بہر حال ہم نے اس نزاع کو ختم کر دیا ہے اور ہم اس بارے میں عوام کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ ان دو تقریروں کے بعد ہزاروں آدمیوں کا عظیم اجتماع جذبات مسرت سے ابل پڑا اور اس نے "مہتمم دار العلوم زندہ باد" "دار العلوم دیوبند زندہ باد" اور "علماء دیوبند زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگانے شروع کئے۔ کئی منٹ تک فضا نعروں سے گونجتی رہی اور مجمع میں جذبات مسرت کی ایک عجیب حرکت تھی، جس سے مجمع متموج دریا کی طرح متحرک نظر آ رہا تھا اور نعروں میں تقریریں بند ہو گئیں۔ بالآخر جلسہ شاندار کامیابی کے ساتھ ختم ہوا اور جو تحریک احقر کے قدم سے کراچی سے شروع ہوئی تھی وہ ملتان، سرگودھا اور جہلم میں اپنے مختلف مراحل سے گذرتی ہوئی راولپنڈی میں حد اتم تک پہنچ گئی۔ خدائے برتر و توانا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ چار سال کی مکدر فضا صاف ہوئی اور اس کے المناک آثار رو بہ زوال نظر آنے لگے۔ ("وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا۔")

حق تعالیٰ اس یکجہتی کو پائیدار اور برقرار رکھے اور مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ دین ملت کے اہم کاموں کو جزئیات فرعیہ کے مقابلے میں اہم سمجھتے ہوئے اپنی جماعتی قوتوں کو ان پر لگائیں۔

احقر: محمد طیب غفرلہ

(۱۹۶۲/۶/۲۴ء) مولانا مدنی قدس سرہٗ

آج تو قاسم و امداد سب ہی مرتے ہیں اس کا کیا ذکر برباد ہوئے تم یا ہم

آہ! صد آہ! کل تک جنہیں ہم مولانا مدنی مدظلہ کہا کرتے تھے، آج مولانا مدنی قدس سرہٗ کہہ رہے ہیں مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ۸۱ سال کی عمر میں دار دنیا سے دار آخرت کی طرف رحلت فرمائی اور

وابستگان کو غم واندوہ میں تڑپتا ہوا چھوڑ کر اپنے مقام کریم میں جا داخل ہوئے۔

حضرت شیخ ایشیاء کی سب سے بڑی جامعہ (دارالعلوم دیوبند) کے شیخ اکبر، جمعیت علماء ہند کے صدر، جماعت دیوبند کے عظیم روحانی رہنما اور جماعت دیوبند کی صد سالہ تاریخ کی اس صدی میں آخری کڑی تھے۔ ۱۸۵۷ء میں دارالعلوم دیوبند کے قیام سے جس تعلیمی، دینی، روحانی اور اجتماعی تحریک کا آغاز ہوا تھا اس کے کئی انقلابوں اور دوروں کی تکمیل مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات پر ہو کر اس ۱۸۵۷ء ہی پر انتہا ہوگئی۔ اور ۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک سو برس کے عرصہ میں اس تحریک کا ایک دور مکمل ہو کر ختم ہوگیا۔

کمال جامعیت...... حضرت ممدوح کی وفات اس صدی کا سب سے بڑا سانحہ اور ایک عظیم علمی نقصان جس کی تلافی بظاہر اسباب مشکل ہے۔ جامع ہستیاں دیر سے بنتی ہیں اور اٹھ جاتی ہیں تو ان کی جگہ لمبی مدت تک خالی پڑی رہتی ہے۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت ممدوح کی ہستی نادر روزگار ہستی، عزم وثبات، ہمت مردانہ، اٹل ارادہ، علم وبصیرت اور ایمانی فراست کا ایک متحرک پیکر تھی۔ آپ نے آج کے لادینی مادی دور میں جن دینی، اخلاقی اور علمی اصولوں کا دائرہ خواص وعوام کے لئے وسیع کیا اور انسانیت کی جن قدروں کو اجاگر کیا دنیا ان پر ہمیشہ فخر کرے گی۔

شیخ الاسلام رحمتہ اللہ علیہ اسلامی علوم ومعارف اور ایشیائی فنون وآداب کے علمبردار تھے اور آپ کی ہمت ظاہری وباطنی سے ملک اور ملک سے باہر ہزاروں علماء اس علمی امانت کے امین بن گئے۔ جو اس مرکز علم وفن (دارالعلوم دیوبند) سے آپ کی بدولت نشر ہوتی رہی، آپ اپنے اساتذہ وشیوخ کے ابتداء ہی سے معتمد علیہ اور مرکز توجہ رہے اور بلا استثناء ان کے تمام اکابر وشیوخ انہیں اطمینان واعتماد اور امید بھری نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ اس لئے آپ مختلف ماہر فن اساتذہ وشیوخ کی علمی وعملی یادگار تھے۔ قرآن وحدیث، فقہ وتفسیر، ادب وخطابت، منطق وفلسفہ کی مہارت وحذاقت آپ کے قول وفعل سے نمایاں رہتی تھی۔ آپ کی اس جامعیت نے علمی دنیا کو جو فائدہ پہنچایا اس پر صدیوں کام ہوتا رہے گا اور دنیا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتی رہے گی۔ باطنی سلسلوں میں پر رسائی، پاکیزگی نفس، تقویٰ وطہارت، ضبط اوقات، تکمیل معمولات اور باوجود متفرق دینی وقومی مشاغل کے ان کی ہمہ وقت پابندی آپ کا ایک سہل ممتنع مشغلہ تھا۔

حب الوطنی آپ کے نزدیک ایک سیاسی نظریہ ہی نہیں بلکہ ایک علمی اور اخلاقی اور خود ان کے الفاظ میں ایک دینی جذبہ کی حیثیت سے آپ کا جوہر نفس تھی، اور دین کی یہ تعلیم کہ "ایک اچھا مسلمان ایک اچھا شہری بھی ہو" آپ کی ذات گرامی میں عملی صورت سے ہر وقت نمایاں رہتی تھی۔

ایک حسین امتزاج...... مادی دنیا سامان راحت بہم پہنچا سکتی ہے مگر انسانی ضمیر کو مطمئن نہیں کر سکتی، سائنس اچھے سامان پیدا کر سکتی ہے مگر اچھے انسان نہیں بنا سکتی، جب تک کہ ایمانی سائنس اس کی راہنما اور مربی نہ بنے۔

حضرت ممدوح کی ذات ان دونوں سامکوں کا ایک معتدل امتزاج تھی، آپ ایک وقت اگر دنیا کے مادی پلیٹ فارموں اور سیاسی اسٹیجوں کی جلوتوں میں نمایاں نظر آتے رہتے تھے تو دوسرے وقت ذکر اللہ کی خلوتوں، درس حدیث وقرآن کی مسندوں پر بھی جلوہ فرمارہتے تھے اور دونوں لائنوں میں بھرپور قوت کے ساتھ رواں دواں تھے۔ ایک شعبہ سے دوسرا شعبہ ان کی توجہ کی جامعیت کو پراگندہ نہیں کرسکتا تھا۔

دینی زندگی کے ساتھ قومی زندگی اور اسلامی زندگی کے ساتھ بین الاقوامی زندگی، اپنوں کی تربیت کے ساتھ دوسروں کی رعایت اور اپنوں سے احتساب کے ساتھ دوسروں کے لئے توسع ان کے کام کا نصب العین تھا۔ اسی لئے آپ نے درس وتدریس، باطنی تربیت اور روحانیت کے پاکیزہ مشاغل کے ساتھ قومی جدوجہد کے میدان کو بھی سرکرلیا اور عملاً ان دونوں اضداد کو جمع کرد کھلایا۔ اس جامعیت کے اصول کو آپ نے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا اور آپ کے ہزاروں شاگردوں نے جو ہندو بیرون ہند میں پھیلے ہوئے ہیں اس پر کام کیا۔ اسی لئے آپ کی مقبولیت ملک کے ہر طبقہ اور ہر قوم میں عام تھی، حتیٰ کہ جن حضرات کو آپ سے اختلاف رائے بھی تھا، ان کے قلوب بھی حضرت ممدوح کی عزت وعظمت سے بھرپور تھے اور وہ آپ کے کمالات ظاہر وباطن کے معترف رہے۔

شیخ العرب والعجم...... حضرت ممدوح کا فیضان نہ صرف ہندوستان کی چہار دیواری تک محدود رہا بلکہ عرب وعجم میں پھیلا۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند سے تحصیل علم سے فراغت پاکر حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں درس قرآن و حدیث اور تدریس علوم فنون کا آغاز فرمایا اور اٹھارہ برس اس سرچشمہ علوم نبوت میں بیٹھ کر علوم نبوت کی خدمت کی، جس سے عرب وعجم کے لوگ سیراب ہوئے۔ اور آپ کے تلامذہ ایشیائے کوچک سے لے کر یورپین ٹرکی تک پہنچے، آخر کار عمر کے آخری حصہ میں ۳۲ برس کامل دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس پر فائز رہ کر مشرق ومغرب کے لوگوں کو علوم کے آب حیات سے سیراب فرمایا۔

سیاسی نقطۂ نظر...... ان دینی سلسلوں کے ساتھ حضرت محترم ایک عظیم سیاسی رہنما اور ایک زبردست انقلابی مجاہد تھے، جنہوں نے عدم تشدد کے اصول پر ہندوستان میں انقلاب لانے کی سرگرمیوں میں قائدانہ حصہ لیا۔ آپ اس سلسلہ میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند کے تاریخی، سیاسی فلسفہ و حکمت کے امین اور اپنے استاذ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کے حکیمانہ جوش عمل کے علمبردار تھے، جس سے آپ کو پوری قوم نے جانشین شیخ الہند تسلیم کیا اور اور آخر کار جانشین شیخ الہند ہی کے لقب میں یاد کئے جانے لگے۔ آپ کا نظریہ تھا کہ علم کا نتیجہ رہبانیت نہیں بلکہ علم کو سیاست کے میدان میں راہنما ہونا چاہئے۔ اس سے اسلام کا مذہب کی حیثیت سے اور مسلمانوں کا ملت کی حیثیت سے وقار قائم رہ سکتا ہے۔

نیز یہ کہ ہندوستانی مسلمان اپنی ملی حیثیت کے تحفظ کے ساتھ ہندوستانی قومیت کا ایک اہم عنصر ہیں۔ اس مرکب نظریہ کے ساتھ ملک کی آزادی انہیں ہر عزیز چیز سے بڑھ کر عزیز تھی۔ جس کے لئے انہوں نے اپنی ہر

محبوب چیز کی قربانیاں پیش کیں۔ یہ آزادی نہ صرف ملک کی آزادی کی حد تک انہیں عزیز تھی بلکہ اس لئے بھی کہ ہندوستان کی آزادی کو وہ ایشیا اور مشرق کی کتنی ہی پسماندہ اور کمزور ملکوں اور قوموں کی آزادی کا پیش خیمہ اور دروازہ جانتے تھے جس میں داخل ہوئے بغیر ایشیاء کا قصر آزادی میں داخلہ ناممکن تھا۔

چنانچہ ہندوستان کے آزاد ہو جانے پر ایشیاء بلکہ مشرق کے کتنے ہی چھوٹے بڑے ملک یکے بعد دیگرے آزادی کی دولت سے مالا مال ہو گئے۔ پھر اس ترقی آزادی کی وہ روح جوان کی روح میں پیوست تھی، صرف ملکی آزادی نہ تھی بلکہ یہ تھی کہ دنیا سے مغربی ممالک کا تسلط و اقتدار ختم ہوئے بغیر دنیا میں پھیلی ہوئی اخلاقی انارکی، لامذہبیت، دہریت، الحاد، بے دینی اور بے قیدی جس نے مشرق کے روحانی چمنستان کو اجاڑ اور اخلاقی تعمیروں کو ویرانہ بنا رکھا ہے کبھی نہیں مٹ سکتی اور اس فاسد مادہ کے استیصال کے بغیر دنیا کی حقیقی تدرستی اور اس کا اصل سکھ اور چین کبھی واپس نہیں آ سکتا۔ انہیں یقیناً یہ احساس تھا کہ اس عمومی تنقیہ اور مسہل میں اجزائے فاسدہ کے ساتھ اجزائے اصلیہ پر بھی زد پڑے گی۔ لیکن یہ تنقیہ کا ایک طبعی تقاضا ہوگا۔ اگر تنقیہ ضروری ہے تو اس جزوی محرومی پر صبر بھی ضروری ہے۔

بہر حال ان کی آزادی کی جدوجہد سیاسی تھی اور اس کی روح اخلاقی، اسی لئے جہاں آزادی کی جنگ ان کے دست و بازو کا اثر تھی، وہیں اخلاق کی تعمیر سے قلوب کی تربیت اور فطرت الٰہیہ کی عطاء فرمودہ حدود و قیود کے دائروں میں انہیں محدود و مقید کرتے رہنے کی جدوجہد بھی ان کے عمل کا ایک مستقل محور تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مشرق و مغرب کے مزاج الگ الگ ہیں، لیکن قومی اقتدار کے غلبہ نے مشرق کے مزاج کو فاسد کر دیا ہے، اگر یہ بیماری رفع ہو گئی تو بعد چندے مشرق کے اصل مزاج کی صحت عود کر آئے گی۔ یہی وہ نظریہ تھا جس پر شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بزرگوں کی ظاہری و باطنی رہنمائی میں کام کیا اور علم و تحقیق کا ایک نیا باب کھولا۔

اس خالقیت و رنصب العین کے تحت انہوں نے ہر طرف سے نظر بند کر کے مغربی طاقتوں پر ایک زبردست وار کیا اور تیشہ چلا دیا۔ اس زور آزمائی اور کشاکش کا نتیجہ بہر حال اخلاقی قوتوں کی بیداری اور ایشیا و مشرق کے مزاج میں تبدیلی کی صورتوں میں رونما ہوا۔ کمزور ملک آزاد ہونے لگے اور حریت طلبی کا حوصلہ ان میں خاطر خواہ ابھر آیا۔ آج مغرب کی طاقتیں اگر کلیۃً نہیں ٹوٹیں، تو ان کو توڑنے والے اور اس نظریہ کو لے کر آگے چلنے والا ضرور پیدا ہو گئے ہیں۔

بہر حال حضرت شیخ کی مساعی کا مرکز ملک کی آزادی، ایشیا کی آزادی اور آخر کار اخلاق و انسانیت کی آزادی تھی۔ یہ نظریہ ان کا عقیدہ تھا جو انہیں وراثت میں ان کے شیوخ سے ہاتھ آیا تھا کہ مغرب کی ان مادی طاقتوں کی برقراری کی صورت میں اخلاقی قوتیں اور انسانیت کی جوہری قدریں کبھی نہیں ابھر سکتیں۔

مرکب نصب العین ...... اسی لئے وہ ایک طرف اگر کانگریس کے سرگرم ممبر تھے تو دوسری طرف جمعیت علماء ہند کے صدر بھی تھے۔ اور اگر وہ کانگریس کے خاص سیاسی پلیٹ فارم پر ایک سرگرم سپاہی کی حیثیت سے کام کرتے تھے تو جمعیت علماء کے پلیٹ فارم پر ایک سرگرم دینی قائد کی حیثیت سے رونما تھے اور جہاں یہ دو پلیٹ فارم ان کی

سرگرمیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے وہیں دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس پر بیٹھ کر شرعی علوم اور کتاب وسنت کی ترویج میں بھی اسی درجہ منہمک تھے اور اسی کے ساتھ اپنی خانقاہ کے صدر نشین بھی تھے جس میں متوسلین کی علمی اور اخلاقی اصلاح وتربیت اور انہیں صحیح معنوں میں مسلم قانت بنانا ان کا نصب العین تھا۔

کوری سیاست کے لئے کانگریس کا پلیٹ فارم کافی تھا اور خالص دیانت کے لئے مدرسہ وخانقاہ کی چہار دیواری بس کرتی تھی، لیکن ان سب کو بیک وقت جوڑ رکھنے کا مطلب اس کے سوا دوسرا نہیں تھا کہ ان کا نصب العین مرکب تھا جس کی سطح سیاسی اور ماہیت اخلاقی تھی۔ اس مجموعہ کو سامنے رکھ کر جس نے بھی ان کی بابت رائے قائم کی وہ رائے صحیح اور واقعاتی رائے ثابت ہوئی۔

مینارۂ نور...... بہرحال حضرت شیخ اس دور الحاد وبے دینی میں روشنی کا ایک مینار تھے اور اگر بقول امیر امان اللہ خان سابق بادشاہ افغانستان "شیخ الہند مولانا محمود حسن ایک نور تھے تو شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اس نور کی ضیاء اور چمک تھے"

یہ نور ان سے منتشر ہو کر ان کے ماحول اور ملک میں پھیلا۔ ان کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں رحیم مادہ کی قوتیں کارفرما ہوتی تھیں۔ منکرات پر جلال کے ساتھ نکیر فرماتے تھے اور عجیب تر یہ کہ اس جوش وجلال کے باوجود نہ ان کی محبوبیت میں فرق آتا تھا نہ مطلوبیت میں۔ کہنے والے بلکہ ملامت کرنے والے اپنا کام کرتے تھے جو سطح کے پیش نظر ہوتا تھا اور وہ اپنا کام کرتے تھے جو حقیقت کے پیش نظر پوری قوت سے جاری رہتا تھا۔

۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کے نصف النہار کے قریب یہ جامع دولت ہم سے چھن گئی اور ۲ بجے کے قریب روح پر فتوح اس جسد خاکی کو چھوڑ کر رہ گرائے عالم جاوداں ہوگئی۔ "رَحِمَهُ اللّٰهُ رَحْمَةً وَّاسِعَةً"

زندگی بھی خوب گذری اور موت بھی پاکیزہ رہی۔ بعد مردن چہرہ پر نورانیت اور چمک غیر معمولی تھی۔ روشنی میں چہرہ کی چمک دمک اور اس کا جمال نگاہوں کو سیر نہیں ہونے دیتا تھا، لبوں پر ایک عجیب مسکراہٹ تھی جس کی کیفیت الفاظ میں نہیں آسکتی۔ جو یقیناً مقبولیت عنداللہ اور اس کے ساتھ موت کے وقت بشاشت وطمانیت کی کھلی علامت تھی۔ جو مقبولیت زندگی میں تھی وہی موت کے بعد بھی ہے، مزار ہر وقت زیارت گاہ بنا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ رات کو ایک ایک بجے بھی جانے والے گئے تو مزار پر لوگوں کو پایا۔

اسی محبوبیت کا نتیجہ ہے کہ وصال کی خبر آناً فاناً ہوا پر دوڑ گئی۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک نے ریڈیو پر وصال کی خبر نشر کی اور ہندو بیرون ہند سے تعزیتی فون، تار، اور خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ وصال کے بعد ایک بجے شب تک خدا ہی جانتا ہے کہ انسانوں کا ہجوم کہاں سے ٹوٹ پڑا کہ دارالعلوم کا وسیع احاطہ ہجوم سے ابل پڑا۔ ہجوم اور جنازہ پر کنٹرول دشوار ہوگیا، لوگ جس شخصیت کے اردگرد پروانہ وار جمع رہتے تھے اب اس کی ظاہری علامت پر پروانہ وار ٹوٹ پڑ رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ وابستگانِ حق اور محبوب القلوب ہستیاں زندگی اور موت دونوں ہی میں محبوب القلوب رہتی ہیں

اور دوسرے لفظوں میں اللہ والے حقیقتاً مرتے ہی نہیں، صدیاں گذر جانے پر بھی دلوں میں ان کی روح دوڑتی رہتی ہے اور ان کی محبوبیت بدستور قائم رہتی ہے۔ جس کی بنا وان کا پیکر یا جثہ نہیں ہوتا جو مٹ جاتا ہے، بلکہ ان کی معنویت ہوتی ہے جس کے لئے کبھی فنا نہیں، اس لئے موت اس پر اثر انداز نہیں ہوتی اور وہ مر کر بھی باقی ہی رہتے ہیں۔

معنوی معیت...... آج حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہم میں موجود نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ہم میں غیر موجود بھی نہیں جبکہ ان کا مشن موجود، ان کا نمونہ عمل موجود، ان کا علم موجود، ان کی مجاہدانہ کارنامے موجود اور ان کی محبوبیت موجود۔ اس لئے پسماندوں کے لئے جہاں حسی جدائی ایک مصیبت عظیمہ ہے۔ وہیں ان کی معنوی معیت وجہ سکون وقرار بھی ہے۔ اس لئے پسماندوں کے لئے باوجود صد ہزار غم کسی مایوسی کا موقع نہیں ہے، ان کی معنویت موجود، اس سے استفادہ اور اس کا افادہ رفیق راہ بن سکتا ہے۔ دل کی تسلی کے لئے سب سے بڑی چیز قرآن حکیم ہے جو زبانوں پر جاری ہو کر دلوں کے لئے وجہ قرار وتسلی ہوگا۔ اور ایصال ثواب کے ذریعے حضرت مرحوم کے لئے وجہ سرور وانبساط ہوگا۔ اس لئے صدمہ رسیدہ قلوب اپنے اور ان کے حق میں سکون وراحت کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

اس دنیا سے گذر جانے والا کتنی ہی بڑی شخصیت ہو پھر بھی اسے اپنے عزیزوں اور تعلق والوں سے آس بندھی رہتی ہے کہ کون اس کو دعا وایصال ثواب میں یاد رکھتا ہے، اس لئے غم غلط کرنے اور حضرت اقدس کی آس کو پورا کرنے کا طریقہ غم محض یا غم کو لے کر بیٹھ جانا نہیں ہوسکتا بلکہ غم کو غلط کر کے ان مقاصد کے لئے کمربستہ رہنا اور کام میں لگ جانا ہی ہوگا۔ حق تعالیٰ شانہ، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مراتب ودرجات بلند فرمائے اور اعلیٰ علیین میں انہیں مقام بلند عطا فرمائے اور وابستگان کو صبر جمیل، اجر جزیل اور ذوق تحصیل عطا فرمائے۔

یہ چند منتشر سطریں حضرت مدنی قدس سرہ العزیز کی مناقب سرائی کے لئے نہیں لکھی گئیں کہ ان سطروں میں ان کے مناقب کب آسکتے تھے، بلکہ محض غم اور دل کو ہلکا کرنے اور ساتھ ہی ایک مقدس ہستی کے ذکر اور یاد سے "اُذْکُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتَاکُمْ" کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے عرض کی گئی ہیں۔

امید ہے کہ ہندوستان کے دینی مدارس اور دینی اداروں میں ایصال ثواب کا اہتمام کیا جائے گا اور حضرت مرحوم کی اس آخری خدمت میں کسی قسم کا دریغ روا نہ رکھا جائے گا۔ (وَهُوَ الْبَاقِيْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ)

انٹرویو

قندیل راہنمائی......انسانی عظمت کی تعریف اور تعبیر میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔کوئی دولت مند آدمی کو بڑا مانتا ہے،کسی کے نزدیک سیاست دان اور ارباب اقتدار بڑے آدمی ہوتے ہیں۔تو کوئی بڑی بڑی علمی ڈگریاں اور فنی ڈپلومے حاصل کرنے والوں کو بڑا سمجھتا ہے۔غرضیکہ ہر شخص اپنی ذہنی استعداد کے مطابق عظمت کی کسوٹیاں (معیار) بناتا ہے،لیکن بڑائی کا جو معیار مولانا قاری محمد طیب کو دیکھ کر دستیاب ہوتا ہے وہ اتنا جامع اور واضح ہے کہ اس کے بعد عظمت کا مفہوم تشریح طلب نہیں رہتا اور صاف پتہ چل جاتا ہے کہ خدائے ذوالجلال سے جو شخص جتنا قریب ہوگا وہ اتنا ہی بڑا انسان ہوگا۔کیوں کہ اس کا تعلق ایک ایسی ہستی سے ہے جو سب سے بڑی لا ثانی اور لا فانی ہے۔

قاری محمد طیب عشق الٰہی کی تصویر اور خلق خدا کی ہدایت کے لئے راہنمائی کا نور ہیں۔وہ علم وعمل کا جیتا جاگتا پیکر ہیں۔دینی علوم پر ان کی نظر عالمانہ ہی نہیں محرمانہ بھی ہے۔انہیں قدرت نے قرآن فہمی کی غیر معمولی استعداد بخشی ہے۔علم حدیث میں ان کے ادراک کا آفتاب نصف النہار پر ہے۔تاریخ کی دھوپ چھاؤں سے اچھی طرح آگاہ ہیں،زمانے اور زندگی کا ہر اتار چڑھاؤ جانتے ہیں اور قدیم وجدید کا ہر تیور پہچانتے ہیں۔خطابت ان کی لونڈی ہے،لاکھوں کے مجمع میں بولتے ہیں تو پورا مجمع خاموش ہو کر یوں گوش برآواز ہو جاتا ہے جیسے دور دور تک کوئی متنفس موجود نہ ہو۔کوئی سا موضوع ہو وہ اپنی مجتہدانہ بصیرت سے بے تکان تقریر کرتے ہیں اور فکر ونظر کے دریچے کھولتے چلے جاتے ہیں۔

یہی محاسن ہیں جن کی بدولت وہ محض دارالعلوم دیوبند ہی کے لئے نہیں،پورے عالم اسلام کے لئے قندیل راہنمائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

1......اسلام پاکستان کی تقدیر ہے۔ 2......پاکستان اسلام کے لئے معرض وجود میں آیا ہے۔

3......اسلام ہی زندگی کا وہ واحد اور کامل دستور ہے جو پورے اعتماد سے ہمارے مادی اور روحانی تقاضے پورے کرتا ہے۔

جب تک اسلام نافذ نہیں ہوگا ہم زبوں حال رہیں گے

نفاذ اسلام کا مرحلۂ ترتیب......یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے خیالات کا اظہار بڑی مدت سے سب ہی

مسلسل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ اسلام کس طرح اور کس مرحلہ وار ترتیب سے نافذ ہو؟ یہ آج کے دور کا سب سے بڑا سوالیہ نشان ہے۔ خوش قسمتی سے قاری محمد طیب گذشتہ دنوں پاکستان تشریف لائے تو خیال گزرا کہ متذکرہ بالا سوال پر ان کے علم ونظر سے استفادہ کیا جائے۔

یہ خواہش ہمیں کشاں کشاں قاری صاحب تک لے گئی۔ وہ ملتان روڈ کے ایک مکان پر تشریف فرما تھے۔ آس پاس بہت سے عقیدت مند بیٹھے تھے۔ میں نے قاری صاحب سے اپنا مدعا عرض کیا تو بڑی شفقت اور بے تکلفی سے میرے سوالوں کا جواب مرحمت فرمانے لگے۔ اسلامی نظام کے نفاذ اور اس کے طریقہ کار کے بارے میں فرمایا: ''فی زمانہ اسلام کے نفاذ کا دارومدار دو باتوں پر ہے۔ (۱) اجتماعی سطح پر حکومت وقت قدم اٹھائے، مروجہ قوانین کا جائزہ لے اور وہ تمام قوانین یک قلم منسوخ کردے جو قرآن وسنت کے منافی یا ان سے متحارب ہوں، مزید برآں ایسے قوانین بنائے جائیں جن کا مقصد کلی طور پر دین کا نفاذ اور اس پر عملدرآمد ہو۔ (۲) انفرادی سطح پر تمام مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اسلام کی جلوہ گاہ بنائیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جملہ احکام الٰہی پر دل کی گہرائیوں سے کاربند ہوں۔ رہن، سہن، شادی، بیاہ، خوشی، غمی، خرید وفروخت، لین دین، غرضیکہ ہر شعبہ زندگی میں انہی احکام کی پابندی کریں، جن کی اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی ہے اور ان چیزوں سے باز رہیں جن کی ممانعت کی گئی ہے''۔

علوم دینیہ کو عام کرنے کی ضرورت...... ان دونوں امور کی تشریح کرتے ہوئے قاری صاحب نے بتایا کہ اسلام کی بنیاد علم پر ہے، اس لئے پہلی اور فوری ضرورت یہ ہے کہ دینی علوم کو اس قدر عام اور سہل الحصول بنادیا جائے کہ کوئی بھی دین سے ناآشنا نہ رہے۔ ضروری نہیں کہ ہر شخص عالم فاضل ہی بنے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ دینی فرائض کی تکمیل کے لئے ہر شخص کو بھرپور معلومات ہونی چاہئیں، اگر کوئی کسی معاملے کے بارے میں علم نہیں رکھتا تو وہ اہل علم سے رجوع کرے اور درپیش معاملے میں رہنمائی حاصل کرے۔

قرآن کریم کے سترہویں پارے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ ① ''اگر تم نہیں جانتے تو اہل دانش سے دریافت کرو''۔

اب ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں یہ لگن پیدا کی جائے کہ وہ دینی علوم سیکھیں، جب دلوں میں یہ لگن پیدا ہو جائے گی تو وہ یقیناً عالمان دین سے رجوع کریں گے۔ جب وہ دینی تقاضوں سے آگاہی حاصل کرلیں گے تو اس کا اطلاق اپنی عملی زندگی پر بھی کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس طرح ماحول اور معاشرے میں خود بخود اصلاح کے رجحانات پیدا ہوں گے اور یہی رجحانات فلاحی برگ وبار لائیں گے۔ خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کا طرز عمل یہی تھا۔ وہ جس چیز کے بارے میں لاعلم ہوتے تھے اس کا ایک

① پارہ: ۱۷، سورۃ الانبیاء، الآیۃ: ۷۔

ایک پہلو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کرتے تھے اور پھر اسے حرز جان (عزیز سمجھنا) بنا لیتے تھے۔

قاری صاحب نے فرمایا کہ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب تک ماحول ٹھیک نہیں کیا جائے گا اسلامی نظام کا نفاذ ممکن نہیں ہوگا اور ماحول اسی صورت میں سنور سکتا ہے جبکہ پوری قوت اور مکمل فرض شناسی سے کام کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ماحول بہتر بنانے کی ابتداء اپنے گھر سے ہونی چاہئے۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی اصلاح اور دین پر عمل پیرا ہونے کا کام اپنی ذات اور اپنے گھر سے شروع کرے۔

کسی محلے میں اگر ایک گھر عملاً اسلامی تعلیمات کا گہوارہ بن جائے تو وہ گھر چراغ راہ ہو جاتا ہے جس کی کرنیں پڑوس کے گھروں کو بھی منور کرنے لگتی ہیں۔ سعادت اور فلاح کے دیئے اس طرح دھیرے دھیرے جلتے ہیں۔ جب ایک گھر میں اسلامی تعلیمات کی برکتیں جلوہ گر ہوں گی تو دوسرے گھرانے اس کا اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکیں گے یوں گلی گلی، محلے محلے، قریہ قریہ اور شہر در شہر دین کا اجالا پھیلتا چلا جائے گا۔ حتیٰ کہ پورا ماحول اور معاشرہ دینی رنگ میں ڈھل کر بقعہ نور بن جائے گا۔

نفاذ اسلام کے سلسلے میں فرد کی ذمہ داری..... قاری صاحب نے بتایا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلہ میں ہر چیز کی ذمہ داری حکومت وقت کے کندھوں پر ڈال دینا درست نہیں۔ نجی گھریلو، اور خاندانی زندگی میں اسلامی تعلیمات کا انقلاب لانا ہر فرد کا انفرادی فریضہ ہے جس میں کوئی خلل اندازی نہیں کر سکتا۔ اگر ہر فرد اپنی ذات اور خاندان میں اسلام کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا ارادہ اٹل کر لے تو کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑے یا اس کی راہ میں مزاحم ہو۔ لہٰذا اسلام کے عملی نفاذ کی پہلی اور بنیادی ذمہ داری فرد پر ہے۔

قاری صاحب نے کہا کہ آج کل ایک افسوسناک حالت یہ ہے کہ:

ہر یکے ناصح برائے دیگراں

لوگ خود تو نیک عمل کرتے نہیں البتہ دوسروں کو نصیحت کرنے میں بڑی تیزی دکھاتے ہیں، نیک عمل سے گریز مگر نیکی کی زبانی تبلیغ کار بے خیر ہے۔ کیوں کہ قول مؤثر نہیں ہوتا، اصل اور مؤثر قوت عمل ہے، صرف عمل۔

لہٰذا ہر شخص پر لازم ہے کہ پہلے وہ اسلامی معاشرت، اسلامی عقائد اور اسلامی افکار کا علم حاصل کرے اور پھر اس کا عملی نمونہ بن جائے۔ اکل حلال کو اپنی زندگی کے لئے لازم جانے اور حرام کی کمائی سے دور بھاگے۔ اسی طرح اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ آپ ہی آپ ہموار ہوتی چلی جائے گی اور جب مسلمان اچھی طرح دینی رنگ میں ڈھل جائیں گے تو پھر حکومت کا کام معمولی رہ جائے گا۔

انفرادی زندگی میں اسلام کے نفاذ کے لئے حکومت ہی سے ہر مطالبہ کرنا سراسر غیر ضروری ہے۔ حکومت تو صرف اجتماعی سطح پر دین کے نفاذ کا اقدام یا اہتمام کر سکتی ہے۔ اولین ذمہ داری عام مسلمانوں کی ہے کہ وہ اپنی ذات، اپنے گھر، اپنے خاندان اپنی برادری اور اپنے قبیلے کو دینی معاشرت کا سچا نمونہ بنا لیں۔

نفاذِ اسلام میں حکومت کا کردار...... جہاں تک اجتماعی سطح پر حکومت کے کردار کا تعلق ہے۔ تو پہلی بات یہ ہے کہ قانون سازی کا سرچشمہ صرف قرآن اور سنّت کو ٹھہرایا جائے عوام قانون پر چلتے ہیں۔ لہٰذا ایسا کوئی قانون نہ تو برقرار رہنا چاہئے اور نہ ہی آئندہ بننا چاہئے جو منکرات پر مبنی ہو یا قرآن وسنّت کے احکام کی نفی کرتا ہو۔

ثانیاً حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسا نظام تعلیم رائج کرے جس کے ابتدائی مدارج میں دینی عقائد، اخلاق اور معاملات کی کماحقہ تعلیم دی جائے۔ پرائمری اور ہائی اسکولوں میں طلباء کو وہ دعائیں اور ان کا مفہوم یاد کرایا جائے جو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا۔ اگر ہر بچے کو ایک ایک دعاء چار چار روز میں بھی یاد کرائی جائے تو چھ مہینے میں وہ ساری دعائیں اچھی طرح یاد کرلے گا۔ ان دعاؤں کی پہلی اور لازمی برکت یہ ہوگی کہ عملی توحید کا رنگ قائم ہو جائے گا اور ہماری نئی پود کے دل میں رجوع الی اللہ کا جذبہ شروع ہی سے راسخ ہو جائے گا۔ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے یہ چیز اساسی اہمیت کی حامل ہے۔

بنیادی حقوق اور اسلام کا نقطۂ نظر...... اس سوال کے جواب میں کہ انسان کی بنیادی ضروریات زندگی کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ: اسلام، انسان کی بنیادی ضرورتوں کا مکمل حل پیش کرتا ہے، شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الزہد'' میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے جس کے مطابق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: زندگی بسر کرنے کے لئے تین چیزیں لازماً درکار ہیں۔

1 کسرۂ خبز۔ روٹی کا ٹکڑا۔ 2 قطعۂ ثوب۔ بدن ڈھانپنے کا کپڑا۔ 3 قطعۂ ارض۔ رہنے کے لئے زمین کا ٹکڑا۔

اسلام کسی فرد کو اس کی بنیادی زندگی کی ضروریات سے محروم نہیں دیکھتا۔ لوگوں کو رزق رسانی کے سلسلے میں اسلامی نظام کا حال یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کمر پر غلے کی بوری لاد کر ضرورت مندوں کے جھونپڑوں تک پہنچایا کرتے تھے، جہاں تک کامل مساوات کا تعلق ہے تو وہ ایک غیر فطری چیز ہے۔ اسلام توازن اور اعتدال کا دین ہے۔ وہ کسی کا حد سے زیادہ امیر یا حد سے زیادہ غریب ہونا پسند نہیں کرتا، اس سلسلے میں اسلام کی غرض وغایت یہ ہے کہ جو لوگ دولت کے اعتبار سے بہت بلندی پر ہیں انہیں کچھ نیچے اتارا جائے اور جو مفلوک الحال انتہائی پستیوں میں ہیں انہیں کچھ اوپر اٹھایا جائے اس طرح توازن اور اعتدال کی فضاء قائم کی جائے۔

اتحادِ مسلم...... مسلمانوں میں باہمی اتحاد کی ضرورت واہمیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ ''مسلمانوں کے تمام فرقوں میں گہرا اتحاد بے حد ضروری ہے۔ محض اختلافات کے باعث مسلمانوں کا آپس میں کوئی رنجش رکھنا سخت افسوسناک اور بے جواز چیز ہے۔ کیوں کہ ہمارا دین ہمیں جڑنے کی تعلیم دیتا ہے۔ کٹنے اور بچھڑنے کی ممانعت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام میں وحدت کے اسباب بے پناہ ہیں۔ اسلام کا اپنے ماننے والوں سے پہلا مطالبہ یہ ہے کہ آپس میں مقابلہ ومجادلہ نہ کرو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہر فرقہ مثبت اور معروف پہلو پر اکٹھا ہو جائے اور ملت اسلامیہ کے مشترکہ مشن میں تعاون کرے۔ جہاں تک تمام فرقوں کے اپنے اپنے جداگانہ

لیکن ضمنی پہلوؤں کا تعلق ہے وہ ان پر اپنی اپنی حدود میں مکمل پیرا رہ کر بھی مضبوط دینی وحدت بن سکتے ہیں۔ اس کے لئے ایک اہم شرط یہ ہے کہ منفی انداز فکر ترک کر کے تکفیر کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تو اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی انتہائی فراخدلی اور وسعت قلبی کا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عالی ظرفی کا یہ عالم تھا کہ سرداران قریش کی تکریم کے لئے اپنی چادر مبارک بچھا دیا کرتے تھے، جب ہمارے آقائے نامدار کا یہ سلوک کفار کے ساتھ تھا تو ہمارا اپنے ہی بھائیوں کے ساتھ جو سلوک ہونا چاہئے وہ محتاج وضاحت نہیں''۔

اسلامی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں حکومت پاکستان کے حالیہ اقدامات کے بارے میں استفسار پر قاری صاحب نے کہا کہ: جو شخص یا جو حکومت اسلام کے عملی نفاذ کا اہتمام کرے گی وہ ہر حال میں قابل تکریم قرار پائے گی۔

اکابر دیو بند کا مشن...... مزید فرمایا کہ: دین کی بنیاد اللہ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے۔ حدیث شریف میں ہے: ''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ مجھ سے اپنی اولاد، والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ محبت نہ کرے'' مزید فرمایا کہ اکابر دیو بند کا مسلک اور مشن یہی تھا، جس کے لئے وہ مدت العمر کوشاں رہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنی جانیں اس مشن کی خاطر کھپا دیں''۔

ہندوستانی مسلمان شاہراہ ترقی پر...... ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں قاری صاحب نے بتایا کہ دینی غلبہ اور اسلامی حمیت کے لحاظ سے وہ روز بروز آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کی آواز میں یکسانیت اور خود اعتمادی کا لہجہ نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے اسی اتحاد کا نتیجہ ہے کہ سابق بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی صاف صاف یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئیں کہ ہم مسلمانوں کے پرسنل لاء میں کوئی ترمیم نہیں کریں گے۔ بات مزید آگے بڑھی تو انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان کے مسلمان اہل پاکستان کی ترقی اور فلاح کے لئے دعا گو ہیں۔

پاکستان کے مسلمانوں سے ان کی محبت قدرتی ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بحیثیت ملت اسلامیہ مسلمانان ہند پورے عالم اسلام کے لئے دردمندی کے جذبات رکھتے ہیں اور پاکستان عالم اسلام کا ایک اہم ملک ہے۔ پاکستان سے ان کی محبت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ادھر اور ادھر دونوں طرف ایک دوسرے کے رشتہ دار شروع ہی سے موجود ہیں۔ اس لحاظ سے وہ اپنے بھائیوں کی خوشحالی کی دعا مانگتے رہتے ہیں، پھر پاکستان کے لئے ان کی خیر اندیشی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان نہایت قریبی ہمسائے ہیں اور دو آزاد اور خود مختار ہمسایہ ممالک کو جس انداز اور اخلاق سے رہنا چاہئے۔ اس کا قدرتی مطالبہ یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لئے خیر خواہی کے جذبات تازہ اور بیدار رکھیں۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور قیام پاکستان...... شاید بہت سے لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ قاری صاحب اپنے عظیم مرشد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے انداز فکر کی پیروی میں قیام پاکستان کے حامی تھے۔ ماضی کی کچھ باتیں چھیڑیں، تو راقم نے مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ابوالکلام کے

سیاسی افکار کا تذکرہ کیا اور قاری صاحب سے عرض کیا کہ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ابوالکلام رحمۃ اللہ علیہ اپنی دینی وجاہت اور جہادِ حریت کے باعث ہمارے ماضی کی رونق ہیں۔ لیکن یہ سوچ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ ایسی عظیم المرتبت ہستیاں قیامِ پاکستان کے خلاف تھیں۔ آخر کیوں؟

اس پر قاری صاحب نے فرمایا کہ فکری اور نظری اختلاف کسی بھی معاملے پر ہوسکتا ہے۔ بلاشبہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ قیامِ پاکستان کے حق میں نہ تھے۔ تاہم جب پاکستان بن گیا تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اب پاکستان کو مضبوط بنایا جائے۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب تک مسجد تعمیر نہ ہو تو اس کے بارے میں اختلافات ہوسکتے ہیں۔ اس کی ساخت بناوٹ اور موقع محل پر مختلف آراء ہوسکتی ہیں لیکن جب مسجد تعمیر ہوجائے تو پھر اس کی تقدیس کا خیال ہر دم لازم ہے۔ پھر مسجد کے بنانے یا نہ بنانے پر بحث نہیں کی جاسکتی یہی حال قیامِ پاکستان کا ہے۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اب چونکہ پاکستان قائم ہوگیا ہے لہٰذا اس سلسلے میں میری رائے کا اختلاف بھی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہی ختم ہوگیا تھا۔ اب خدا تعالیٰ پاکستان کو مستحکم اور خوشحال بنائے۔

مولانا آزاد مرحوم اور پاکستان..... مولانا ابوالکلام رحمۃ اللہ علیہ بٹوارے کے بعد پاکستان کے لئے کیا جذبات رکھتے تھے؟ اس سلسلے میں قاری صاحب نے ایک دلچسپ واقعہ سناتے ہوئے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا احمد سعید کی معرفت پیغام ملا کہ مولانا ابوالکلام مجھے یاد فرمارہے ہیں۔ میں دہلی پہنچا اور سیدھا ان کے دفتر گیا۔ مولانا اپنے روایتی اخلاق کے مطابق نہایت تپاک سے پیش آئے۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے کیوں یاد فرمایا؟ انہوں نے فرمایا کہ اب پاکستان قائم ہوچکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اچھے اور لائق لوگ پاکستان چلے جائیں اور اس نوزائیدہ مملکت کا نظام سنبھال کر اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنائیں۔

اتنا فرمانے کے بعد مولانا نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ پاکستان جانا چاہتے ہیں تو میں بخوشی آپ کو بھجوانے کا انتظام کرسکتا ہوں۔ اس بارے میں آپ کو بلا جھجک اپنی خواہش کا اظہار کرنا چاہیے۔ لیکن یہ بات افسوسناک ہے کہ اس سلسلے میں خفیہ طور پر پاکستانی ہائی کمشنر سے ملاقاتیں کی جائیں۔

قاری صاحب نے کہا کہ مولانا مرحوم کی یہ باتیں سن کر میں حیرت زدہ رہ گیا اور ان سے کہا کہ یہ قطعی غلط اور جھوٹا الزام ہے۔ اس پر مولانا ابوالکلام رحمۃ اللہ علیہ سوچ میں ڈوب گئے میں نے انہیں بتایا کہ سی آئی ڈی نے حکومت کو ہمارے بارے میں جان بوجھ کر یا نادانستگی میں غلط اطلاع دی ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے چندہ جمع کرنے والے سفیر چندہ کے سلسلہ میں پاکستان جانا چاہتے تھے۔ اور اسی ضمن میں انہوں نے ہائی کمشنر سے رابطہ بھی قائم کیا تھا۔ سی آئی ڈی والوں نے اس بات کو زیبِ داستان کے لئے بڑھایا اور یہ افسانہ بنا ڈالا کہ میں پاکستان منتقل ہونا چاہتا ہوں۔

قاری صاحب نے کہا کہ جب یہ حقیقت مولانا کے علم میں آئی تو وہ بہت متاسف ہوئے اور انٹیلی جنس کے

عملے پر بڑا امدال ظاہر کیا۔ کہنے لگے کہ یہی سی آئی ڈی کے جھوٹے لوگ تھے۔ جو ہمارے بارے میں بھی انگریزوں کو غلط اطلاعات بہم پہنچاتے تھے۔

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

خدا حافظ..... قاری صاحب باتوں باتوں میں فکر و نظر اور علم و خبر کی پھول لٹا رہے تھے، خاصا وقت بیت چکا تھا۔ رات کی تاریکی بڑھتی پھیلتی چلی جا رہی تھی راقم نے اجازت چاہی تو انہوں نے شفقت و مرحمت کے ایک نادر لمس کے ساتھ مصافحہ فرمایا اور گراں قدر دعائیں دے کر خدا حافظ کہا اور میں یہ سوچتا ہوا لوٹ آیا کہ قاری صاحب ۸۶ برس کے لیل و نہار دیکھ چکے ہیں۔ خدا ایسی عظیم اور فیض رساں شخصیتوں کو تادیر زندہ اور باعث برکت بنائے رکھے۔ (آمین)

از: شاعرِ شیریں مقال

جناب انور صابری (مرحوم)

حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب "قدس اللہ سرہٗ العزیز"

حیات تیری نئے جہاں میں وقار بخشِ علومِ نو ہے
تری جبیں پر جبینِ قاسم کی دل نواز و حسین ضو ہے

تری صدا کو بصیرتوں کی فضا کا الہام کر دیا ہے
"حکیم الامت" نے ایک نظر میں حکیم الاسلام کر دیا ہے

خدا کے فضل و کرم سے دین کا مقام محمود مل گیا ہے
تو ہے وہ غنچہ جو زندگی کی خزاں سے ٹکرا کے کھل گیا ہے

ترے تفکر میں قرنِ اول کی عظمتوں کا نشان ملے گا
تری خطابت میں عبرتوں کا تصور جاوداں ملے گا

مری نظر میں نئے زمانے کا فخر مصر و حجاز تو ہے
کیا جسے منکشف مشیت نے وہ حقیقت کا راز تو ہے

رشید کے باغِ آرزو کا نگاہ افروز پھول تو ہے
ملا دوامِ بہار جس کو گلِ ریاضِ رسول تو ہے

فریضۂ حج کے بعد اپنے وطن میں باعز و شان آیا
لئے ہوئے دل میں معرفت کا تخیل نوجوان آیا

جہاں گیا تو وہیں اکابر کا رنگ اعزاز دیں بڑھایا
رہے گا تا عمر تیرے سر پہ خدا کی رحمت کا خاص سایہ

حوادثِ دہر تیری شہرت نہ زندگی بھر مٹا سکیں گے
ترے قدم کی بلندیوں کو عروج والے نہ پا سکیں گے